تحفۂ جلال

TOHFA-I-JALAL

FOR

INTERMEDIATE EXAMINATION

BY

M. H. S. Jalal Uddin Ahmad Jafri

Retired Lecturer in Arabic, Persian & Urdu,

Government Intermediate College.

ALLAHABAD

PRINTED AT AND PUBLISHED BY

JAFRI BROTHERS,

ANWAR AHMADI PRESS.

Price Rs. 3.

تحفۂ جلال

جس کو

جناب مولوی حافظ سیّد جلال الدین احمد جعفری زینبی

سابق لکچرر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد

نے

انٹرمیڈیٹ کلاس کیلئے تیّار کیا

جعفری برادرس نے شائع کیا

مطبع انوار احمدی الہ آباد میں طبع ہوا

قیمت تین روپیہ

فہرست مضامین تحفۂ جلال

حصۂ نثر

حصۂ نظم

M. Shafi

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میر امان دہلوی

آپ کا نام میر امان تھا۔ دلی کے رہنے والے۔ امن تخلص تھا کہیں کہیں بعض اشعار میں آپ نے اپنا تخلص لطف بھی ظاہر کیا ہے۔ بڑے نامور اور خاندانی شخص گذرے ہیں۔ فن شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اپنی طبیعت کی موزونی سے شاعر بن گئے۔ خود فرماتے ہیں کہ میری اردو ٹکسالی ہے۔ کیونکہ میں دلی کا روڑا اور وہیں کا پروردہ یافتہ ہوں۔

ان کے آبا و اجداد ہمایوں بادشاہ کے عہد سے شاہان مغلیہ کی خدمت میں با اعزاز و صاحب جاگیر و مناصب رہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جب دلی کے گرد و نواح میں جاٹوں کا عمل ہو گیا تو سورج مل جاٹ نے آپ کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ اور احمد شاہ درانی نے ان کا گھر بار تاخت و تاراج کر دیا۔ اس وقت مجبوراً آپ نے اپنا وطن چھوڑ کر پورب کا رُخ کیا۔ کچھ دنوں عظیم آباد قیام کر کے بتلاش روزگار کلکتہ پہنچے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں کلکتے کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم میں سرکار انگریزی کی طرف سے ایک کالج ان انگریزوں کی تعلیم کی غرض سے قائم کیا گیا تھا جو ولایت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر ہندوستان آیا کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے گلکرائسٹ صاحب کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ صاحب موصوف کو ہندوستانی زبان کی تدوین کا خاص شوق تھا۔ انھوں نے خود بھی انگریزی زبان میں قواعد اردو لکھی۔ اور ڈکشنری تیار کی اور قابل مصنفوں سے ہزاروں کتابیں لکھوائیں۔

۱۸۰۱ء میں منشی میر بہادر علی صاحب نے ڈاکٹر گلکرائسٹ صاحب بہادر کے حضور میں ان کو پیش کیا۔ انھوں نے ان کی قدر فرمائی۔ بے روزگاری کی شکایت دور ہوئی۔ اور کلکتہ آپ کا مسکن ہو گیا۔ اسی سال ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش سے آپ نے قصہ چہار درویش مصنفہ امیر خسرو دہلوی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا نام "باغ و بہار

لکھا۔ یہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ صدہا بار چھپ چکی۔
ان کی زبان صاف اور سلیس اور عام فہم ہونے کے علاوہ اس زمانے کے روزمرہ محاورات دہلی کا نہایت صحیح نمونہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد و نعت

سبحان اللہ کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مٹھی خاک سے کیا کیا صورتیں اور مٹی کی مورتیں پیدا کیں۔ باوجود دو رنگ کے ایک گورا ایک کالا اور یہی ناک کان ہاتھ پاؤں سب کو دئے ہیں۔ تس پر رنگ رنگ کی شکلیں جدا جدا بنائیں کہ ایک کی سج دھج سے دوسرے کا ڈیل ڈول نہیں ملتا۔ کروڑوں خلقت میں جس کو چاہئے پہچان لیجئے۔ آسمان اُس کے دریائے وحدت کا ایک بلبلہ ہے اور زمین پانی کا بتاسا ہے۔ لیکن یہ تماشا ہے کہ سمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے پر اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا جس کی یہ قدرت اور سکت ہو اُس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے۔ کہے تو کیا کہے۔ بہتر یوں ہے کہ جس بات میں دم نہ مار سکے چپکا رہے۔

غزل

عرش سے لے فرش تک جس کا کہ یہ سامان ہے	حمد گر اُس کی لکھا چاہوں تو کیا امکان ہے
جب پیمبر نے کہا ہو میں نے پہچانا نہیں	جو کوئی دعویٰ کرے اُس کا بڑا نادان ہے
رات دن یہ مہر و مہ پھرتے ہیں صنعت دیکھتے	پر ہر اک واحد کی صورت دیدۂ حیران ہے
جس کا ثانی اور مقابل ہے نہ ہوئے گا کبھی	ایسے یکتا کو خدائی سب طرح شایان ہے
لیکن اتنا جانتا ہوں خالق و رازق ہے وہ	ہر طرح سے مجھ پہ اُس کا لطف اور احسان ہے

اور درود اُس کے دوست پر جن کے خاطر زمین و آسمان کو پیدا کیا اور درجہ رسالت کا دیا شعر

حمد حق اور نعت احمد کو بیاں کر انصرام	اب میں آغاز اُس کو کرتا ہوں جو ہے منظور عام

سبب تالیف کتاب

منشا اس تالیف کا یہ ہے کہ سنہ ایک ہزار دو سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک
عیسوی مطابق ایک ہزار دو سو سات سنہ فصلی کے عہد میں اشرف الاشراف مارکوئیس ولزلی
گورنر جنرل لارڈ مارنگٹن صاحب جن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگرداں ہے جتنے
وصف سرداروں کو چاہیے اُن کی ذات میں خدا نے جمع کئے ہیں۔ غرض قسمت کی خوبی اس
ملک کی تھی جو ایسا حاکم تشریف لایا جس کے قدم کے فیض سے ایک عالم نے آرام پایا۔
مجال نہیں کہ کوئی کسی پر زبردستی کر سکے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے
غریب و غربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں۔ چرچا علم کا پھیلا۔ صاحبان ذی شان کو شوق ہوا
کہ اردو زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت و شنود کریں۔ اور علمی کام کو بہ آگاہی
تمام انجام دیں۔ اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال میں بموجب فرمائش کے تالیف ہوئیں
جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں۔ اُن کی خدمت میں گزارش
کرتا ہوں کہ یہ قصہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا
کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جو اُن کے پیر تھے۔ اور درگاہ اُن کی دلی میں قلعے
سے تین کوس لال دروازے کے باہر اٹیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے۔ اُن کی
طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتا اور تیمارداری
میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا
دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ
فارسی میں مروج ہوا۔ اب خداوند نعمت۔ صاحب مروت۔ نجیبوں کے قدردان جان
گلگرسٹ صاحب نے ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے۔ جب تک گنگا جمنا بہے۔ لطف سے فرمایا
کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان۔ عورت۔ مرد۔ لڑکے بالے
خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے
سے لکھنا شروع کیا۔ جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

اپنے حالات

پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار میر امن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جان فشانی بجا لاتے رہے۔ اور وے بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہیے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایت سے سرفراز کر کے مالا مال اور نہال کر دیا۔ اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اُس گھر کے سبب سے آباد تھے۔ یہ نوبت پہنچی ظاہر ہے عیاں راچہ بیاں۔ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ایسے شہر سے کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے۔ جلا وطن ہوا۔ اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا غارت ہوا۔ میں بیکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر کار وہاں سے پاؤں اُکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانے کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بیکاری میں گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا تب منشی میر بہادر علی کے وسیلے سے حضور تک جان گلگرسٹ دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اُس قدر داں کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔

اردو زبان کی حقیقت

حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سُنی ہے کہ دہلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے۔ اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمانوں کی آمیزش پائی آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے ہندوستان کو لیا۔ اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ حیران ہو کر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آکر پسماندہ پٹھانوں کو گوشمالی دی۔ کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ فساد برپا کرے۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے۔ تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئی۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدا تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین۔ سودا سلف۔ سوال و جواب کرتے کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہجہاں صاحبقراں نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر فرمایا۔ اور تخت طاؤس میں جواہر جڑوایا۔ اور دل بادل سا خیمہ چوبوں پر استادہ کر طنابوں سے کھنچوایا۔ اور نواب مردان علی خاں نہر کو لے کر آیا۔ تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا۔ اور شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا۔ اگرچہ دلی جدا ہے۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے۔ اور وہاں کے شہر کو اردوئے معلّٰی خطاب دیا۔ امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت تک۔ بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پیڑھی در پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی۔ ندان زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔ لیکن قدر دان منصف چاہئے جو تجویز کرے۔ سو اب خدا نے بعد مدت کے جان گلگرسٹ صاحب بہادر سا دانا نکتہ رس پیدا کیا۔ جنھوں نے اپنے گیان اور اوگت سے۔ اور تلاش اور محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سبب سے ہندوستان کی زبان کا ملکوں میں

رواج ہوا اور نئے سرے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھئے تو شہر والوں کو نام رکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف سے کوئی وارث اور مالک مُلک کا نہ رہا شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے میں کہیں اور تم کہیں ہو کر۔ جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں کے ساتھ۔ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا۔ اور بہت سے ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسی سبب سے دلی میں گئے اور رہے وے بھی کہاں تک بول سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے۔ اور جو شخص سب آفتیں سہکر دلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اُسی شہر میں گذریں اور اُس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر و تماشے اور کوچہ گردی اُس شہر کی مدت تک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ بھی رکھتا ہوگا اُس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہیں تک پہنچا ہے۔ (از باغ و بہار میر امن دہلوی)

قصۂ آزاد بخت

سرزمین ولایت روم میں ایک بادشاہ عادل۔ دریا دل۔ صاحب تاج و تخت۔ نام آزاد بخت اُس کی عمر پچاس کے قریب۔ مگر اولاد سے بے نصیب۔ ایک روز آئینہ روبرو تھا۔ بال سفید نظر آیا۔ فرمایا بے اولاد زندگی بے مزہ ہے اور دنیا دو روزہ ہے۔ گوشہ لیجئے اور عبادت کیجئے۔ ابیات۔

نکلنے لگے بال میرے سفید رہی اب کسے زندگی کی اُمید
اگر سو برس تک رہیں جان و تن پھر آخر وہی گور ہے اور کفن

پس گوشہ لیا۔ اور حکم کیا۔ کہ جب تک اجازت نہ پائے۔ اپنا اور بیگانہ کوئی نہ آئے۔ امیر اور وزیر سب حیران۔ ہر ایک کو اور ہی گمان۔ کوئی کہتا موا۔ کوئی کہتا فقیر ہوا تیسرے روز خردمند

تام۔ وزیر صاحب تدبیر نے جا کر عرض کی کہ بے جمال عالم آرا جہان تاریک ہے۔ اور غلام رنج و راحت کا شریک ہے۔ جو پیر و مرشد فرمائیں۔ سب عمل میں لائیں۔ کہا میرا تخت بے جانشیں اور انگشتری بے نگیں ہے۔ خدا نے مجھے ملک کا مالک کیا۔ مگر فرزند نہ دیا۔ اب دنیا سے نفرت اور فکر آخرت ہے۔ نظم۔

یہ لازم ہے جو آدمی پیر ہو اُسے زادِ عقبیٰ کی تدبیر ہو
مرے حق میں اکسیر ہے بندگی کہ بے بندگی ہیچ ہے زندگی

وزیر نے عرض کی کہ صدقہ دافع ہر مرض ہے۔ اور خیرات کفیل ہر غرض ہے ظلِ سبحانی تخت سلطانی پر جلوس فرمائیں۔ خدمت فقرا بجا لائیں یقین ہے کہ گوہر مراد ملے۔ اور گل مقصد کھلے بارے التماس وزیر نے حسن اجابت پایا۔ بارعام فرمایا۔ کہ تمام روز عدل و انصاف سے حکمرانی کرتا۔ اور شب کو تنہا گور بزرگاں پر فاتحہ خوانی کرتا۔ ایک روز یادِ تند تھی۔ شہر سے باہر ایک چراغ نظر آیا۔ فرمایا۔ اس شدت ہوا میں چراغ روشن کرشمہ جنات ہے۔ یا کسی بزرگ کی کرامات ہے۔ قدم آگے رکھا۔ دیکھا۔ ایک مقبرے میں چار خرقہ پوش خاموش بیٹھے ہیں۔ پوشیدہ کھڑا ہوا تا دریافت کرے انسان ہیں یا شیطان۔ ناگاہ ایک فقیر بولا ہم تم ہر ایک نے بہت سا رنج اٹھایا۔ اور آج آب و دانہ یہاں لایا۔ کل دیکھئے پردۂ غیب سے کیا باہر آئے اور یہ چرخ شعبدہ باز کیا بازی لائے۔ شب دراز ہے۔ اور درد دل جاں گداز ہے اپنی اپنی سرگذشت کہہ تا روز روشن ہو۔ کہا بہتر ہے۔ اول آپ ہی آغاز کیجئے۔ اور ہم غریبوں کو سرفراز کیجئے۔

(از نوطرز مرصع منشی محمد حسین صاحب تحسین)

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ

مرزا کی ولادت غالباً سنہ ۱۲۰۱ھ یا سنہ ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ میں ہوئی تھی ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ اور شرفائے لکھنؤ میں شمار ہوتے تھے۔ فارسی و عربی کی تعلیم سے فارغ ہو کر مرزا نے خوشنویسی کی مشق کی۔ اور اپنے وقت کے ایک نامور خطاط ہوئے۔ علم موسیقی میں بھی خاص کمال رکھتے تھے شاعری میں بھی ان کی خاص شہرت ہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کمال فسانہ نگاری ہے۔ خوشنویسی میں حافظ

محمد ابراہیم صاحب کے شاگرد تھے اور شاعری میں آغا نوازش حسین خاں نوازش عرف مرزا خانی سے تلمذ حاصل تھا جو اپنے عہد کے کامل الفن شاعر تھے۔

مرزا سرور کی ابتدا لکھنؤ میں ہوئی تھی جہاں مرزا سودا۔ میر تقی میر۔ میر درد۔ میر سوز۔ میر حسن۔ سید انشا۔ میاں مصحفی۔ میاں جرأت۔ اپنے اپنے ترانے سنا کے یکے بعد دیگرے چل بسے تھے۔ اور شیخ ناسخ۔ خواجہ آتش میاں دلگیر۔ میر خلیق۔ میر ضمیر وغیرہ اپنی نغمہ سرائی کے ڈنکے بجا رہے تھے۔ اسی طرح رند۔ صبا۔ وزیر۔ قلق۔ انیس دبیر وغیرہ سب کی ابتدا و انتہا ان کی نظر سے گذری تھی۔ مرزا غالب مرحوم نہ صرف اُن کے ہمعصر تھے۔ بلکہ ہم عمر بھی اور دونوں میں رشتۂ اتحاد بھی قائم تھا۔ مرزا غالب کو نثر معرا میں کمال حاصل تھا اور مرزا سرور کو نثر مسجع میں۔

مرزا سرور کی زندگی کا پہلا واقعہ اُن کی لکھنؤ سے جدائی ہے جو سنہ ۱۲۴۰ھ میں واقع ہوئی۔ چنانچہ کانپور پہنچ کے لکھنؤ کے فراق میں جو بے چینی اُن کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ایک گلزار سے چھٹ کے کسی بلبل کو بھی محسوس نہ ہوگی۔

مرزا نے بدو فطرت سے جدت پسند طبیعت پائی تھی۔ نثر اردو کی جس صنف کو انھوں نے ایجاد کیا تھا وہ انھیں پر ختم ہو گئی۔ فسانۂ عجائب اُن کی پہلی تصنیف ہے۔ جس میں نہ صرف اردو طرز انشا میں رنگینی اور زور ہی پیدا کیا گیا ہے بلکہ فارسی نثر مسجع کا پورا نمونہ دکھایا گیا ہے۔ جو اس وقت اردو میں موجود نہ تھی۔ فسانہ کے علاوہ اُن کی اور بھی متعدد تصنیفات ہیں۔ اور سب میں یہی التزام قائم ہے۔ مثلاً سرور سلطانی۔ گلزار سرور۔ انشائے سرور۔ شگوفۂ محبت۔ شبستان سرور وغیرہ سرور کی انشا پردازی فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ ہے۔

مرزا ۳۲ سال تک لکھنؤ میں عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ جب سلطان عالم محمد واجد علی شاہ تخت لکھنؤ پر جلوہ افروز ہوئے۔ اُس موقع پر مرزا نے ایک قطعہ تاریخ کہا جو خوش قسمتی سے سلطان عالم کے حضور میں پیش ہو کر پسند آیا۔ خلعت و انعام کے علاوہ مرزا ملازمین خاص کے زمرے میں داخل ہوئے وہ عسرت کا دور ختم ہوا۔ راحت اور عیش کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن وہ زمانہ ایک خوش آیند خواب کی طرح بہت جلد گذر گیا۔ اب وہ پھر اُسی اگلی فلاکت میں گرفتار ہو گئے اور اسی طرح تمام عمر بسر کی تا آخر بیاسی برس کی عمر میں سنہ ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔

نثر مسجع کا بیان۔ فارسی میں نثر مسجع کی تین قسمیں ہیں۔ متوازی[1]۔ مطرف[2]۔ متوازن[3]۔ متوازی اُس عبارت کو کہتے ہیں جس کے فقرے مقفی ہوں اور ہر قافیہ وزن اور حرف روی کے اعتبار سے مساوی ہو جیسے گل و مل۔ خنجر و نشتر۔ مخموری و مہجوری وغیرہ۔ مطرف وہ عبارت ہے جس کے فقرے مقفی ہوں موزوں

ہوں نہ ہوں جیسے وقار واطوار۔ دور ورنجور۔ مال ومنال۔ متوازن وہ عبارت ہے جو مقفی اور موزوں ہو اور شمار اعداد حروف بھی ایک ہوں لیکن روی کی قید نہیں ہے جیسے اعمار وافعال۔ وجود وغفور وغیرہ۔

تباہی جہاز کے بعد جانعالم کا جوگی کے پاس آنا

تباہی جہاز کے بعد جان عالم تختے کے سہارے سے ڈوبتا ترتا چار دن میں کنارے لگا۔ جب تکان پانی کی موقوف ہوئی غش سے آنکھ کھلی۔ دیکھا کنارے کیا ہوں بلکہ گور کے کنارے لگ رہا ہوں بڑی جدوکد سے اترا۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا ایک طرف چلا۔ ایک بستی میں پہنچا۔ وہاں کے باشندے اُس کا چہرہ اور جمال پرخراب حال دیکھ کر بہت گھبرائے۔ قریب آئے۔ پاس آ کچھ خوف سا کھا اس طرح بولے کہ سچ کہو تم کون ہو۔ جان عالم نے دم سرد دل اندوہگیں سے بھر چشم تر کر لوگوں سے کہا۔ رباعی۔

حالے دارم چناں کہ دشمن خواہد ۔۔۔ جانے دارم کہ فرقتِ تن خواہد

ناکامیِ خویش اگر شرح دہم ۔۔۔ دشمن بخدا زندگیِ من خواہد

ایسا النّاس میں گم کردۂ کارواں جرس کی طرح نالاں ہوں۔ دل گرفتہ نقش پائے یار ہوں حق میں گرفتار ہوں۔ بچھڑوں کا طالب دیدار ہوں۔ غریب دیار بے تاب۔ دانہ نصیب ہوا نہ آب۔ مفارقت یاران چند سے خستہ وخراب۔ حیران ہوش وحواس یک لخت زائل ضعف سد راہ ناطاقتی حائل۔ یاروں کی صورت نظر آئی نہیں۔ دیدۂ دیدار طلب میں بینائی نہیں۔ نہ تاب رفتار۔ نہ طاقت گفتار۔ اشعار

بسان نقش پا بیٹھے جہاں واں سے نہ پھر سرکے ۔۔۔ ٹھکانا پوچھتے ہو کیا بھلا ہم بے ٹھکانوں کا

بیاد دوستاں ہیروں مجھے ہچکی لگ آتی ہے ۔۔۔ کہیں مذکور جب ہوتا ہے کچھ گذرے فسانوں کا

علم سے آہ کے ثابت ہوئی غم کی ظفر ہم کو ۔۔۔ کہ باعث فتح کا ہوتا ہے کھل جانا نشانوں کا

بچھڑ کے جیسے بیر فلک نے دوست سب کیسے ۔۔۔ مٹے گا داغ کب دل سے مرے ان نوجوانوں کا

شرر منہ سے نکلتے ہیں سر و دِ دل حزیں ہر دم بھلا دیواں ہو کیوں کہ جمع ہم آتش بیانوں کا

اس حکایت جاں سوز شکایت چرخ بے مہر غم اندوز سے سب رونے لگے۔ کہا یہ شاہزادۂ عالی تبار ہے الا دل از دست دادہ۔ مجنوں دور اُفتادہ۔ اس سبب سے دل افگار ہے۔ بمنت و سماجت مکان پر لے گئے۔ ہاتھ منہ دھلوا کھانا پانی حاضر کیا۔ جان عالم آب و طعام دیکھ کر رو دیا۔ یہ کہا خدا جانے میرے بچھڑوں کا کیا حال ہوا۔ کسی کو دانہ پانی میسر آیا یا کچھ نہیں پایا۔ میں بھی نہ کھاؤں گا۔ بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔ وہ بولے حضرت سلامت کھانے پانی سے انکار نادانی ہے۔ اسی سے بشر کی زندگانی ہے۔ جو جیتے ہو تو کسی روز بچھڑوں سے مل جاؤ گے۔ وگرنہ غربت کے مر جانے میں گور و کفن بھی نہ پاؤ گے۔ ناچار سب کے سمجھانے سے دو ایک نوالے حلق سے اتارے۔ پانی جو پیا ہاتھ پاؤں سنسنائے۔ بہم غش آئے۔ جب طبیعت ٹھہری سب حال پر ملال حیات کی تباہی۔ انیسان ہمراز کی جدائی۔ اپنا ڈوبتے اچھلتے وہاں تک آنا۔ اوروں کا پتہ نہ پانا۔ بیان کر کے یہ کہا۔ شعر

ہمرہاں رفتند و ما ماندیم و دزداں درکمیں خانۂ ملاح در چین است و کشتی در فرنگ

سب تاسف کرنے لگے۔ ایک شخص نے کہا یہاں سے دو منزل ایک پہاڑ ہے کوہ مطلب برار نام ہے۔ اُس پر جوگی کا مقام ہے۔ مرد باکمال شیریں مقال۔ ہزاروں کوس سے حاجت مند اُس کے پاس جاتے ہیں۔ سب کے مطلب بر آتے ہیں۔ بسکہ اُس پر عنایت باری ہے۔ چشمۂ فیض اُس سے جاری ہے۔ مشہور ہے کہ آج تک کوئی شخص محروم و ناکام اُس مقام سے نہیں پھرا۔ یہ مژدہ سن کر چہرے پر بشاشت چھا گئی۔ گئی ہوئی جان اُسی آن بدن میں آ گئی۔ گھبرا کر یہ شعر پڑھا۔ حافظ۔

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

اُسی دم چلنے کا عزم کیا۔ وہ لوگ مانع ہوئے۔ کہا ابھی چلنے کی طاقت آپ میں آئی نہیں پاؤں میں راہ چلنے کی تاب و توانائی نہیں۔ دو چار روز یہاں آرام کرو۔ قوت آ جائے۔

تومختار ہو۔

غرض کہ جان عالم نے اُن لوگوں کے سمجھانے سے وہاں مقام کیا۔ عجب پریشانی میں صبح کو شام کیا۔ آخرش وہ رات کی رات ہزار عقوبات تڑپ تڑپ کر سحر کی۔

جوگی کے استھان کا سین

سنگ سفید کے پہاڑ نہبت آبدار مانند ہمت جوانان صاف باطن سر بلند۔ اور مثال طبع سخنوران فرح افزا دل پسند رہا ہے فراخ کشادہ روش۔ جوش نباتات درریاحین ولالہ سے اور خروش مرغان خوش الحان سے رشکِ صد گلشن۔ چشمہائے شیریں جابجا فرہاد کی روح کا ٹھیکا۔ ہر قسم کا میوہ درخت قدرت حق سے اُگا پھولا پھلا۔ پتھر ہر ایک معدن لعل۔ پرند چرند صاحب حسن وجمال۔ یہ سیر دیکھتا چلا۔ ایک طرف درخت گنجان گھنے۔ پختہ مزار بیدار دلوں کے بنے۔ اور مندھی کا گنبد گرداں بے ستوں کا جواب بنا۔ ترسول گڑا گھاروے کی جھنڈی پھر پھیر اُڑتی۔ کلمۂ شہادت بخط جلی لکھا۔ جب اُس کے نزدیک آیا۔ دور دور تک مکان صاف صحن شفاف پایا۔ مٹھ کے روبرو درخت کے تلے چبوترے کے اوپر ایک جوگی سو سوا سے[125] برس کا سن وسال۔ مگر ٹانٹھا کمال۔ ڈاڑھی ناف سے بڑی۔ گرہ لگی۔ جٹا ہر ایک راکھ سے بھری قدمبوسی ہورہی۔ پاؤں پڑی۔ پلکیں دیدۂ حق بیں کا اسرار چھپانے کو۔ چشم حاسد کے گزند بچانے کو۔ موچھوں سے ملیں۔ جسم میں موج دریا کی طرح جھرّیاں پڑیں۔ کمر میں کردھنی موٹی سی مہین بان کی۔ عجب آن بان کی۔ گھاروے کا لنگوٹ۔ ستر عورت کا اوٹ۔ گلے میں محمودی کی کفنی۔ حقہ جوگانی منہ سے لگائے۔ افیونی کی شکل بنائے۔ شیر کی کھال بچھائے بھبھوت رمائے۔ دید وادید سے بظاہر آنکھیں بند۔ مگر دیدۂ دل کھلا خموشی پسند دل بولتا سوتا نہ جاگتا۔ آسن مارے۔ دنیا سے کنارے بیٹھا۔ پیٹ پیٹھ سے لگا تیر سا قد راست مثل کمان خمیدہ۔ گویا چلہ کھینچ چکا ہے۔ زنار کا سا رگیں عیاں۔ کھال سے ہڈیوں کے جوڑ شمع فانوس نمط نمایاں۔ تسبیح سلیمانی ایمان کی نشانی ہاتھ میں۔ ہر بھجو بھجو تکیہ کلام بات بات میں۔ قشقہ ٹیکا ماتھے

ہندوؤں کا سا۔ اور سجدے کا گھٹّا بدر کامل کی صورت چمکتا۔ زرد مٹّی بدن میں۔ ذکرِ حق دل و دہن میں۔ کہیں مصلّے پر سبحہ و سجدہ گاہ رکھی۔ کپڑے کی جانماز بچھی۔ کسی جا پوتھی کھُلی دھونی رمی۔ دونوں سے راہ رکھی۔ عجب رنگ کا انسان۔ خلاصہ یہ کہ نہ ہندو نہ مسلمان۔ بقول میرزا سودا۔

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلائے شیخ تو کہے گبر مجھے۔ گبر مسلماں مجھ کو

ایک طرف تکیے میں دو چار کیاریاں۔ بیلے چنبیلے کی بہار گلکاریاں۔ کہیں مرشدوں کے ڈھیر گرد کی چھتری بزرگوں کے مزاروں پر مولسری کے درخت سایہ دار قطار قطار۔ درختوں کی ٹہنیوں میں پنجرے لٹکتے۔ جانور باہم بحث کرتے اٹکتے۔ فاختہ کی کوکو۔ قمری کی حق سرّہ ہو۔ کوکلا کے دَم۔ سنّاٹے کا عالم۔ کہیں مرگ چھالا بچھا۔ شیر چیتے کی دبیا۔ دھونی لگی۔ لکڑ سُلگتا کسی جا ببر کی کھال کا بستر۔ آہوئے صحرائی اُس پر بیٹھا۔ اوداسا توبنا۔ ہمنتا دھرا۔ ایک سمت بھوانی کا مٹھ۔ تلسی کا پیڑ ہرا بھرا گرد چشمہ پانی کا بھرا۔ جائے دلچسپ - مکان رُعب دار۔ گُل خودرو کی جدا بہار۔ ایک طرف بھنڈارا جاری۔ کڑھا و چڑھا۔ موہن بھوگ بنتا کہیں پلاؤ قلیے کی تیاری۔ چھاندا بٹ رہا تھا۔ کچھ مہنت بالکے۔ کچھ مدحال کے۔ کوئی چلّے میں بیٹھا۔ کوئی دنیا سے ہاتھ اُٹھائے کھڑا۔ کسی کے خرقہ و تاج سر و تن میں۔ کوئی چوائن میں۔ کہیں کتھا ہوتی۔ کوئی وعظ کہہ رہا۔ ایک طرف خنجری بجتی۔ طنبورہ چھڑتا۔ بھجن ہوتے۔ ایک سمت حلقہ مراقبہ کا بندھا۔ نوحہ پڑھ رہے۔ لوگ روتے۔ عجیب وہ گرد مرشد غریب یہ مرید چیلے۔ روز ایک دو کو مونڈتا۔ تیسرے چوتھے دن عرس میلے۔ حاصل کلام یہ کہ عجب جلسہ تھا۔ کہ دیکھا نہ سنا۔ یہ اجتماع نقیضین آرام و چین سے۔ شہزادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی مرد آگاہ دل روشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اُٹھائی۔ آنکھ ملائی۔ دیدے لال لال۔ چہرے پر رعب و جلال۔ جانِ عالم کو بغور دیکھا۔ اُس نے جھک کر مؤدب سلام کیا۔ اُس خوش تقریر شیریں مقال نے کہا۔ بھلا ہو بچہ۔ بڑی مصیبت فلک نے دکھائی جو یہ صورت یہاں تک

آئی۔ آؤ بیٹھو گرو، بھلا کرے۔ مرشد کی دعا سے حق حاجت روا کرے۔ ہم تمہارے امانت دار ہیں۔ سواری کھڑی ہے چلنے کو تیار رہیں۔ جان عالم متعجب ہو رہا تھا۔ اور زیادہ حیران ہوا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ پاس جا بیٹھا۔ جوگی اٹھا چشمے میں جا کر نہایا۔ گیروا جامہ ا پھینک سفید اوڑھ عطر لگا۔ جان عالم کے نزدیک آ یہ نکتہ زبان پر لایا۔ بابا ایک دن ذوق و شوق کے عالم میں ہمارے مرشد گرو نے تیرے حال سے خبر دی تھی۔ کہ ایک شہزادے کا جہاز تباہ ہو جائے گا۔ وہ تیرا فراغ مطلب یہاں آئے گا۔ اس کا کام تجھ سے تیرا کام اس کے سامنے پورا ہو جائے گا۔ اس بات کے سننے سے شہزادے کو نہایت مسرت ہوئی۔ کہا جوگی جی تمہارے نام سے میری زندگی کی صورت ہوئی۔ وگرنہ دو چار دن میں گریبان صبر چاک ہو جاتا۔ سر ٹپک کر ہلاک ہو جاتا۔

(از فسانۂ عجائب مرزا رجب علی بیگ سرورؔ)

رقعہ

ہوائے چمن دنیا آج کل سرور افزا ہے۔ ساکنان افلاک کو مسرت ہے۔ مقیمان سطحِ خاک کو فرحت ہے۔ عجب مزہ ہے۔ ہر سو مژدۂ تہنیت کو بکو غلغلۂ مبارک باد ہے۔ جو ہے خرم و شاد ہے۔ آمد روز سعید ہے۔ گھر گھر عید ہے۔ نرگس ہمہ تن چشم گوش بر آواز ہے در عیش و طرب باز ہے۔ طاؤس آمادۂ رقص ناز ہے۔ زمین کے رخسارے پر سبزہ آغاز ہے کوہ و صحرا میں سنبل و ریاحین لالہ و نسرین کی نشو و نما ہے۔ دامن دشت و جبال اس سال سبد گلچیں ہو گیا۔ پھولوں سے بھرا ہے۔ گل رعنا کس زیبائی سے شگفتہ ہو کے سراپا گوش ہے۔ بلبل شیدا پھولا نہیں سماتا۔ چہک رہا ہے۔ خوف خزاں گلزار جہاں دونوں کو فراموش ہے۔ نالہ نوازان صحن گلشن حمد رب ذوالمنن میں ترانہ سنج ہیں۔ وحشیان صحرا بصد تمنا جوائے گنج ہیں۔ باغبان قدرت دقیقۂ چمن نکالتا ہے۔ پتا پتا جوبن نکالتا ہے۔ مشاطۂ بہار دایہ وار گیسوئے سنبل مسلسل کر کے دلجمعی سے پریشانی کھوتی ہے۔ سرسبز ٹہنیوں سے نئی نئی کونپل پھوٹتی ہے۔ نسیم سحر چل پھر کے کیا کیا مزے لوٹتی ہے۔

باغ کے سرد قامتوں سے لجا کر شرماتا ہے۔ بے بار ہے ندامت سے شرمسار ہے۔ انسان کی پرچھائیں سے سمٹا جاتا ہے۔ نرگس بیمار مشہور ہے کہ علیل ہے۔ اُس پر فرط شوق سے عصا نے سنبل کے بر سر سنبل ہے۔ ناز پروران آغوش بہار پر بلائے بن کا جوبن ہے۔ لالہ زار ہے۔ غیرت گلزار جوبن ہے۔ آب جو کے قہقہے سے نار سیدہ پھل شرما کے پتوں میں منہ چھپاتے ہیں۔ گلوں کے غنچے دامن گلچیں میں کھلکھلا کے لوٹے جاتے ہیں۔ فراش صبا گل کا بقچہ کبھی باندھتا ہے کبھی کھولتا ہے۔ غنچہ مسکرا کے پھولا ہے۔ دل بستگی بھولا ہے۔ اپنی گرہ میں زر گل ٹٹولا ہے۔ سر شاخ لالہ یاقوت کا پیالہ یادگار ساغر مل ہے۔ جھرنوں سے آبشار کا شور ہے۔ کیفیت کا زور ہے۔ ہر تختہ میں طاؤس کا غل۔ نہروں کے متصل سرو یا بگل لڑکھڑا کر ایک پانوں سے عازم رفتار ہے۔ فاختہ کی کوکو۔ قمری کو حق سرو جلوہ دار ہے۔ ایسا نمو کا جوش اس سال دیکھے ہیں کہ لکھنؤ کی گلیوں میں سبز لال دیکھتے ہیں۔ فیض ہوا سے تعجب نہیں جو طوطی تصویر سر سبز ہو۔ خامہ قلم ہو کر سبز ہو۔ ہر کیاری میں عبیر سے زیادہ معطر خاک ہے۔ لسان خس و خاشاک ہے۔ جفائے باغبان خوف خزاں سے طبیعت جو رکتی ہے۔ دعائے بقائے بہار کے واسطے ہر شاخ باردار کس بکی سے سجدہ کرنے کو جھکتی ہے۔ صحن گلشن میں ناز و نیاز کا جلسہ ہے وار یست پر سب کی تاک ہے۔ سہ برگہ نغمہ سنجان چمن کی سواری کا پانچ کلسہ ہے۔ قوت نامیہ کا یہ جوش ہے۔ کہ کوہ بھی لباس کاہی سے ہم لباس زمرد پوش ہے۔ شبنم کو خدمت آبدہی ہے۔ گلعذاروں کے چہرے سے گرد کلفت دھونے کی تیاری ہے۔ گل کے بناؤ پر بلبل سے بگاڑ ہے۔ کچھ بو پائی ہے۔ گو خبر بادہوائی ہے۔ اس پر چلی کٹی کی چھیڑ چھاڑ ہے۔ ہر گل و خار گلشن مثل کبک دری قہقہہ زن ہے۔ ہنسانے کو گیندے کا تختہ رشک زعفران تیار ہے۔ مہندی کی پتی پتی سے خون پوشیدہ کا پتہ برملا اُبلا آتا ہے۔ پنجہ مریم کے رشک سے پنجہ مرجاں کا مثل کہربا رنگ اڑا جاتا ہے۔ خون بلبل گل سرخ قبا کا دامنگیر ہے۔ گیسوے سنبل پانوں کی زنجیر ہے۔ رنج و ملال کا نام چمن دہر سے مثل حرف غلط حک

ہے۔ غنچوں کے چٹکنے کی صدا مبارکباد کی سلک ہے۔ بصد انداز گل اور ہزار انداز سے بلبل ہے۔ ارض وسما میں نوروز کا غل ہے۔ بلند صدائے دورباش ہونے لگی۔ غنچۂ مضمون کو گل اشرفی ہونے لگی۔ والسلام (از انشائے سرور)

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر

سر سید ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ سید حسینی ہیں۔ آپ کے آبا واجداد بنی امیہ اور بنی عباس کے ظلم وستم کے زمانے میں عراق عرب سے ایران میں آئے اور ہرات میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اور شاہجہاں کے زمانے میں آپ کے بزرگ ہندوستان آئے۔ سید محمد دوست جو کہ سر سید سے پانچ پشت اوپر ہیں۔ دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔ آپ کے دادا کو شاہ عالم کے زمانے میں جواد الدولہ کا خطاب ملا تھا۔ آپ کے والد میر متقی نہایت وضعدار اور سچے آدمی تھے۔ دبیر الدولہ آپ کے حقیقی نانا تھے۔

سر سید نے قرآن مجید ختم کرنے کے بعد مولوی حمید الدین صاحب سے فارسی پڑھی اس کے بعد عربی شروع کی۔ متوسطات تک پہنچ کر اپنے ماموں خواجہ زین العابدین صاحب سے علم ریاضی پڑھنا شروع کیا پھر علم طب کا شوق ہوا۔ حکیم غلام حیدر خاں صاحب سے طب کی ابتدائی کتابیں پڑھی۔ چندے مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸۔۱۹ سال کی تھی۔

۱۸۳۸ء میں جب کہ سر سید کی عمر تقریباً ۲۲ سال کی تھی۔ قلعہ کی تنخواہ بسبب حین حیات ہونے کے بند ہو گئی۔ اس وقت گورنمنٹ انگریزی کی ملازمت کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں صدر امین نے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کرا دیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد سر رابرٹ ہملٹن دلی میں جج ہو کر آئے۔ سر سید نے اُن سے مل کر نوکری کی درخواست کی۔ انھوں نے عدالت سشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا مگر سر سید نے انکار کیا۔ اتفاق سے انھیں دنوں میں مسٹر ہملٹن آگرے کے کمشنر ہوئے۔ وہاں آپ کو بلا کر ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں نائب منشی مقرر کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد آپ نے قوانین دیوانی متعلقہ عہدۂ منصفی کا ایک خلاصہ تیار کر کے صاحب کمشنر کے حضور میں پیش کیا۔ صاحب کمشنر نے اس کو گورنمنٹ میں بھیج دیا۔ اور سر سید کے لئے عہدۂ منصفی کی سفارش کی

گورنمنٹ نے یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو، سرسید کو دی جائے۔ ۲۴۔ دسمبر ۱۸۴۱ء کو مین پوری کے منصف مقرر ہوئے ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء میں تبدیل ہو کر فتح پور سیکری گئے۔ وہاں چار سال تک رہے۔ فتح پور کے قیام کے زمانے میں آپ نے تین رسالے لکھے۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ تحفۂ حسن۔ تسہیل فی جر الثقیل۔

۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ کے دربار سے آپ کو جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۰۔ فروری ۱۸۴۶ء میں آپ دہلی تبدیل ہوئے۔ اور ۱۸۵۴ء تک آپ دہلی ہی میں رہے۔ دہلی میں قیام کے زمانے میں آپ کو شہر دہلی اور اُس کے اطراف کی عمارات کی تحقیقات کا خیال ہوا۔ ملازمت کے دنوں میں فرصت کے وقت شہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرتے اور تعطیل کے دنوں میں بیرون شہر کی عمارتوں کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جایا کرتے۔ باہر کی عمارتوں کی تحقیقات۔ اُن کے کتبوں کا لکھنا۔ اُن کے طول و عرض کی پیمائش وغیرہ نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اس کے ڈیڑھ سال کے اندر اس کتاب کا پہلا اڈیشن چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس کا نام آثار الصنادید رکھا۔

مسٹر رابرٹسن کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہاں آباد اس زمانے میں ولایت جا رہے تھے ایک نسخہ آثار الصنادید کا ساتھ لے گئے۔ وہاں جا کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا ممبران سوسائٹی نے اُس کو بہت پسند کیا اور مسٹر رابرٹسن سے یہ فرمائش کی کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے۔ مسٹر رابرٹسن نے ولایت سے واپس آنے کے بعد اُس کا ترجمہ سرسید کی شرکت میں کرنا چاہا۔ سرسید نے اُس پر نظر ثانی کی۔ پہلے اڈیشن میں جو کمی رہ گئی تھی۔ اُس کی درستی و اصلاح کر دیا اور بڑی بات یہ کی کہ اُس کی زبان میں نہایت سادگی پیدا کر دی۔ یہ اڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر تیار ہوا۔

جنوری ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین بجنور کے مقرر ہوئے اُسی زمانے میں بجنور کی تاریخ لکھی۔ اور آئین اکبری کی تصحیح کی۔ آپ بجنور ہی میں تھے کہ غدر ہو گیا۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں بغاوت ہو گئی۔ ۱۲ کو بجنور خبر پہنچی اُس وقت بجنور میں ۲۰ یوروپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ سرسید نے اس موقع پر اپنا فرض ادلین سمجھا کہ اُن سب کی جانیں بچائیں۔ اس موقع پر نہایت دلیری سے کام لیا۔ اُنھیں کے حسن تدبیر اور نیک دلی سے تمام یوروپین عیسائی مرد اور عورتیں اور بچے صحیح و سالم وہاں سے نکل کر رڑکی پہنچ گئے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مواقع پر ایام غدر میں بڑے بڑے کام کئے۔ اپنی جان کی کوئی حقیقت نہ سمجھی۔

گورنمنٹ نے سرسید کی غدر کی خدمات کی قدر دانی کر کے اُس کے صلے میں ایک قیمتی خلعت ہزار روپے کا اور مبلغ دو سو روپیہ ماہوار کی پنشن دو نسلوں تک مقرر کر دی۔

ضلع بجنور کے ایک رئیس کی جائداد (تعلقہ چاند پور) بغاوت میں ضبط ہوئی تھی۔ مسٹر شکسپیر نے رپورٹ کی کہ منجملہ تعلقہ چاند پور کے ایک معقول جائداد سرسید کو دی جائے۔ گورنمنٹ نے سرسید سے استمزاج کیا۔ تو آپ نے اُس کے لینے سے انکار کیا۔ اور اس حیلے سے ٹالا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اُنھوں نے اپنی پیاس بجھانی نہ چاہی۔

اپریل ۱۸۵۸ء میں بجنور سے صدر الصدوری کے عہدے پر ترقی پاکر آپ مراد آباد گئے۔ وہاں سے غازیپور اور ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ آئے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو آپ مع اپنے دونوں بیٹوں سید محمود و سید حامد کے ولایت روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر اکثر عمائد سے ملے۔ ۱۷ ماہ تک وہاں مقیم رہے۔ ملکۂ معظمہ سے نہایت عزت سے ملاقات ہوئی۔ دو تین بار شاہی ڈنر میں بھی شریک ہوئے۔

۶ اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا آفس میں ڈیوک آف ارگائل کے ہاتھ سے آپ کو سی۔ آئی۔ ایس کا خطاب اور تمغہ عنایت ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند کا خطاب دیا گیا۔ کیمبرج یونیورسٹی کو آپ نے خود جاکر دیکھا۔ وہاں کی تمام تعلیمی باتوں پر غور کیا۔

۲۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید ولایت سے واپس آئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد آپ نے تہذیب الاخلاق ایک نادر پرچہ نکالا۔ اُس کا پہلا نمبر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شایع ہوا۔

۱۸۷۵ء کو ایک مدرسے کی علی گڑھ میں بنیاد پڑی۔ ۱۸۷۶ء میں سرسید نے پنشن لے کر اپنی زندگی کو اپنی قوم کے لئے وقف کر دیا۔ یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاس قائم ہوئے۔ اس کے بعد سے برابر آپ کالج کی ترقی اور مسلمانوں کی بہبودی کی کوشش میں رہے۔ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو آپ بیمار ہوئے۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو دس بجے رات کو ۸۱ برس کی عمر میں آپ نے انتقال فرمایا۔ اور اپنے قائم کئے ہوئے کالج کی مسجد کے بیرونی حصے میں دفن ہوئے۔

سرسید کو تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ راحت و رنج صحت و مرض۔ خلوت و جلوت کسی حالت میں اُن کا جی اس مشغلے سے نہیں اُکتاتا تھا۔ گرمی کے دنوں میں دوپہر کو بھی وہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے۔ رات کو اگر نیند نہ آتی تو کسی مضمون کو لکھتے لکھتے صبح کر دیتے۔

کاموں کے ہجوم یا شور و شغب سے سرسید کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے۔ جو مضمون لکھتے یا لکھواتے تھے مسلسل لکھوائے تھے۔ کہیں ترتیب میں فرق نہ آتا تھا۔

سرسید نے ۱۷۔۱۸ برس کے سن سے مضمون لکھنے شروع کئے۔ لیکن ۱۸۵۵ء تک ان کا طرز تحریر زمانے کی

قدیم روش کے موافق تھا، مگر اُس وقت میں بھی سادگی اور بے ساختگی اُن کی تحریر میں پائی جاتی تھی ۱۸۵۷ء کے بعد سے آپ نے اپنا طرز تحریر بالکل بدل دیا۔

سرسید کا طرز تحریر جس نے تیس پینتیس برس کے عرصے میں اردو لٹریچر کا رُخ پھیر دیا۔ اور مسلمانوں کے پولیٹکل اور سوشل خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اُس میں نہ زیادہ تشبیہات و استعارات ہیں۔ نہ صنائع لفظی و معنوی۔ نہ شاعرانہ نزاکت۔ نہ فاضلانہ و منشیانہ تراش و خراش۔ بلکہ سادگی اور بے ساختگی آپ کی تحریر کی عام خاصیت ہے۔ پھر بھی کلام میں تاثیر حد سے زیادہ ہے۔

آپ کے قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور پیچیدہ مضمون کے سمجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت تھی۔ آپ کے کلام میں صنائع لفظی و معنوی تجنیس۔ استعارے۔ برجستہ تمثیلیں۔ لطیف تلمیحیں۔ بذلے۔ لطیفے بھی جابجا ہیں جو حد سے زیادہ دلکش و دلفریب ہیں۔ کہاوتیں اور اشعار برمحل بھی جابجا نظر آتے ہیں۔ مگر یہ سب چیزیں بے قصد و بے ارادہ اُن کے قلم سے نکلی ہیں۔

سرسید میں قدرت بیان اس درجہ تھی کہ ہر مضمون کو حالت کے مناسب الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ اسی لئے قلوب پر اُن کا اثر بھی زیادہ ہوتا تھا۔ اُن کی تحریروں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب کو اس طرح سلجھا کر ادا کرتے ہیں کہ جو مضمون لفظوں میں سماتا نظر آتا ہو۔ وہ ایسی خوبی سے جم جاتا ہے۔ جیسے انگوٹھی پر نگیں جڑ دیا۔ اس لحاظ سے جو قدرت سرسید کے قلم میں دیکھی گئی ہے وہ فی الواقع نادر الوجود تھی۔ واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ جو برائیاں بسبب الف و عادت دلوں میں کھب گئی ہوں اُن کی بُرائی اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں۔ اُن کی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔

مولٰنا حالی اپنی کتاب حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ سرسید نے اردو زبان اور اردو لٹریچر کو طرح طرح کی مدد پہنچائی ہے۔ مگر جو بے بہا دخاص کر اُن کے لٹریری درکس سے اردو لٹریچر کو پہنچی ہے۔ اُس کے لحاظ سے ان کو فادر آف اردو کہنا کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔

اگرچہ سرسید کے سوا اور بھی بہت سے لائق لائق مصنف۔ مترجم اور مضمون نگار ملک میں گزرے اور موجود ہیں۔ جو نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسلوبوں سے اردو کو سرمایہ دار کر رہے ہیں۔ لیکن ہر شخص کی طرز تحریر میں یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ عام تحریروں کو اپنے سطح پر لے آئے بعض اشخاص ایسے اچھوتے اور شارع عام سے ایسے بعید ہوتے ہیں کہ لوگ اُن کا تتبع کرنے کی دسترس اپنے میں نہیں پاتے۔

سرسید کی طرز تحریر میں یہ خصوصیت تھی کہ اُس کی لطافت اور خوبی کے سبب سے لوگ عموماً اُس کو شوق اور توجہ سے پڑھتے تھے اور اُن کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی لکھنے کا

حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ اس لئے جو صفائی اور سلاست اور تہذیب و شائستگی اور رگھلاوٹ عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے اور مضمون نگاری کا جو سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے وہ سب اسی ایک قلم کی آواز بازگشت ہے۔
مجمع عام میں اسپیچ لکچر دینا یہ منجملہ اُن اوصاف کے ہے جو سرسید اور اُن کے معاصرین میں مابہ الامتیاز ہے مشہور ہے کہ تین چیزیں تین چیزوں کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ قوت نظری قوت عملی کے ساتھ۔ ذہن حافظے ساتھ۔ تحریر تقریر کے ساتھ۔ مگر سرسید میں یہ تینوں باتیں جمع تھیں۔ سرسید کی بڑی کامیابی کی وجہ اُن کی قوت تقریر تھی۔
سرسید کی سب سے زیادہ مؤثر اسپیچیں ہوتی تھیں جو کسی پبلک جلسے میں اپنے رائے کے خلاف سب کی تقریریں سن کر جوش کی حالت میں بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلی تھیں۔
آپ کی علمی تصانیف سے سلسلۃ الملوک۔ آثار الصنادید۔ اسباب بغاوت ہند۔ اور لکچرز کا مجموعہ اور صدہا مفید مضامین ہیں جو تہذیب الاخلاق اور علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھپے ہیں اور بہت سی مذہبی تصانیف ہیں۔

بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اِسکا ہاتھ اُسکے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اُس کا کان اس کے منہ میں۔ اور اس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں۔ اس نے اُس کو کاٹا۔ اور اُس نے اس کو بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دُم دبا کر بھاگ نکلا۔
نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کرکے آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں

کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراونی ہوجاتی ہیں۔ باچھیں چرجاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اُڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھرآتے ہیں۔ سانس جلدی چلتی ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ۔ ناک۔ بھوں۔ ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ آستین چڑھا۔ ہاتھ پھیلا۔ اُسکی گردن اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی ڈاڑھی اُسکی مٹھی میں لیتا ڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کرکے چھڑادیا۔ تو غراتے ہوئے ایک اِدھر چلاگیا۔ اور ایک ادھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑ نے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔ جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے۔ اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں توتو میں میں تکرار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث کرنے سے پرہیز کرے۔ انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے۔ اور اُس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی محبت اور دوستی کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہموطنو۔ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ۔ لہجہ۔ آواز۔ وضع۔ لفظ۔ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ بھی نہ پائی جائے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یا شاید مجھے دھوکا ہوا۔ یا میں غلط سمجھا۔ گو بات تو عجیب ہے۔ مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار نہ بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں

میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اُس دو تین دفعہ کی اُلٹ پھیر سے تمھارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے۔ اور نہ تمھارا مطلب باتوں کی اُلٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا۔ کیونکہ جھگڑا بلاشبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہوجاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور ایسی عزیز چیز (جیسی کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو۔ کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے۔ اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو ختم کرو۔ اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ اُن کی مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔ فقط۔ (سر سید احمد خاں۔ از تہذیب الاخلاق)

خیر دائم

غالباً تمام دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ نیکی بلاشبہ نیک ہے اور اس بات کا ماننا بھی لازم آتا ہے کہ ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل اور اعلیٰ نیکی ہے۔

انسانوں میں نیک وہی ہوگا جس نے بہت سی نیکیاں کی ہوں گی۔ مگر سب سے زیادہ نیک وہی ہوگا جس نے ایسی نیکیاں کی ہوں جو سب نیکیوں سے افضل اور اعلیٰ ہوں۔

مسلمانوں کے عقاید کے مطابق انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام نیک ترین بندگانِ خدا ہیں اور اس لئے ضرور ہے کہ وہ ایسی نیکیوں کے منبع یا مخزن ہوں جو تمام نیکیوں سے اعلیٰ اور افضل ہوں۔ ورنہ ترجیح بلا مرجح ہوگی۔ اس لئے ہر ایک انسان کو ایسی نیکی کی جو ہمیشہ رہنے کی ہے تلاش اور تجسس لازم ہے۔

بعضوں نے پل اور مسجد۔ چاہ مہمان سرائے چند روزہ رہنے والی چیزوں کو خیر دائم سمجھا اور

بہت بڑی غلطی کی۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں ادنیٰ حوادث سے فنا اور معدوم ہونے والی ہیں۔ اب کہاں ہے وہ چاہ یوسف؟ اور کہاں ہے وہ مسجد اقصیٰ؟ سب معدوم ہو گئیں۔ اور اسی طرح ہزاروں نیکیاں اور معدوم ہوں گی۔

نہایت فہمیدہ اور دقیقہ رس لوگوں نے خیر و خیرات میں زہد و تقویٰ اور عبادت کو خیر دائم خیال کیا۔ مگر اس کی صحت بھی مشتبہ ہے۔ تمام اعمال حسنہ آنکھ موندی اور منقطع ہوئے۔ جب کہ انسان موت کے خواب راحت میں استراحت فرماتا ہے تو تمام اعمال حسنہ کا انقطاع ہو جاتا ہے۔ زاہد کی تسبیح ہمہ تن دانہ اشک بن کر روتی ہے کہ وہ کیا ہوا جو مجھ کو شمار وظائف سے زندہ رکھتا تھا۔ مصلیٰ محراب میں چت پڑا ہائے ہائے کرتا ہے کہ وہ کہاں ہے جو اپنی پیشانی سے مجھ میں جان تازہ بخشتا ہے؟ منبر فراق واعظ سے دل شکستہ ہے کہ میرا واعظ کہاں ہے۔ ملائکہ مقربین جو اس کے ذکر و شغل کی مجلس کی خیر و برکت لینے کو آتے تھے۔ اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور یہ مشت خاک ہزاروں من مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ نہ اپنی کچھ کہتے ہیں نہ کسی کی سنتے ہیں۔ صرف زبان حال اُن میں باقی ہے سو وہ یہ کہتی ہے کہ جو ہونا تھا سو ہو لیا اور جو کرنا تھا سو کر لیا۔

غرض کہ ہر ایک قسم کی نیکی کو جب خیال کرو گے تو وہ اُسی شخص کی ذات پر منحصر ہو گی اور اُس کی فنا کے ساتھ ہی منقطع ہو گی۔ اس لئے زہد و تقویٰ و سخاوت خیر دائم نہیں ہو سکتی۔

اگر غور سے دیکھا جائے اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے تو بجز رفاہ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔ انسان کی بھلائی نہ نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اُس زمانے کے انسانوں کے فنا ہونے سے فنا ہوتی ہے۔ بلکہ نسل در نسل اور پشت در پشت آئندہ انسانوں میں چلی آتی ہے۔ اور اس لئے صرف وہی ایک نیکی ہے جس کو خیر دائم کہہ سکتے ہیں۔

یہ نکتہ تھا جس کے سبب خدائے تعالیٰ نے انسان کی بھلائی چاہنے کی خدمت انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دی۔ تاکہ بہترین بندگان خدا نیک ترین نیکیوں کے منبع اور مخزن ہوں اور خیر دائم اُن سے باقی رہے۔ پس انسان کی بھلائی میں سعی کرنا انبیا کا ورثہ لینا ہے اور تمام

نیکیوں میں سے افضل اور اعلیٰ نیکی کا اختیار کرنا یعنی فلاح عام کے کاموں کو عبادات دینی میں سے نہ سمجھنا اور صرف نوافل اور مندوبات اور تسبیح وتہلیل ہی کو عبادت سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ (سرسید احمد خاں۔ از تہذیب الاخلاق)

امید

دنیا بامید قائم ہے

موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بُری ہو انسان کے دل کے مشغلے کو کافی نہیں ہوتی موجودہ رنج و خوشی۔ محبت و دوستی کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں۔ اس لئے اُس بڑے کاریگر نے جس نے انسان کے پتلے کو اپنے ہاتھ سے اور اپنے ہی مانند بنایا۔ اُس میں چند اور قوتیں دی ہیں جن کے سبب سے دل کے لئے کاموں کی کمی نہیں ہوتی اور ہمیشہ و ہر وقت دل کے مشغول رہنے کا سامان مہیا و موجود رہتا ہے۔ اُنھیں قوتوں کے ذریعے سے گذری ہوئی باتیں پھر دل میں آتی اور آئندہ کی باتوں کا اُن کے ہونے سے پیشتر خیال ہوتا ہے

وہ عجیب قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے۔ جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لئے نہیں ملتی تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بلالاتی ہے۔ اور اسی فکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے۔ اُس کی مثال جگالی کرنے والے جانور کی ہے کہ وہ پہلے تو گھاس دانہ سب کھا لیتے ہیں۔ اور جب وہ ہو چکتا ہے تو ایک کونے میں بیٹھ کر پھر اُس کو پیٹ سے نکال کر چباتے جاتے ہیں۔

جس طرح کی یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل کے مشغلے کو بلالاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور قوت ہے جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے۔ اور جس کا نام امید و بیم یا خوف و رجا ہے۔ انہی دونوں قسم کے خیالوں سے ہم آئندہ زمانے تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باتیں کہ دور زمانہ میں شاید ہونے والی ہیں اور ظلمات کے پردوں میں چھپی ہوئی

ہیں اور بڑے گہرے اندھیرے گڑھوں میں پڑی ہوئی ہیں ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ ابھی ہو رہی ہیں اُن کے ہونے سے پہلے اُن کی خوشی یا رنج اُٹھانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس زمانے کا بھی جب نہ یہ زمین ہوگی نہ آسمان اور ہر چہار طرف سے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ کی آواز آتی ہوگی۔ ابھی خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف موجودہ وقت پر محدود ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ میں اس تحریر میں صرف اُسی کا کچھ بیان کروں جس کو امید کہتے ہیں۔ ہماری خوشیاں اس قدر کم و چند روزہ ہیں کہ اگر وہ قوت ہم میں نہ ہوتی جس سے انسان اُن عمدہ اور دل خوش کن چیزوں کا اُن کے ہونے سے پہلے مزہ اٹھاتا ہے جن کا کبھی ہو جانا ممکن ہے تو ہماری زندگی نہایت ہی خراب اور بدمزہ ہوتی۔ ایک شاعر کا قول ہے کہ "ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے کی اُمید رکھنی چاہئے۔ کیونکہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی امید نہ ہوسکے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہم کو دے نہ سکے۔

فارسی زبان میں مشہور مقولہ ہے کہ "تمنا را عیبے نیست" ایک ظریف نے کہا کہ دنیا میں مجھے کسی چیز کا رنج نہیں ہے۔ کیونکہ امید مجھے ہمیشہ خوش رکھتی ہے۔ دوستوں نے پوچھا کہ کیا تم کو مرنے کا بھی رنج نہیں ہے؟ اُس نے کہا کہ کیا عجب ہے کہ میں کبھی نہ مروں۔ کیونکہ خدا اس پر بھی قادر ہے کہ ایک ایسا شخص پیدا کرے جس کو موت نہ ہو۔ اور مجھ کو امید ہے کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔ یہ قول ایک ظریف کا تھا مگر سچ یہ ہے کہ زندگی کی امید ہی موت کا رنج ہم سے مٹاتی ہے۔ اگر ہم کو زندگی کی امید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ بدتر حالت کسی کی نہ ہوتی۔ زندگی ایک بے جان چیز کے مانند ہے جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی۔ اُمید اُس میں حرکت پیدا کرتی ہے امید ہی کے سبب سے انسان میں سنجیدگی اور بردباری اور خوش مزاجی کی عادت ہو جاتی ہے گویا امید انسان کی روح کی جان ہے۔ ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے۔ اور تمام تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے۔ محنت پر رغبت دلاتی ہے اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے اُمید سے ایک اور بھی فائدہ ہے۔ جو کچھ کم نہیں ہے۔ کہ ہم موجودہ

خوشیوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے۔ اور اُسی میں محو نہیں ہو جاتے۔ سیزر نے جب اپنا تمام مال اسباب اپنے دوستوں کو بانٹ دیا تو اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اپنے لئے کیا رکھا اُس نے کہا کہ اُمید۔ اُس کی عالی طبیعت اُن چیزوں کی کچھ قدر نہیں کرتی تھی جو اُس کے پاس تھیں بلکہ ہمیشہ اُس کا خیال کسی بہتر چیز کی طرف رہتا تھا۔

اگلے زمانے کے لوگ بغیر امید کے زندگی کو نہایت ہی بُرا سمجھتے تھے۔ نقل ہے کہ خدا نے انسان کے پاس ایک صندوقچہ بھجوایا۔ جب اُس کو کھولا تو اُس میں سے ہر ایک قسم کی بلائیں اور مصیبتیں اور بیماریاں جو انسان کو ہوتی ہیں سب نکل پڑیں اُمید بھی اُسی صندوقچہ میں تھی وہ نہ نکلی بلکہ ڈھکنے میں چمٹ رہی اور صندوقچہ ہی میں بند ہو گئی تاکہ مصیبت کے وقت انسان کو تسلّی دے پس جس زندگی میں امید ہے اُس سے بڑھ کر کوئی خوش زندگی نہیں ہے خصوصاً جب کہ امید ایک عمدہ چیز کی اور اچھی بنا پر ہو جو امید کرنے والے کو حقیقت میں خوش کر سکتی ہو۔ اس بات کی حقیقت وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خوش حال آدمی کے لئے بھی زمانۂ موجودہ میں کافی خوشی نہیں ہے۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مذہبی زندگی میں عمدہ عمدہ چیزوں کی بہت سی اُمیدیں ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں کی ہوتی ہیں جو ہم کو پورا پورا خوش کر سکتی ہیں۔ دینی چیزوں کی امیدیں دنیوی چیزوں کی امیدوں سے بہت زیادہ قوی اور مضبوط ہوتی ہیں کیونکہ اُن میں عقل کے علاوہ مذہبی اعتقاد کی بھی نہایت قوت ہوتی ہے۔ اس قسم کی امیدوں کا خیال ہی ہم کو پورا پورا خوش رکھتا ہے بلاشبہ امید کے اثر سے انسان کی زندگی نہایت شیریں ہو جاتی ہے اگر وہ موجودہ حالت سے خوش نہیں رہتا تو اُس پر صبر تو ضرور آ جاتا ہے مگر مذہبی اُمیدیں اُس سے بھی فائدہ مند ہیں۔ تکلیف کی حالت میں دل کو سنبھال لیتی ہیں۔ بلکہ اُس کو اس حالت سے خوش رکھتی ہیں کہ شاید یہی تکلیف اُس امید کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہو۔ مذہبی امید گویا مرنے کو زندہ کر دیتی ہے اور اُس کے دل کو غایت درجہ کی خوشی بخشتی ہے۔ انسان اپنی تکلیفوں پر خوش

رہتا ہے اور روح اُس بڑی چیز کے لپک لینے کو اچھلتی ہے جو ہمیشہ اُس کی نظر میں رہتی ہے اور آخر کار اُس امید کی خوشی میں اس فانی جسم کو چھوڑ دیتی ہے کہ قیامت کے دن اُس سے مل جائے گی۔

(سرسید تہذیب الاخلاق)

باہمی اتحاد اور تعلیم پر تقریر

ورسۂ گورداسپور پنجاب میں ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو یہ لکچر دیا۔

جناب پریسیڈنٹ صاحب و دیگر بزرگان و طالبعلمان۔

اس وقت میں آپ صاحبوں کی خدمت میں اس لائق نہیں ہوں کہ اس حال میں جو ایک تعلیم گاہ ہے جس میں لائق ہیڈ ماسٹر اور ٹیچر موجود ہیں۔ اور اور بھی بہت سے لائق لوگ تشریف رکھتے ہیں تعلیم و تربیت کے باب میں کچھ کہنے کی جرأت کروں۔ مگر میں اپنے خیال نسبت تعلیم و اتحاد کے جو کچھ کہ ہیں۔ اس لئے بیان کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جو کچھ اس میں غلطیاں ہوں گی اُن کی اصلاح ہو گی۔

اے صاحبو! ہمارے ملک ہندوستان میں جو کہ غالباً صدیوں سے ان دو قوموں سے جو ہندو اور مسلمان کے لفظ میں تقسیم کی گئی ہوں آباد ہیں۔ اُن کے بزرگوں کی عظمت اور فضیلت اور ناموری ایسی نہ تھی جو بھلا دی جائے۔ ہندؤں کے بزرگ جس قدر کہ انھوں نے تمام علوم ریاضیات۔ ہندسہ حساب۔ لاجک۔ فلاسفی۔ مارل سنس میں ترقی کی۔ آج تک اُن کی یادگار نشانیاں ہیں جس سے اُن کی اولاد کو فخر ہے۔ مسلمان بعد کو اس ملک میں آکر آباد ہوئے وہ بھی اپنے بزرگوں کی عمدہ تحریرات عمدہ تالیفات اور تصنیفات پر فخر کرتے ہیں۔ انھوں نے علم کی ہر شاخ میں ترقی دی۔ گویہ علم یونانیوں سے حاصل ہوئے۔ مگر انھوں نے اُس کو ایسے درجے تک ترقی پر پہنچایا کہ یونان اور انگلستان دونوں کو اُن کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ میں یقیناً بہت سے لڑکے اور جوان یاد کر کے فخر کرتے ہوں گے۔ مگر اے دوستو! بزرگوں

کی یاد کر کے فخر کرنا اور خود کچھ نہ ہونا حمیت کے خلاف ہے۔ بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی سے اُن بزرگوں کے نام کو بھی بٹّہ لگانا ہے۔ نہایت افسوس ہے۔ ان دونوں قوموں پر جن کے بزرگ ایسے گذرے اور جہالت میں پڑ کر بزرگوں کو بھی بدنام کریں۔ اس زمانے میں علم کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔ لیکن ہم کو تعلیم کے معاملے میں اول غور کرنا چاہیئے کہ کیا چیز ہے جس کو ہم سیکھیں اور کیا چیز ہے جس کا سیکھنا ہم کو مفید نہ ہوگا۔ میں اُس بزرگ زبان کو جو سنسکرت ہے جس کو ہمارے ملک کے باشندوں کا ایک حصہ عزیز رکھتا ہے اور واقعی وہ اپنا ثانی بھی نہیں رکھتی ہے۔ یا اُس مقدس زبان کو جو عربی کہلاتی ہے جس کو میں دل سے مقدس سمجھتا ہوں اور جو اس قابل بھی ہے کہ تمام علوم اور سائنس اُس میں لائے جا سکتے ہیں۔ دل سے پسند کرتا ہوں مگر باوجود ان سب خوبیوں کے جو اُن زبانوں میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ اگر ہم بغیر خیال ضرورت کے تعصب یا نیچرل خواہش سے اپنی اُن دونوں زبانوں کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیں تو یقین کرنا چاہیئے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی ہم کو ضرورت ہے اُس کو چھوڑ بیٹھیں گے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُن مقدس اور پرانی زبانوں کو بالکل چھوڑ بیٹھیں۔ سمجھنے کی یہ بات ہے کہ بالفعل ہم کو ضرورت کس چیز کی ہے۔ اور کون زبان ہم کو علوم کے اعلیٰ مطالب کی طرف پہنچا سکتی ہے۔ اُس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ انگلش لینگویج۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں کی کتابیں علوم و فنون سے بھری ہوئی تھیں۔ مگر اب دیکھنا چاہیئے کہ علوم و فنون نے کہاں تک ترقی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن علوم کے بیج ہمارے بزرگوں نے بوئے تھے وہ اب برومند اور تناور درخت ہو گئے ہیں اور اُن میں ایسے پھل پھول لگے ہیں اور ایسی خوشنما شاخیں نکلی ہیں اور ایسے لذیذ میوے لگے ہیں کہ وہ ایک نئے درخت معلوم ہوتے ہیں۔ علوم جدیدہ جو بالکل نئے ہوں اور جن کا وجود مطلقاً ہمارے بزرگوں کے زمانے میں نہ پایا جاتا ہو۔ واقعی تھوڑے ہیں۔ اور زیادہ وہی ہیں جو اگلے بزرگوں کے پاس تھے

مگر حقیقت میں اُس وقت وہ بیج تھے اور اب وہ میلدار درخت ہوگئے ہیں۔ پس اب ہمارا اُن بیجوں پر فخر کرنا اور اُن بار آور درختوں کے سائے سے فائدہ نہ اُٹھانا اور اُن لذیذ میووں کے ذائقہ سے محروم رہنا ہم کو نہ کچھ فائدہ دینے والا ہے نہ کچھ عزت بخشنے والا۔ اگر ہم ہی علوم میں ترقی کرتے جائیں تو اُن بیجوں کا جو ہمارے باپ دادانے بوئے تھے ہم کو فائدہ حاصل ہوگا۔ نہیں تو ہم پرانے کہنہ لگے ہوئے بیجوں کو جن میں بسبب کہنگی کے نمو کی طاقت بھی نہیں رہی ہے۔ ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں گے۔ ہم کو اب ہری ہری شاخیں اور میوہ دار ٹہنیاں لینی چاہئیں۔ جو میووں کے گچھے اس میں لٹک رہے ہیں اُن سے تمتع حاصل کرنا چاہیے
پس اب یہ بات قابل دیکھنے کے ہے کہ وہ علوم کن کن زبانوں میں ہیں؟ اور اُن میں سے ہم کو کس زبان کو اختیار کرنا چاہیے؟ تمام یورپ میں فرنچ زبان سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ شیریں اور سب سے زیادہ پولیٹ ہے۔ علوم جدیدہ بھی فرنچ زبان میں بہت ہیں۔ اور قریب زمانہ آنے والا ہے کہ جرمن زبان بھی اُس سے زیادہ علوم کے لئے مخزن ہو جائیگی مگر وہ دونوں زبانیں ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔ یہ علوم انگلش لینگویج میں بھی ہیں اور ہم جو کچھ ترقی کر سکتے ہیں۔ اسی زبان میں کر سکتے ہیں۔ ہم انگلش گورنمنٹ کے زیر سایہ بستے ہیں۔ جس میں ہم کو ہر طرح کا امن و امان حاصل ہے۔ ہم کو اپنی گورنمنٹ کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اس نے ہم کو امن و امان کے سوا تعلیم میں بھی ایسی مدد دی ہے کہ کوئی سلطنت کوئی بادشاہت ایسی ہم کو نظر نہیں آتی جس نے اپنی رعایا کی تعلیم میں ایسی مدد کی ہو اور عمدہ سامان تعلیم کا مہیا کر دیا ہو۔ گرداسپور کوئی بڑا مقام نہیں ہے۔ مگر دیکھیے کہ گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم گاہ موجود ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم شکر گذاری کے ساتھ تعلیم کا فائدہ نہ اُٹھائیں
مگر اے دوستو! میری رائے اور میرا خیال یہ ہے کہ کوئی گورنمنٹ ہر ایک قوم کی تعلیم کا ذمہ اپنے اوپر نہیں لے سکتی ہے۔ بلکہ میں مضبوطی سے اس رائے پر ہوں کہ ممکن نہیں کہ گورنمنٹ اپنی تمام رعایا کی تعلیم کر سکے۔ اس سے بھی سخت میری رائے یہ ہے کہ کوئی قوم جس کو اپنے

بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو۔ جب تک وہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اُس کی خواہش کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔ جو کچھ مجھے افسوس ہے یہی ہے کہ ہماری قوم کو ہر جگہ یہی خواہش ہے کہ گورنمنٹ اسکول قائم ہو۔ مگر یہ خواہش کسی طرح پوری نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ گورنمنٹ کی آمدنی بہ لحاظ اُس کے اور مصارف کے کسی قوم کی تعلیم کے واسطے کافی نہیں ہو سکتی ہندوستانیوں کو ترقی اُس وقت ہو گی جب وہ اپنے باہمی چندہ۔ اپنے انتظام۔ اپنی قوت سے بلا مداخلت گورنمنٹ اور اُس کے افسروں کے اپنی خودسری اور اپنی مرضی کے موافق اپنے بچوں کی تعلیم کریں

اے دوستو! تم اس بات کا خیال کرو کہ گورنمنٹ جو ایسی وسیع مملکت ہندوستان میں حکومت کرتی ہے۔ جس میں مختلف قومیں مختلف اغراض کے لوگ بستے ہیں۔ وہ کسی ایک قوم کی طرفداری یا بہتری کی کوشش نہیں کر سکتی۔ اُس کو لازم ہے کہ اُس کے قواعد تعلیم ایسے ہوں جو یکساں سب سے متعلق ہو سکتے ہوں۔ اور جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ قوم کی ضرورتیں مختلف ہیں پس گورنمنٹ اپنی دوراندیشی کے قاعدے سے کسی خاص فرقے کی خاص ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اور ہرگز نہیں کر سکتی۔ ایک بات اور خیال کرنے کی ہے۔ کہ انگریزی گورنمنٹ کی کچھ ہی تعریف کی جاتی ہو کچھ ہی عمدگی اُس میں ہو مگر سب سے زیادہ عمدگی جو اُس میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلیم مذہبی سے بالکل علیحدہ ہے۔ اگر گورنمنٹ کسی مذہبی تعلیم میں دخل دے گو وہ نیک نیتی اور نیک دلی ہی سے کیوں نہ ہو ہم کو شبہ میں ڈالے گا۔ اور بہت بڑا خیال ہمارے دل میں پیدا ہو گا۔ اس سبب سے بچوں کی تعلیم مذہبی گورنمنٹ کی مصلحت اُس کی پالیسی اور اُس کے انتظام حکومت کے بالکل خلاف ہے۔

اگر گورنمنٹ کے اسکول ہماری دنیوی تعلیم کے واسطے کافی ہوں تب بھی ایک ضروری جزو مذہبی تعلیم کا رہا جاتا ہے۔ پس ہمارے ہم وطن اور ہم قوم لوگوں کو گورنمنٹ پر بوجھ تعلیم کا نہ ڈالنا چاہئے۔ اور تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ ہم کو مدد دے۔ اس سے زیادہ گورنمنٹ سے مانگنا بے غیرتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے گورنمنٹ ہر اسکول میں مدد

دینے کو تیار ہے۔ ہم کیوں کہیں کہ فلاں قسم کی تعلیم ہم کو چاہئے اور فلاں قسم کے مدرسے یا کالج ہماری تعلیم کے لئے ضروری ہیں۔ کیوں نہیں تعلیم کو ہم لوگ اپنے ہاتھ میں لیں اور جس طرح کی تعلیم کی ضرورت سمجھیں۔ اُس طرح کی تعلیم دیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ابھی ایک لیڈی نے ایک نیا کالج قائم کیا ہے۔ اُس فیاض لیڈی نے اُس کالج کے لئے اپنے پاس سے اٹھارہ لاکھ روپے دئے ہیں جو یہاں کے حساب سے بیس[۲] لاکھ ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے ملک کے ہر ضلع و ہر قصبے کے لوگ مدرسہ قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں کی مردم شماری کچھ ہی ہو۔ مگر دو روپیہ اوسط فی کس دینے سے یہاں کے لوگ لاہور کالج سے زیادہ عمدہ ایک کالج گوردا سپور میں قائم کر سکتے ہیں لیکن ہمت اور ارادے کی کمی ہے۔

تعلیم کے متعلق میں اس وقت یہ بحث کرنا نہیں چاہتا کہ کون کون علوم اور فنون عمدہ ہیں اور کون کون تعلیم میں شامل ہونے چاہئے۔ یہ بہت بڑا وسیع میدان ہے اور بہت لوگوں نے اس پر رائے دی ہے۔ اس وقت میں اُس تعلیم کا ذکر کروں گا جس کو میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کہتا ہوں۔ اور جس کی عموماً ملک کے لوگوں کو ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان عمدہ طور پر جاننا۔ عمدہ گفتگو کرنا۔ انگریزی اخباروں کا بخوبی پڑھنا۔ قانون انگریزی کو خوب سمجھنا۔ اپنے خیالات کو انگریزی تحریر میں اچھی طرح ظاہر کر سکنا۔ اسی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تعلیم سے تربیت جدا نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارے ملک کے لڑکے اس قدر تعلیم پا جائیں اور ایسی تحریر کر سکیں جس سے وہ لارڈ میکالے کا خطاب پا سکیں اور تربیت اُن میں نہ ہو تو وہ کسی کام کی نہیں۔

لارڈ میکالے میرے خیال میں وہ شخص ہے جس نے ہندوستان میں بھلائی کے درخت کا یا یوں کہو کہ علم کے درخت کا بیج بویا۔ کوئی گورنر جنرل اور کوئی ویسرائے ہندوستان میں ایسا نہیں گذرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان کو بھلائی پہنچائی ہو۔ گو یقیناً اُس نے جو کچھ کیا اپنی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور بھلائی کے لئے کیا۔ مگر اُسی کے ساتھ اصلی

خیر خواہی اور بھلائی کی اصلی جان اُس نے ہمارے ملک میں بھی ڈال دی۔

اے دوستو! تربیت اور تعلیم دو چیزیں ہیں۔ صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے۔ بولنے میں تو یوں آتا ہے کہ تعلیم اور تربیت۔ مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کو اس پر خیال کرنا چاہئے۔ کہ اگر لڑکوں کی تعلیم کا گورنمنٹ کے اسکولوں پر بھروسہ کرتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ تربیت بھی پا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد مارل کی درستی ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ ہیں جن کا طرز اخلاق ایسا خراب ہے جس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ کاش وہ بے تعلیم ہی رہتے تو اچھا ہوتا۔ میں تمام ہندوستان میں جہاں تک خیال کر سکتا ہوں اور جن بڑے بڑے شہروں میں پھرا ہوں اور وہاں کے حالات سے واقف ہوا ہوں نہایت زور سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی کو اولاد کی تربیت کا خیال نہیں ہے۔

اے عزیزو! سمجھو کہ اگر لڑکے کسی گورنمنٹ اسکول میں پانچ گھنٹے تعلیم پا کر آتے ہیں۔ تو اُن کا باقی حصہ زندگی کا جو بالکل سادہ اور مثل ایک پودے کی نرم شاخ کے ہوتا ہے کہ جس طرح پر چاہو ٹیڑھی یا سیدھی کر سکو کس طرح بسر ہوتا ہے۔ گھر کے نوکروں کی صحبت گلیوں میں بازاری لونڈوں کے ساتھ کھیلنا۔ اُن کی صحبت میں بداخلاقی کی باتیں سیکھنا اور فحش اور بداخلاقی کے الفاظ جو وہ لونڈے بولتے ہیں اور بکتے ہیں اُن کو سننا۔ اسی قسم کے حارت کن رذائل میں اُن کی زندگی کا پاک حصہ بسر ہوتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ فرشتہ سیرت ہوتے شیطان سے بدتر ان کے اخلاق ہو جاتے ہیں۔ جب کہ لڑکوں کا چہارم حصہ ماسٹر کے پاس اور اُس سے زیادہ حصہ خراب حالت میں گزرتا ہے تو کیا اس سے اُن کی تربیت اخلاق کی توقع ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اور ہمارے بچے تربیت یافتہ اور مہذب ہوں۔ دوسری قوموں میں عزت پاویں تو اُن کا پہلا فرض یہ ہے کہ تربیت کی فکر کریں۔ میں یہ نہیں کہتا وہ سب کچھ میرے ہی

خیال کے موافق کریں۔ تم مجھ کو جانے دو۔ میرے خیال کی پیروی نہ کرو۔ تم خود سوچ کر کوئی تدبیر نکالو۔ دیکھو یہ یوروپین بچہ (ایک کم عمر لڑکا جو اُس وقت موجود تھا اُس کی طرف اشارہ کیا) جو اِس وقت موجود ہے۔ کیا تم کوئی ایسا بچہ اپنی قوم میں نکال سکتے ہو؟ گو یہ بچہ اب تک سوسائٹی میں نہیں ملا مگر یہ اپنی ماں کی تربیت سے کیسا نیک عادتوں کا نمونہ ہوا ہے۔ اگلے زمانے میں ہماری اولاد بھی اپنے باپ اور اُس کے دوستوں کی صحبت سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ ان کے اخلاق حسنہ سیکھتی تھی۔ واقعی وہ بہت اچھا طریقہ تھا۔ مگر وہ تیلیاں جس ڈورے سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا۔ اب یہ دوسرا ڈورا اُن کے باندھنے کو ہونا چاہیے۔ اب جو نسلیں موجود ہیں آپ مجھ کو معاف کیجیے گا وہ اس لائق نہیں کہ بچے اُن سے تربیت پا سکیں پس مناسب ہے کہ اولاد کی تربیت کی فکر اور تدبیر کی جائے۔ گورنمنٹ پر بوجھ نہ ڈالیے۔ اس سے صرف مدد لیجیے جو اُس کا فرض ہے۔ اور جس کے ادا کرنے پر وہ آمادہ ہے۔

اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں۔ اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب و ہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنواں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت کا شریک ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے اُن دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دینا ہے۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں قومیں تباہ اور بگڑ جائیں گی۔

پرانی تاریخوں میں پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپ میں مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں۔ مگر سب ایک قوم میں شامل ہوتے ہیں۔ گو اُن میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے

ہیں۔ مگر وہ آپس میں مل جُل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔

اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین پر تم دفن نہیں ہوتے ہو۔ یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔ اتفاق کی خوبیاں مجھ کو زیادہ بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص اتفاق نہیں رکھتا وہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ بُرا کرتا ہے۔ جو لوگ باہم برخلاف ایک دوسرے کے دشمن ہیں وہ بھی جب دل میں سوچتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بُری بات ہے۔ جو چیز نہایت عمدہ اور خوب ہے وہ اتفاق ہی ہے۔ اتفاق کر کے جو کچھ کیا جائے گا وہی عمدہ ہوگا۔ پس اس امر پر خیال کر کے باہم اتفاق کرنا چاہیے۔ اور اس اتفاق کے ذریعے سے قومی تعلیم اور تربیت حاصل کرنا چاہیے۔ میں کچھ اور زیادہ بیان کرتا۔ مگر آپ مجھے معاف رکھیں کہ میں آج ہی ابھی آیا ہوں۔ اور سفر کی تکان سے خستہ ہو رہا ہوں۔

(سر سید از مجموعۂ لکچر)

نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں

۹۔ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوے میں پیدا ہوئے۔ علوم مشرقیہ کی ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے گھر ہی پر پائی۔ ۱۵ سال کی عمر میں مولوی عنایت حسین صاحب سے پڑھنا شروع کیا جو اس زمانے کے نہایت مشہور عالم تھے۔ بعد فراغ تحصیل جب معاش کی تلاش ہوئی۔ تو دس روپیہ کا جو نوکری بھرتی ملی۔ ۱۸۵۷ء میں وہ اہلمد ہوئے۔ غدر کے بعد بصلۂ خیر خواہی گورنمنٹ آپ کو

پیشکاری ملی ۔ ۱۰ سال کے بعد سررشتہ دار ہوئے ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہوئے ۱۸۶۳ء میں
امتحان مقابلہ پاس کیا ۱۸۶۷ء میں مرزاپور کے مستقل ڈپٹی کلکٹر ہوئے ۱۸۷۴ء میں سرسالار
جنگ بہادر نے آپ کو حیدرآباد دکن بلالیا۔ وہاں پہلے انسپکٹر جنرل مال کے عہدے پر
مامور ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کمشنر محکمۂ بندوبست و پیمائش ہو گئے ۱۸۸۴ء میں
وہ فنانشل اور پولیٹیکل سکریٹری کے اعلیٰ ترین عہدے پر ممتاز ہوئے۔ اس عہدے پر اُن
کی تنخواہ دو ہزار آٹھ سو روپے مقرر ہوئی۔ اس خوش اسلوبی سے آپ نے اس عہدے کی نازک
ذمہ داریوں کو سرانجام کیا کہ ریاست نے ازراہ قدردانی منیر نواز جنگ محسن الدولہ محسن
الملک بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ۱۵ جولائی ۱۸۹۳ء کو اس عہدے سے علیحدہ ہوئے۔
اور تادم مرگ آٹھ سو روپے ماہوار بطور پنشن اُس دریائے فیض رئیس کی ریاست سے ملتے
رہے۔ سرسید کے انتقال کے کچھ دنوں بعد آپ ایم۔ اے او کالج کے سکریٹری ہوئے۔ آخر دم تک
قومی خدمات نہایت سرگرمی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء ۹ بجے شام کو آپ نے اس
عالم سے سفر اختیار کیا۔ علی گڈھ میں دفن ہوئے۔

آپ نہایت ذہین تھے۔ مضامین عمدہ لکھتے تھے۔ آپ کے لکچر نہایت پرتاثیر ہوتے تھے ۱۸۷۰ء
سے برابر تہذیب الاخلاق اور انسٹیٹیوٹ گزٹ میں آپکے مضامین شایع ہوتے رہے۔ آپ دم واپسیں
تک زبان اردو کی خدمت کرتے رہے۔ لکچروں کا ایک ضخیم مجموعہ اور مضامین ہفت سالہ تہذیب
الاخلاق۔ المحبت والشوق اور دیگر تصانیف آپ کی چھپ کر شایع ہو چکی ہیں۔

محبت کی حقیقت اور اُس کے اسباب

جاننا چاہئے کہ محبت کے واسطے معرفت یعنی پہچان کا ہونا ضرور ہے۔ اس لئے کہ اگر پہچان نہ ہوگی تو
محبت کیونکر ہوگی پس جس چیز کے ادراک سے کسی قسم کی لذت حاصل ہو وہ چیز دل کو محبوب
ہوگی اور جس سے کچھ ایذا ہو وہ دل کو مبغوض ہوگی۔ پس محبوب کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت کو اُس کی جانب
رغبت ہو اور مبغوض کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت کو اُس سے نفرت ہو۔ پس اگر طبیعت کی رغبت بڑھ جائے

تو اُس کو عشق کہیں گے اور اگر نفرت بڑھ جائے تو اُس کو عداوت کہیں گے۔

جب کہ محبت جاننے اور پہچاننے پر موقوف ہے تو جتنی خواہش کی قسمیں ہوں گی اُتنی ہی محبت کی قسمیں ہوں گی۔ پس ہر ایک خواہش کو ایک ایک قسم کی چیزوں کی ادراک کی قوت ہے۔ اور ان میں سے بعض چیزوں کی ادراک سے ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور بسبب اُس لذت کے طبیعت کو اُس طرف رغبت ہوتی ہے۔ اور وہی چیز طبیعت سلیم کو محبوب ہو جاتی ہے۔ مثلاً آنکھ کو اچھی صورتوں اور پاکیزہ شکلوں کے دیکھنے سے ایک قسم کی لذت ملتی ہے۔ اور کانوں کو اچھی آوازوں اور موزوں راگوں کے سننے سے فرحت ہوتی ہے۔ اور قوت شامّہ کو اچھی خوشبوؤں کے سونگھنے سے ایک کیفیت ہوتی ہے۔ اور قوت ذائقہ کو اچھے کھانوں سے اور قوت لامسہ کو نرم اور نازک چیزوں کے چھونے سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ غرضکہ جب ان حواسوں کو ان چیزوں کے ادراک سے لذت ملتی ہے تو طبیعت کو لامحالہ اُن کی جانب میل و رغبت ہوتی ہے۔

ان حواس خمسۂ ظاہری کے علاوہ ایک چھٹواں حواس اور ہے جو دل کا مرکب ہے اور اُس کو وہی جان سکتا ہے جو دل رکھتا ہے۔ اور حواس خمسۂ ظاہری کی لذتوں میں تو جانور بھی انسان کے شریک ہیں۔ پس اگر محبت صرف انھیں چیزوں پر منحصر ہووے جن کو حواس خمسۂ ظاہری جان سکتے ہیں اور اسی دلیل سے یہ کہا جائے کہ چونکہ اللہ جلّ شانہٗ جو اُس کے ادراک سے باہر ہے اور خیال میں نہیں آسکتا تو پھر کیونکر اُس کی نسبت محبت کا اطلاق ہو سکے۔ تو انسان کی خاصیت ہی باطل ہو جائے۔ اور اُس میں اور جانوروں میں جو تمیز بہ نسبت چھٹویں حواس کے ہے جس کو عقل یا نور یا دل یا جو کچھ کہو باقی نہ ہے بڑا بدنصیب وہ شخص ہے جو محبوب حقیقی کی محبت کا منکر ہو۔ اور بڑا بدبخت وہ انسان ہے جو معشوق اصلی کے عشق سے بے خبر ہو۔ نادان وہی ہے جو اس کی معرفت نہ چاہے جاہل وہی ہے جو اُس سے دوستی نہ رکھے۔ ٹوٹیں وہ ہاتھ جو اُن کا دامن نہ پکڑ سکیں

پھوٹیں وہ آنکھیں جو اُس کا جمال نہ دیکھ سکیں ۔ بیت ۔

بشکنند دستے کہ خم در گردن یارے نشد کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد

جو لوگ اللہ جل شانہٗ کی محبت سے انکار کرتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ بصیرت باطنی قوت میں بصیرت ظاہری سے بہت بڑھ کر ہے ۔ اور دل کی نظر آنکھ سے بہت زیادہ تیز ہے ۔ اور جمال باطنی جس کو عقل دیکھتی ہے اور جمال ظاہری سے جس کو آنکھ دیکھتی ہے بہت بہتر ہے اسی لیے بلاشبہ دل کو اُن امور الٰہی کے جاننے سے جن کو یہ حواس ظاہری نہیں جان سکتے ۔ ایک عجیب لذت حاصل ہوتی ہے کہ اُن حواس کی لذتوں سے بہت بڑھ کر ہے اور اسی واسطے طبع سلیم اور عقل صحیح کو جو رغبت اُس کی طرف ہوتی ہے وہ بہت قوی ہوتی ہے اور محبت کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہیں کہ جس چیز کے جاننے سے لذت ہو اُس کی طرف رغبت کرنا ۔ کہ جس کی تفصیل اب آئے گی ۔ پس یہ سمجھ کر اللہ جل شانہٗ کی محبت سے وہی انکار کرے گا جو کہ بہائم کے درجے سے نہ نکلا ہو ۔ اور انھیں ظاہری حواسوں کے مدرکات پر لذتوں کو منحصر جانتا ہو ۔

انسان اپنی ذات کو چاہتا ہے ۔ اور غیر کو بھی اپنی ہی ذات کے لئے چاہتا ہے تاکہ وہ ہمیشہ بنا رہے ۔ اور کبھی فنا نہ ہو ۔ اسی واسطے موت اور قتل سے ڈرتا ہے اور اُس کو بُرا جانتا ہے ۔ اسی لئے انسان اول صحت اپنی چاہتا ہے پھر اپنے مال اور اولاد اور دوست آشناؤں کی بقا چاہتا ہے ۔ اس لئے کہ درحقیقت اُن کی بقا وہ اپنی ذات کی بقا سمجھتا ہے ۔ کہ نام اُن کا باقی رہے گا ۔ اور جس قدر مال اور دولت اور کنبہ قبیلہ اس کا زیادہ ہوگا اُس کو وہ اپنی شوکت اور عزت کی ترقی سمجھے گا ۔ پس ان سب کی محبت دراصل محبت اپنی ذات کی ہے ۔ دوسرے اُس شخص کو چاہتا ہے جس نے اُس کے ساتھ احسان کیا ہو ۔ اور اُس کو فائدہ پہنچایا ہو ۔ لیکن دراصل اُن سے محبت کرنا عین اپنے ساتھ محبت کرنا ہے ۔ مثلاً کسی کو طبیب سے جس نے اُس کا علاج کیا ہو

محبت ہو تو وہ محبّت اس سبب سے ہے کہ اُس نے اُس کو صحت دی۔ تو یہ محبت اپنی ہی ذات کی ہوئی۔ تیسرا سبب آدمی کسی کو دوست نہ رکھے بغیر خیال کسی فائدے کے جو اُس سے حاصل ہو۔ مثلاً محبت حسن وجمال کی کہ خود حسن وجمال باعث محبّت ہے۔ اور دل کو اُس کی طرف میل ہوتا ہے۔ گو کہ کسی قسم کا فائدہ اُس سے نہ ہو۔ مثلاً آدمی سبزہ زار وگلزار اور دریا اور نہر اور عمارات لطیفہ کو چاہتا ہے اور اُن کے دیکھنے سے اُس کا دل خوش ہوتا ہے۔ اور سوائے دل کی لذت کے اور کسی قسم کا فائدہ اُس سے حاصل نہیں ہوتا۔

جاننا چاہئے کہ جو خیالات اور محسوسات کی تنگی میں گرفتار ہے وہ جانتا ہے کہ حسن و جمال کے یہ معنی ہیں کہ اعضا مناسب ہوں شکل اچھی ہو۔ صورت پاکیزہ ہو۔ رنگ سرخ ہو۔ اور جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں اُس کو حسین وجمیل جانتا ہے۔ اور جو شکل و صورت سے خارج ہو اُس کو جمیل وحسین نہیں جانتا۔ حالانکہ یہ غلطی اُس کی سمجھ کی ہے بلکہ حسن وجمال کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز کا جو کمال ہے وہ اُس میں ہے۔ پس جو چیز کمال میں کامل ہو گی وہی جمال میں کامل کہلائے گی۔ مثلاً انسان اچھا وہی ہے جس کے اعضا مناسب ہوں۔ اور جس کا رنگ سُرخ ہو۔ جس کا قد و قامت معتدل ہو۔ اور گھوڑا اچھا وہی ہو گا جس میں گھوڑے کے صفات اچھے جمع ہوں۔ خط اچھا وہی کہلائے گا جو باقاعدہ اور درست ہو۔ پس گھوڑے میں اگر انسان کے صفات اور انسان میں گھوڑے کے صفات ہوں تو وہ ہرگز اچھا نہ کہلائے گا۔ بلکہ بُرا ٹھہرے گا۔ غرضکہ ہر ایک چیز کا حسن وجمال علٰحدہ علیحدہ ہے اور وہ شکل وصورت پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اُن چیزوں پر بھی۔ اطلاق حسن کا ہوتا ہے جو حواس خمسہ کے ادراک سے خارج ہیں۔ مثلاً اخلاق نیک۔ وہ جس انسان میں ہوں گے وہ صاحب خلق حسن کہلائے گا۔ اسی واسطے جس طرح پر کہ حسن صورت کا صورت کے کمال پر اطلاق ہوتا ہے۔ حسن سیرت کا سیرت کے کمال پر اطلاق ہوتا ہے۔ بلکہ

حسن صورت باعث اُس قدر محبت کا نہیں ہے جس قدر حسن سیرت باعث محبت ہے ۔ ورنہ کیوں انسان انبیاء اور اولیا اور ائمہ اور صحابہ اور مجتہدین اور اساتذہ اور فقرا کو دوست رکھیں ۔ حالانکہ اُن کی دوستی کہ وہ حسن سیرت کے باعث ہے عشق وصورت پر غالب ہوتی ہے اور تمام مال ومتاع بلکہ اپنی جانوں کو انسان اُن پر قربان کردیتا ہے اور اُن کے نام پر اپنی جان فدا کرتا ہے ۔ تو یہ محبت کچھ اُن کی شکل وجمال ظاہری کے سبب سے نہیں ہے بلکہ سیرت وکمال باطنی کے سبب سے ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ جمال باطنی بھی باعث محبت ہے بلکہ وہ محبت جمال ظاہری کی محبت پر غالب ہے ۔

کبھی محب اور محبوب میں باہم محبت کا ایک اور ہی سبب ہوتا ہے کہ جس کے سبب سے دونوں میں محبت ہو جاتی ہے کہ وہ باعث نہ جمال ہے نہ کسی قسم کا فائدہ بلکہ فقط تناسب ارواح کہ خواہ مخواہ بلا کسی اور سبب کے باہم محبت ہو جاتی ہے ۔

الحاصل اس تمہید سے ثابت ہوا کہ محبت کے پانچ سبب ہیں اور دعوٰی کرتے ہیں کہ ان پانچوں سبب سے مستحق محبت فقط ایک ذات پاک وحدہٗ لاشریک لہ کی ہے اور کوئی دوسرا مستحق محبت فی حد ذاتہ نہیں ہے یہاں تک کہ انبیا اور اولیا کہ اُن کی محبت بھی بذاتہ نہیں ہے بلکہ اُن کی محبت عین محبت اللہ جل شانہٗ کی ہے ۔ اس لئے کہ محبوب کا محبوب محبوب ہے ۔ محبوب کا رسول اور پیغامبر محبوب ہے ۔ محبوب کا محب محبوب ہے تو ان سب کی محبت عین محبت الٰہی ہے شعر

عشق لا با تو نسبتے است درست ٭ بر در ہر کہ رفت بر در تست

اب ہم اُن پانچوں سببوں کو بہ تفصیل بیان کرتے ہیں ۔

پہلا سبب کہ آدمی اپنی ہی ذات سے محبت رکھتا ہے اور اپنی بقا چاہتا ہے

ہم کہتے ہیں کہ یہی بڑا سبب اللہ جل شانہٗ سے محبت رکھنے کا ہے ۔ اس لئے کہ جو شخص اپنی ذات کو پہچانے گا اور اپنے پروردگار کو جانے گا اور سمجھے گا کہ میری ہستی میری ذات سے نہیں ہے

بلکہ اُس کا ثابت کرنے والا اور اُس کا بنانے والا اور اُس کا سنوارنے والا اور اُس کو عدم سے وجود میں لانے والا اور یہی کوئی ہے کہ جس نے اُس کو پیدا کیا جس نے اُس کو زندگی دی۔ جس نے اُس کو کمال پر پہنچایا۔ جس نے اُس کو وہ اسباب فراہم کر دئے کہ جس سے اُس کی زندگی ہے ورنہ انسان کیا ہے۔ عدم محض ہے۔ اگر فضل الٰہی شامل حال اُس کے نہ ہوتا تو یہ وہ نیستی سے اُس کا جمال کس طرح نظر آتا۔ اور اُس مراتب کمالی وجلالی کا یہ مرتبہ کیونکر حاصل ہوتا۔ پس وجود وہستی اُس کی صرف اسی حی وقیوم کے سبب سے ہے۔ جو کہ قائم بذاتہ ہے۔ اور دیگر اشیاء کا قیام اُس کی ذات سے ہے۔ پس جب کوئی شخص اپنی ہستی اور وجود کو دوست رکھے گا تو کیونکر اُس کو دوست نہ رکھے گا۔ جس کے سبب سے اُس کی ہستی ہے اور جب اُس کو یقین اس پر ہوگا کہ ذات واجب الوجود وہ ہے جس نے ہم کو پیدا کیا اور ہم کو بنایا اور ہم کو زندہ کیا اور ہر حال اور ہر وقت میں وہی باعث ہمارے قیام اور زندگی اور ہستی کا ہے تو ضرور اُس سے محبت کرے گا۔ اور اگر یہ جان کر پھر بھی اُس سے محبت نہ کرے تو جاننا چاہئے کہ وہ نہ اپنے آپ کو پہچانتا ہے نہ اپنے پروردگار کو جانتا ہے اور جب اُس کو پہچان ہی نہیں ہے تو محبت کیونکر ہوگی۔ اس لئے کہ محبت ثمرۂ معرفت ہے۔ افسوس اُس آدمی کی بدنصیبی پر جو اپنی ذات کو نہ پہچانے اور سوائے اپنی صورت ظاہری کے اپنے جمال باطنی کی حقیقت کو نہ جانے۔

دوسرا سبب کہ آدمی اُس کو چاہتا ہے جس نے اُس کے ساتھ احسان کیا ہو اور اُس کو فائدہ پہونچایا ہو

جاننا چاہئے کہ جو شخص کسی کے ساتھ احسان وسلوک کرے یعنی اُس کو مال ودولت عطا کرے اور اُس کی حاجت برلائے اور اُس کی اعانت کرے اور اُس سے بشیریں کلامی

پیش آئے اور اُس کا معین و مددگار رہے۔ اُس کو شر اعدا سے بچاتا رہے اور اُس کے مقاصد و مطالب بر لانے میں اسباب فراہم کر دیا کرے اور اُس کی خواہش پوری کر دیا کرے اُس کے عزیز و اقارب کو خوش و خرم رکھے تو ایسا شخص ضرور محبوب ہو جائے گا اور آدمی ایسے محسن کو دل سے چاہنے لگے گا۔ پس ہم کہتے ہیں کہ یہ وہ سبب ہے کہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سوائے اللہ جل شانہٗ کے اور کوئی مستحق محبت کا نہیں ہے۔ اس لئے اگر آدمی جانے اور سوچے تو وہ سمجھے گا کہ محسن حقیقی سوائے اُس کے کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اور اُس کے احسانات کا کچھ ٹھکانا نہیں ہے۔ کوئی محاسب اُس کو شمار نہیں کر سکتا جیسا کہ خود فرماتا ہے۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرو تو شمار نہ کر سکو گے اور جو ظاہر میں احسان کرتے ہیں وہ محسن مجازی ہیں۔ در حقیقت وہ احسان بھی اُسی کی جانب سے ہے۔ مثلاً کوئی شخص تجھے خزانہ عطا کرے تو وہ محسن حقیقی نہیں ہے بلکہ محسن مجازی ہے۔ حقیقی محسن اللہ جل شانہٗ ہے اس لئے کہ اُس نے خزانہ جمع کر دیا اور دینے والے کو توفیق دی کہ تجھے عطا کرے تو جس نے مال اور ارادہ اور توفیق کو پیدا کیا وہی سچا محسن ہے اگر اللہ جل شانہٗ مال کو نہ پیدا کرتا تو خزانہ کہاں سے جمع ہوتا اور اگر دینے والے کا دل تیری طرف راغب نہ کرتا تو وہ کیونکر تجھے دیتا۔ اس لئے کہ سب مطیع و فرمانبردار اُسی کے ہیں۔ تو یہ سب احسان دراصل اُسی کے ہوئے اور دینے والا صرف ایک واسطہ ہوا یعنی جو شخص نظر غور سے احسانات کی طرف دیکھے گا وہ سوائے اللہ جل شانہٗ کے کسی کو محسن نہ پائے گا اور کوئی احسان کرے وہ سمجھے گا کہ میرے خدا نے یہ احسان کیا۔

پس اگر احسان کرنے والے سے محبت رکھنا امر طبعی ہے تو کوئی شخص سوائے اللہ جل شانہٗ کے مستحق محبت نہیں ہے اور باوجود اس کے اللہ جل شانہٗ سے محبت نہ رکھنا دلیل جہالت ہے کہ اُس کو محسن نہیں جانتے اور احسان کو محسن مجازی پر ختم کرتے ہیں حالانکہ یہ کیسی غلطی ہے۔ اس غلطی کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے کہ اگر کوئی سائل کسی بادشاہ

سے کچھ سوال کرے اور وہ اُس کو اپنے خزانہ سے کچھ عطا کرے تو اول وہ اپنے وزیر کو حکم دے گا۔ وزیر اپنے نائب خزانچی کو اجازت دے گا۔ خزانچی اپنے ملازموں کو اجازت دے گا۔ یہاں تک کہ درجہ بدرجہ اُس سائل کو ایک سپاہی لاکر روپیہ حوالہ کرے گا۔ اب اگر وہ سائل سپاہی سے کہے کہ تو میرا محسن ہے۔ تو نے مجھے روپیہ دیا۔ وہ کہے گا کہ جاہل کیوں ہوا ہے۔ میں ملازم خزانچی کا تھا اُس کا مطیع ہوں۔ اُس نے کہا میں نے تجھے دیا ہے۔ وہ سمجھے گا کہ خزانچی میرا محسن ہے۔ خزانچی انکار کرے گا کہ مجھے نائب نے اجازت دی۔ میں نے دیا۔ میں اس خزانے کا محافظ ہوں نہ مالک۔ تب اُس کی نظر نائب پر ہوگی۔ اور اُس کو محسن جانے گا۔ وہ انکار کرے گا۔ اور کہے گا کہ میں وزیر کا نوکر ہوں نہ خزانے کا مالک۔ تب وہ سائل سمجھے گا کہ وزیر محسن ہے۔ وزیر جو کہ خاص مقرب بارگاہ سلطانی ہے خوف کرے گا کہ ایسا نہ ہو کہ بادشاہ تک یہ خبر پہنچے اور مجھے وہ اپنا شریک جانے تو وہ کہے گا کہ جہالت نہ کر۔ ادب کو ہاتھ سے نہ دے۔ مالک اس خزانے کا بادشاہ ہے نہ میں۔ یہ احسان اُس کا ہے تو اُسی کو محسن سمجھ۔ تب اُس سائل کی سمجھ میں آئے گا کہ یہ سب واسطے تھے۔ اصلی محسن بادشاہ ہے اور یہ سب نوکر چاکر اُس کے ہیں۔ تب وہ دل سے بادشاہ کی تعریف کرے گا۔ اور اُس کو منعم اور محسن جانے گا۔

تیسرا سبب کہ آدمی کسی کو دوست رکھے بہ سبب اُس کی ذات کے نہ بہ نظر کسی فائدے کے

طبیعت مجبور اس پر ہے کہ جس کسی کو نیک اور اچھا جانے تو خواہ مخواہ اُس کی محبت دل میں ہو جاتی ہے۔ گو اُس سے خاص اُس آدمی کو فائدہ نہ پہنچے۔ مثلاً کسی

آدمی کو معلوم ہو کہ فلاں بادشاہ بڑا عادل اور غریب پرور اور رعیت نواز پرہیزگار، عابد، شب زندہ دار سخی۔ کریم حلیم، متواضع ہے۔ گو وہ ایسی دور جگہ پر ہو کہ جہاں سننے والا کبھی پہونچ نہ سکے۔ تب بھی اُس کی محبت دل میں ہو جائے گی۔ پس ہم کہتے ہیں کہ یہ سبب بھی وہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سوائے اللہ جل شانہ کے کوئی مستحق محبت نہیں ہے۔ اس لئے کہ صرف اللہ جل شانہ کی ذات پاک ایسی ہے جو تمام عالم پر احسان کرنے والی ہے۔ تمام مخلوقات اُس نے اپنے فضل عمیم سے پیدا کیا اور اُن کو جمیع ما یحتاج لہٗ عنایت کیا۔ کس طرح پر اُن کی شکل و صورت بنائی اور کس طرح پر اُن کو ضروریات سے فارغ البال کیا۔ اور پھر نعمتیں گوناگوں دے کر اُن کو مرفہ الحال کیا۔ اور اُن کی زیب و زینت اور عیش و آرام کی چیزیں دے کر اُن کو صاحب شان و شوکت بنایا۔ پس اُس سے بڑھ کر دینے والا اور حاجتیں پوری کرنے والا اور سخاوت کرنے والا کون ہوگا۔ کہ بے غرض سب کو دیتا ہے۔ اور فرش سے عرش تک جس کو دیکھئے وہ سب نمونہ اُسی کے احسان کا ہے۔ تو جو شخص ایسا محسن ہو کہ تمام عالم اُس کے احسان کے ایک ذرّے کے برابر نہ ہو اور جو حسن کا اور محسن کا اور احسان کا اور احسان کے اسباب کا خالق ہو تو پھر اُس سے محبت نہ رکھنا دلیل جہالت ہے کہ اُس کو محسن نہیں جانتا۔ کیسا محسن جس کے احسان کی انتہا نہیں۔ کیسا سخی جس کی سخاوت کی حد نہیں۔ جس قدر آسمان و زمین اور چاند و سورج ستارے آب و خاک آتش و باد ہیں۔ سب اُسی کے جود و سخا کے نمونے ہیں۔

چوتھا سبب حسن و جمال کے سبب سے محبّت ہونا

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ہر ایک شخص کی طبیعت حسن و جمال کی محبّت پر مجبول ہے اور جمال کی دو قسمیں ہیں۔ جمال ظاہری اور جمال باطنی۔ جمال ظاہری آنکھ سے دکھلائی دیتا ہے

باطنی جمال دل سے نظر آتا ہے۔ جمال ظاہری کو بہائم اور اطفال بھی دیکھتے ہیں۔ جمال باطنی کو سوائے اہل دل کے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اور جس آنکھ سے جو جمال نظر آتا ہے وہ اس آنکھ کو مرغوب ہے۔ اور جمال ظاہری آنکھ سے نظر آتا ہے۔ اس لئے اس کو مرغوب ہے اور جمال باطنی دل کی آنکھ سے دکھلائی دیتا ہے۔ اس لئے دل کو محبوب ہے۔ مثلاً انبیاً اور علما ء اور اولیا سے جو محبت ہوتی ہے وہ اُن کی صورت اور شکل کے باعث نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن کے جمال باطنی کے سبب سے ہوتی ہے۔ جس کو کمال کہتے ہیں۔ اور وہ منحصر ہے تین چیزوں پر۔ اول علم۔ دوسرے قدرت۔ تیسرے تنزہ و تقدس۔ پس دیکھنا چاہئے کہ یہ تینوں صفات بدرجۂ کمال صرف اللہ جل شانہٗ کی ذات میں جمع ہیں۔ نہ اور کسی میں۔ اسی واسطے صرف وہی لائق محبت کے ہے نہ دوسرا۔

۱۔ اول علم۔ سب جانتے ہیں کہ کسی کا علم اللہ جل شانہٗ کے علم تک نہیں پہونچ سکتا۔ اگر تمام اولین و آخرین کے علوم جمع کئے جائیں تو اُس کے علم کے ذرّے کے برابر نہیں ہیں۔ کوئی چیز آسمان و زمین میں نہیں ہے کہ اُس سے پوشیدہ ہو۔ تمام مخلوقات سے مخاطب ہوکر فرماتا ہے ما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ یعنی تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا۔ بلکہ اگر تمام اہل آسمان و زمین جمع ہوں اور ایک چیونٹی یا مچھر کی خلقت کی حکمت دریافت کرنا چاہیں تو عشر عشیر پر اُس کی حکمت کے مطلع نہ ہو سکیں۔ پس اگر صفت علم کے باعث محبت ہو تو چاہئے کہ سوائے اللہ جل شانہٗ کے اور کسی سے محبت نہ کی جائے اس لئے کہ سب کا علم بہ نسبت اُس کے علم کے جہل ہے۔

۲۔ دوسری صفت قدرت۔ قدرت بھی ایک کمال ہے اور ہر ایک کمال و عزت و جلال باعث محبت ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان کسی دوسرے کے کمال کا حال سنتا ہے تو اُس کو ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے اور اُس صاحب کمال سے محبت ہوتی ہے۔ مثلاً جب ذکر شجاعت حضرت علی علیہ السلام کا ہوتا ہے تو دل کو ایک

فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ پس جبکہ اللہ جل شانہٗ کی قدرت اور
غلبہ اور جلال اور عزت اور کمال پر غور کیا جائے کہ جس کے قبضۂ قدرت میں تمام آسمان
اور زمین اور افلاک اور کواکب اور پہاڑ اور دریا اور ہوا اور معدنیات اور نباتات اور
حیوانات اور انسان ہیں اور کسی کو ان میں سے کچھ قدرت اپنے اوپر نہیں ہے کہ کچھ کر سکیں
بلکہ سب قبضۂ قدرت میں اللہ جلّ شانہٗ کے ہیں۔ کہ اُس نے ان سب کو بنایا اور اُن
کے اسباب پیدا کئے اور اُن کو اُسی نے قدرت اور طاقت دی۔ یہاں تک کہ اگر چاہے
ایک پشہ سے بڑے بادشاہ کو ہلاک کر دے اور وہی اس قسم کی قدرت رکھتا ہے
کہ جس کے ہاتھ میں سب کی باگ ہے اور جس سے جو چاہتا ہے وہ کام لیتا ہے۔ اگر سب
کو تباہ کر دے اُس کی مملکت اور سلطنت میں ایک ذرہ کمی نہ ہو اور اگر مثل اُن کے اور
ہزارہا لکھوکھا خلقت پیدا کر دے ذرا بھی نہ تھکے۔ پس اگر صفت کمال باعث محبت ہے
واللہ جل شانہٗ سے جس کی صفت کمال اس درجہ پر ہو بڑھ کر اور کون قابل محبت ہے۔

۳ تیسری صفت تقدس۔ عیبوں اور نقصانوں سے مبرا ہونا اور بُرائیوں اور
خرابیوں سے منزہ ہونا۔ ایسی صفت ہے جو باعث محبت ہے۔ یہی صفت ہے کہ جس کے
سبب سے انبیاء اور اولیاء سے محبت ہوتی ہے۔ مگر درحقیقت اُن میں بھی باوجود
منزہ ہونے اُن کے عیبوں اور برائیوں سے یہ صفت بدرجۂ کمال حاصل نہیں ہے
کمال تنزہ و تقدس سوائے اس کے اور کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ جس کی صفت ہے
اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ ذِی الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام۔ کوئی مخلوق نقص سے خالی نہیں۔ اس
لئے کہ وہ عاجز اور مخلوق ہے۔ پس اُن کا مخلوق ہونا اور دوسرے کا اُن پر مختار ہونا
ہی اُن کی صفت تقدس کا عیب ہے۔ کمال تقدس صرف ایک ذات اللہ جل شانہٗ
کو حاصل ہے۔ پس یہ صفت باعث محبت ہے تو سوائے اللہ جلّ شانہ کے اور
کوئی لائق محبت نہیں ہے۔ وہی صاحب کمال ایسا ہے جو اپنی شان میں یکتا ہے

کوئی اُس کا شریک نہیں ۔کوئی اُس کے برابر نہیں ۔ایسا غنی جس کو کسی سے حاجت نہیں ۔ایسا قدرت والا کہ جو چاہے وہی کرے کوئی اُس کا پوچھنے والا نہیں ۔اُس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔اُس کے فرمان کو کوئی روک نہیں سکتا۔علم کا وہ حال کہ آسمان و زمین میں ایک ذرہ اُس سے چھپا نہیں ۔قدرت کا وہ کمال کہ جس کے اختیار سے کوئی باہر نہیں ۔ایسا ازلی کہ جس کے وجود کی کوئی ابتدا نہیں ۔ایسا ابدی کہ جس کی بقا کی کچھ انتہا نہیں ۔عدم کو اُس کے بارگاہ تک راہ نہیں ۔سوائے اُس کی ذات کے کسی دوسری چیز کو قیام نہیں ۔ وہی ہے جس کو اپنی عزّت و جلال پر ناز ہے ۔وہی ہے جس کو اپنی شان و کمال پر افتخار ہے ۔اُس کے جلال کی معرفت میں عقول متحیر ہیں ۔اُس کی صفت کمال میں عارفین ششدر ہیں ۔کمال معرفت اولیا یہ ہے کہ اُس کے کمال کو نہیں جانتے ۔انتہائے نبوت انبیا یہ ہے کہ اُس کی ذات کو نہیں پہچانتے ۔جیسا کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں وہ تیری تعریف نہیں کر سکتا جو کہ تو نے اپنی ذات کی خود کی ہے ۔پس جو شخص اللہ جل شانہ کی محبت کا منکر ہے کیا وہ ان صفات کو اوصاف جمال اور صفاتِ کمال سے نہیں جانتا ۔یا اللہ جلّ شانہ کو ان صفات سے موصوف نہیں سمجھتا ۔یا ان صفات کو بالطبع باعث محبت نہیں جانتا ۔پس پاک ہے وہ جس نے اندھوں کی آنکھوں سے اپنے جمال کو پردے میں چھپا لیا کہ وہ نہ دیکھ سکیں ۔اور اپنے جلال کو اُن سے پوشیدہ کر لیا کہ اُس سے آگاہ نہ ہو سکیں اپنا جمال اُن کو دکھلاتا ہے نہ اپنے کمال کو اُن پر مطلع کرتا ہے ۔ہاں یہ دولت انھیں خوش نصیبوں کے حصے میں رکھی ہے جن کی قسمت میں یہ سعادت روز ازل سے لکھ دی ہے اور جن کو حجاب کی آنکھ سے بچا دیا ہے اور اُن بد بختوں کو اس سے محروم کر رکھا ہے جو کہ

اندھوں کی طرح اندھیارے میں ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ جن نیک بختوں کو اللہ جل شانہٗ یہ دولت عطا کر دیتا ہے وہ ان بدبختوں کے حال پر افسوس کرتے ہیں جو کہ اُس سے بے نصیب ہیں۔ اور جن کو یہ دولت حاصل نہیں ہوئی وہ ان صاحبوں پر ہنستے ہیں۔ جو کہ اُس کے پیچھے دولت دنیا کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ خود مفلس ہیں اور اُن کو مفلس جانتے ہیں۔ خود حقیر ہیں اور اُن کو حقیر سمجھتے ہیں۔ خود پریشاں حال دنیا کی طلب میں پھرتے ہیں اور اُن کو پریشان حال سمجھتے ہیں۔ اے کاش اگر ان پر اُن کی حقیقت ذرا بھی کھل جائے۔ اور اُن کے حالات پر ذرا بھی اطلاع ہو جائے تو دیوانہ وار اُن کا دامن پکڑیں اور مجنوں کی طرح گھربار چھوڑ کر اُن کے پیچھے ہو جائیں۔

۵۔ پانچواں سبب محبت کا مشابہت اور مشاکلت ہے۔

جاننا چاہئے کہ مناسبت اور مشابہت کو باہم میل ہونے میں بڑا دخل ہے۔ لڑکا لڑکے سے بڈھا بڈھے سے جانور اپنی نوع کے جانور سے اسی سبب سے الفت کرتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز کبوتر با کبوتر باز با باز

اور یہ مناسبت کبھی ظاہری سبب سے ہوتی ہے جس طرح لڑکا لڑکے سے الفت کرتا ہے۔ لڑکائی اور ہم عمری باعث الفت ہے۔ اور کبھی غیر ظاہری سبب سے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں باہم خود بخود محبت ہو جاتی ہے۔ بلا ملاحظہ خیال کے اور بغیر مطالبہ مال کے۔ پس یہ سبب بھی باعث محبت اللہ جل شانہٗ ہے۔ اور یہ مناسبت ظاہری شکل و صورت کے سبب سے نہیں ہے۔ بلکہ صفات باطنی کے سبب سے ہے۔ جن میں سے بعض کا ذکر ہم کرتے ہیں۔ اور بعض کو جو اسرار میں سے ہیں لکھ نہیں سکتے۔ پس وہ اسباب مناسبت جو قابل ذکر ہیں یہ ہیں کہ بندے کو اپنے پروردگار سے قربت نزدیکی حاصل ہوتی ہے اُن صفات میں جن کے نسبت ارشاد ہے کہ عادتیں اللہ کی سیکھو۔ اور وہ خصلتیں

کیا ہیں۔ علم اور نیکی اور احسان اور مہربانی اور خیر اور رحمت اور نصیحت وغیرہ اخلاق نیک جن کا ذکر شریعت میں آیا ہے۔ اور وہ مناسبت خاص کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا وہ ہے کہ سوائے انسان کے دوسرے میں نہیں ہے۔ اگر یہ مناسبت نہ ہوتی تو آدم مسجود ملائک کیوں ہوتے ۔ اور اللہ جل شانہٗ کے ایسے خاص بندے ہوتے ہیں۔ جن کو اس درجہ مناسبت اُس سے ہوتی ہے لیکن مناسبت نہیں ہو سکتی جب تک کہ بندہ بعد احکام فرائض کے نوافل پر مواظبت نہ کرے اور اُس سے تقرب نہ چاہے اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ بندہ نوافل سے یہاں تک مجھ سے نزدیک ہو جاتا ہے کہ آخر کار میں اُس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اُس کو چاہتا ہوں تو میں ہی اُس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں ہی اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اُس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔ یہ وہی مقام ہے جس میں زیادہ بولنا نہیں چاہئے۔ اور جس سے بہت لوگ گمراہ ہو گئے ہیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

یہ صفات جو اوپر ہم نے بیان کئے ہیں وہ ہیں جو باعث محبت ہیں اور جب کہ یہ بدرجہ کمال اللہ جل شانہٗ کو حاصل ہیں تو کوئی بدرجہ کمال مستحق محبت سوائے اُس کے نہیں ہے فقط۔ (نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی صاحب۔ از المحبت والشوق)

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی

آزاد مولوی محمد باقر دہلوی کے بیٹے تھے جو شیعوں کے مجتہد اور شرفائے دہلی میں ایک نامور شخص تھے اور پنجاب میں اردو اخبار نویسی کے موجد تھے ۱۸۳۶ء میں اردو زبان کا پہلا اخبار مولوی محمد باقر ہی نے دلی میں نکالا تھا۔ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق سے اور آزاد کے والد سے دلی دوستی تھی۔ آزاد نے ابتدائی تعلیم ذوق کے سایۂ عاطفت میں حاصل کی۔ نکات عروض وفن سخن انہی کے فیض سے اُن کو حاصل ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کالج میں

داخل ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم اسی کالج کے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ میں پائی۔ کالج کے امتحانوں میں جواب مضمون میں آپ سب طلباء سے اول رہتے تھے۔ اردو نظم ونثر لکھنے کی استعداد اُن کو کالج ہی میں حاصل ہو گئی تھی۔ نظم میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد رشید تھے۔ جب غدر کے بعد مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کے قتل کے الزام میں مولوی باقر مارے گئے تو آزاد وطن چھوڑ کر مع اہل وعیال لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کے مشاہیر سے ملے۔ پھر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ ایک عرصے تک ممالک دکن میں آوارہ گردی کے بعد سنہ ۱۸۶۴ء میں تقدیر راہ پر آئی۔ لاہور آکر سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ مولوی رجب علی صاحب سابق میر منشی نے پنڈت من پھول صاحب میر منشی حال سے سفارش کرکے میجر فلر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں ۱۵ روپیہ مشاہرے کی جگہ دلوائی۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے سرکاری اخبار کا (عہ) ماہوار پر اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر کیا۔ اس کے اڈیٹر رائے پیارے لال آشوب تھے۔ جو آزاد کے بڑے خیر اندیش اور قدرداں تھے۔ سنہ ۱۸۶۵-۶۶ء میں پنڈت من پھول صاحب کے ساتھ کابل اور بدخشاں گئے۔ وہاں سے لوٹ کر لاہور کے سرکاری کالج میں ماصہ ماہوار پر عربی پروفیسر مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں آپ نے ایران کا سفر کیا۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں ملکۂ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی پر آپ کو سرکار انگریزی کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔

آزاد خاندان مغل سے تھے۔ اور ان کی ماں ایرانی تھیں۔ اس لئے ان کے گھر میں فارسی بولی جاتی تھی۔ آپ فارسی عربی کے عالم متبحر تھے۔ اور اُن تمام علوم پر عبور رکھتے تھے جو ان زبانوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ بھاشا اور ہندی کے نکات اور انگریزی علم ادب کی خصوصیات سے واقف تھے۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں آپ کو جنون کے آثار پیدا ہوئے۔ کچھ دنوں اسی جنون کی حالت میں زندہ رہے۔ ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم سنہ ۱۳۲۸ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ لاہور میں دفن ہوئے۔

نثر میں آزاد کی کتابیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو انھوں نے پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کے لئے لکھیں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ اردو کا قاعدہ۔ اردو کی پہلی۔ دوسری۔ تیسری۔ چوتھی۔ قصص ہند۔ قواعد اردو۔ فارسی کی پہلی۔ دوسری۔ جامع القواعد۔ ان میں قصص ہند اور جامع القواعد لاجواب کتابیں ہیں۔ دوسری وہ جو انھوں نے اپنے شوق سے لکھیں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ آب حیات۔ نیرنگ خیال۔ دربار اکبری۔ سخندان فارس۔ قند فارسی۔ نصیحت کا کرن پھول۔ سیر ایران۔ نگارستان فارس۔ نیرنگ خیال میں انگریزی روش کا پرتو ہے جس میں مضمون نویسی کے

جدید طرز کا چربہ اتارا ہے۔ یہ کتاب رنگین بیانی کا ایک دل فریب مرقع ہے۔ اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا بہترین دستور العمل ہے۔ پند و نصائح کا ایک دفتر ہے۔ استعارے اور تمثیل میں وہ وہ مطالب بتائے گئے ہیں کہ پڑھنے والا شستہ خیال سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کتاب نے اردو نثر کی نئی طرز قائم کی اور تمام اگلی نثر کتابوں کے رنگ کو پھیکا کر دیا۔ آب حیات کا طرز بیان۔ سلاستِ زبان۔ شستگی الفاظ۔ برجستگی۔ بے ساختگی۔ روشن خیالی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور اپنے طرز کی ایک نئی کتاب ہے۔ اس سے پہلے اس طرز کی کوئی کتاب اردو میں نہ تھی۔

آزاد کی طرز تحریر ثنا و صفت سے مستغنی ہے۔ بیان کی فصاحت۔ زبان کی سلاست۔ بندش کی چستی۔ محاورے کی دل آویزی۔ خیالات کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شوکت۔ اسلوب کی دل فریبی۔ جس قدر آزاد کے یہاں ہیں۔ دوسرے نثاروں کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ اور ظرافت کی چاشنی مزید براں۔ مناظر قدرت کی تصویر کھینچنے اور جذبات و محسوساتِ انسانی کا چربہ اُتارنے میں آپ کو وہ ید طولیٰ تھا کہ شاید اب تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

اردو زبان کی نظم کی ترقی کے لئے جس شخص نے کہنہ طرز سخن کو بدل کر فن شاعری کو سہل کیا اور ایشیائی تعشقانہ خیالات کو قدرتی مضامین کی طرف سب سے پہلے ڈھالا وہ حضرت آزاد کی آزادانہ طبیعت کا ظہور ہے۔ آزاد نے زمانے کے رنگ کو دیکھ کر اردو شاعری کے لئے نئے طریق یا نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ کئی حکیمانہ مضامین اور نظمیں خود کہیں۔ اُس کے بعد ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جس کا تذکرہ خود حالی اپنی کتاب مجموعۂ نظم کے دیباچے کے شروع میں فرماتے ہیں۔ ۱۸۷۴ء میں جب راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق تھا اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا۔ جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ درنسبتِ عشق اور مبالغے کی جاگیر ہو گئی ہے۔ اُس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے) اس مشاعرے میں طرح کے مصرعے تجویز نہ ہوتے تھے۔ بلکہ صرف مطالب تجویز ہوتے تھے۔ جیسے برسات۔ حبّ وطن۔ تعصب و انصاف وغیرہ۔ اس نئی شاعری کے لئے آزاد نے ملک کو پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ آزاد نے اس طرز کے رواج دینے کو پہلے بطور نمونہ چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں جو مجموعۂ نظم آزاد میں چھپ چکی ہیں۔ مثلاً موسم زمستان شب قدر۔ صبح امید۔ حب وطن وغیرہ۔ یہ طرز ایسی مقبول خلائق ہوئی کہ وہ بڑے نامی ایشیائی شاعر جن کے دلوں پر پرانی روش اپنا سکہ جما چکی تھی یک قلم بھول گئے۔ اور سب نے یہی جدید طرز اختیار کرلی۔ مولانا حالی کی جدید شاعری کا رہنما حضرت آزاد ہی کا روشن خیال تھا۔

آزاد انجمن کے اکثر جلسوں میں اردو علم ادب اور نظم کے اکثر سبقوں پر مبصرانہ اور نقادانہ لکچر دیا کرتے تھے۔ جن میں سے بعض بعض مطالب کا انتخاب میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں جو خالی از لطف نہ ہوگا۔

۱۔ شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھلائے۔ نیچر کو گویا کر دے۔ درختان یا ورگل کو رواں کر دے۔ ماضی کو حال حال کو استقبال کر دے۔ دور کو نزدیک نزدیک کو دور کر دے۔ زمین کو آسمان۔ خاک کو طلا۔ اندھیرے کو اجالا کر دے۔ روشن دلان اہل درد کے نزدیک طلوع و غروب آفتاب وانقلاب صبح وشام ہزاروں باغ نوبہار قدرت الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے۔ اور تیرہ دلانِ بے خبر کے نزدیک کارگاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ رات دن چکر میں چلا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فن شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں۔ اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ اسی طرح شاعروں کی بدزبانی اور بدخیالی سے شعر بھی تہمت کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہئے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوشِ خروشِ خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور اسے قوت قدسیۂ الٰہی سے ایک سلسلۂ خاص ہے۔ خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں۔ مرتبۂ شاعری کو پہونچتے جاتے ہیں۔ ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علماء متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی۔ اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین وآسمان کا ہے۔

۲۔ بیشک مبالغے کا زور تشبیہ واستعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک ہمیں چاہئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارے اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے فصاحت اور

بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی تصانیف کے گلدستے ہار۔ طرے ہاتھ میں لئے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منھ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھائے۔

۳۔ اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش۔ اور لطائف و صنائع کے سامان تمھارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمھاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں محبوس ہو گئی ہے۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں۔ جن میں کچھ وصل کا لطف۔ بہت سے حسرت و ارمان۔ اُس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار۔ خزاں۔ فلک کی شکایت۔ اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے دور دور کے استعاروں میں ادا ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے یعنی اگر کوئی واقعی سرگذشت یا کچھ مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اُس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں۔

۴۔ اے میرے اہل وطن۔ ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہ سبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہوں گے۔ کئی پرانی مورتیں باقی ہیں جو چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہو جائے گی اور اردو میں نظم کا چراغ گُل ہو جائے گا۔

نظم اردو کی تاریخ

فلاسفۂ یونان کہتے ہیں۔ شعر خیالی باتیں ہیں۔ جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں۔ قدرت موجودات یا اُس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔ جب صبح کا نور وظہور دیکھتا ہے تو کبھی کہتا ہے۔ دیگ مشرق سے دودھ اُبلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے دریائے سیماب موج مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اڑاتا آتا ہے۔ صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے۔ یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اس میں نہیں پیدا ہوئے۔ وہ کہتا ہے۔ سنہری گیند ہوا میں اچھالی ہے۔ صبح طلائی تھال سر پر دھرے آتی ہے۔ کبھی مرغان سحر کا غل۔ اور عالم نور کا جلوہ۔ آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کر کے۔ صبح کی دھوم دھام دکھاتا ہے۔ اور کہتا ہے بادشاہ مشرق سبز خنگ فلک پر سوار۔ تاج مرصع سر پر رکھے۔ کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا۔ شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ مغرب کے چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا۔ اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا۔ کبھی کہتا ہے جام فلک خون سے چھلک رہا ہے۔ نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی۔ تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لاجوردی چادر میں تارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔

غرض ایسی ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں۔ مگر اصلیت سے انھیں کچھ بھی غرض نہیں ہے۔ باوجود اس کے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صانع الٰہی سے ہے۔ اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ اول ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھتے ہیں اور نثر میں پڑھتے ہیں۔ پھر اُسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے

ہیں تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔
۱۔ وہ وصف خاص ہے کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں۔
۲۔ کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے اور مضمون میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے۔
۳۔ سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔

تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم و غصہ یا کسی قسم کے ذوق شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے اور وہ قوت بیان سے ٹکر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے۔ جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے۔ اسی واسطے شاعر وہی ہے جس کی طبیعت میں یہ صفت خدا داد ہو۔ قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے مگر حقیقت میں اُس کا دل اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ قدرت کے کارخانے میں جو چیز اُس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے اور اُس سے کچھ اثر اُس کی طبیعت اٹھاتی ہے۔ وہ ہر شخص کو نصیب نہیں۔ خواہ لطف و شگفتگی ہو۔ خواہ آزردگی و بیزاری یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ اب اٹھاتا ہے اُس کے لئے ڈھونڈتا رہتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں اور کس طرح اُنھیں ترکیب دوں تاکہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے۔ وہی کیفیت سننے والوں کے دل پر چھا جائے اور وہ بات کہوں کہ دل پر اثر کر جائے۔

شاعر کبھی ایک حجرے میں تنہا بیٹھتا ہے۔ کبھی سب سے اکیلا پھرتا ہے۔ کبھی کسی درخت کے سائے میں تنہا نظر آتا ہے اور اسی میں خوش ہوتا ہے۔ وہ کیسی ہی خستہ حالی میں ہو مگر مزاج کا بادشاہ اور دل کا حاتم ہوتا ہے۔ بادشاہ کے پاس فوج و سپاہ۔ دفتر و دربار۔ اور ملک داری کے سب کارخانے اور سامان موجود ہیں۔ اس کے پاس کچھ نہیں

مگر الفاظ اور معانی سے وہی سامان بلکہ اُس سے ہزاروں درجے زیادہ تیار کر کے دکھا دیتا ہے
بادشاہ سالہا سال میں کن کن خطرناک معرکوں سے ملک فتح یا خزانہ جمع کرتا ہے۔ یہ جسے
چاہتا ہے گھر بیٹھے دے دیتا ہے اور خود پرواہ نہیں۔ بادشاہ کو ایک ولایت فتح
کرکے وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی جو اُسے ایک لفظ کے ملنے سے ہوتی ہے کہ اپنی جگہ پر
موزوں سجا ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ اُسے ملک کی پرواہ بھی نہیں۔

اس باب میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ یہ ہے کہ شیخ ابراہیم ذوق جس
مکان میں بیٹھتے تھے۔ تنگ و تاریک تھا۔ گرمی میں دل دق ہو جاتا تھا۔ بعض قدیمی
احباب کبھی جاتے تو گھبراتے اور کہتے کہ یہ مکان بدلو۔ گھڑی بھر بھی بیٹھنے کے قابل نہیں
تم کیوں کر دن رات یہیں کاٹتے ہو؟ وہ ہوں ہاں کرتے اور چپکے ہو رہتے۔ کبھی مسکراتے
کبھی جو غزل کہتے ہوتے اُسے دیکھنے لگتے۔ کبھی اُن کا منہ دیکھتے۔ خدا نے مکانات۔ باغ۔
آرام و آسایش کے سامان سب دئے تھے۔ مگر وہ وہیں بیٹھے رہے اور ایسے بیٹھے
کہ مر کر اٹھے۔ اچھا اُن کے قصائد اور غزلیں دیکھ لو۔ کسی بادشاہ کی سلطنت میں اس شان
و شکوہ اور دھوم دھام کے سامان موجود ہیں؟ گویا سلطنت کے سامان سب انھیں
کا مال تھے کہ جس طرح چاہتے تھے اپنے کام میں لاتے تھے۔ جب وہ اپنے کلام کو پڑھتے
تھے تو بادشاہ کو جو مالک سلطنت ہوتا ہے۔ کچھ اُن سے زیادہ خوشی نہ ہوتی ہوگی۔ کیونکہ
اُسے ان کا فکر بھی رہتا ہے۔ اُنھیں پرواہ بھی نہیں تھی۔

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق بے کچھ نہ کچھ روئیدگی کے رہ نہیں سکتی۔
اسی طرح کوئی زبان اپنے اہل زبان کی حیثیت بموجب نظم سے خالی نہیں رہ سکتی۔ ہر
روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے زبانوں کے سلسلے
میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہل زبان کی شائستگی اور تہذیب علمی کے ساتھ لطافت
طبع کے درجے دکھاتی ہے۔

زبان اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اُس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کے بحر باتیں کرنی سیکھے ہاں۔ نظم جوش طبع تھا۔ اس لئے پہلے نکل پڑا۔ نثر شائستگی کے بوجھ سے گرانبار تھی اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا۔ نثر اردو کی تصنیف ۱۱۴۵ھ سے پہلے نظر نہیں آتی۔ البتہ نظم کی حقیقت زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر نکلتی ہے کہ جب برج بھاشا نے اپنی وسعت اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی تو طبیعتوں میں اس قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا۔ لیکن وہ صدہا سال تک دوہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی۔ یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی کے خیالات نہ آتے تھے۔

امیر خسرو نے کہ جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا۔ خالق باری۔ جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی اس میں فارسی کی بحروں نے اول اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب متروک ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی پہیلیاں عجیب و غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ مثلاً آئینے کی پہیلی۔

فارسی بولی آئینہ ترکی سوچی پائی نا
ہندی بولی آرسی آئے منہ دیکھو جو اسے بتلائے

ناخن کی پہیلی

بیسوں کا سر کاٹ لیا نہ مارا نہ خون کیا

اسی جوش طبع اور ہنگامۂ ایجاد میں ایک تازہ ایجاد وہ ہوا۔ جس میں ہمارے لئے تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔

۱۔ مضامین عاشقانہ سے وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا۔ جسے غزل کہتے ہیں۔ وہی نام ردیف اور قافئے دونوں کی پابندی۔ اسی طرح اول مطلع یا کئی مطلع پھر چند شعر اخیر میں مقطع اور اس میں تخلص۔

۲۔ عروض فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا۔

۳۔ فارسی اور بھاشا کو نون مرچ کی طرح اس انداز سے ملایا ہے کہ زبان پر چٹخارا دیتی ہے۔

اس میں یہ بات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے بنیاد عشق کی عورت ہی کی طرف سے قائم کی تھی جو کہ خاصہ نظم ہندی کا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ عشق کا انقلاب کس وقت ہوا۔ ابتدائے ایجاد میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ زمانہ متبدیوں کا اصلاح دینے والا ہے۔ پھر تراشیں دے کر اعلیٰ درجہ خوبی وخوش اسلوبی پر پہنچا دیتا ہے مگر اس وقت اس طرف کسی اور نے ایسی توجہ نہ کی کہ جس سے اس طرز کا رواج جاری ہو جاتا۔ البتہ ملک محمد جائسی نے مثنوی پدماوت کے علاوہ دوہرے اور گیت بھی لکھے اور وہ ایسے اعلیٰ رتبے کے ہیں کہ ڈاکٹر گلگرسیٹ صاحب کی تصنیف میں نہایت مدد کرتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ فارسی کی بحروں میں کوئی شعر اس کا نہیں۔ دکن میں ایک سعدی گذرے ہیں۔ ان کا فقط اتنا حال معلوم ہے کہ اپنے تئیں ہندوستان کا سعدی شیرازی سمجھتے تھے اور تعجب یہ ہے کہ مرزا محمد رفیع سودا نے اپنے تذکرے میں ان کے اشعار مندرجۂ ذیل کو شیخ سعدی شیرازی ہی کے نام پر لکھا ہے۔

قشقہ چو دیدم بر رخت گفتم کہ یہ کیا ریت ہے گفتا کہ در ہو باورے اس تہر کی یہ ریت ہے
ہم تمہا تمھن کو دل دیا۔ تم دل لیا اور دکھ دیا ہم یہ کیا۔ تم وہ کیا۔ ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی کہ گفتہ ریختہ۔ دُر ریختہ۔ دُر ریختہ شیر و شکر ہم ریختہ۔ ہم ریختہ ہم گیت ہے

کبیر اور تلسی داس وغیرہ کے دوہرے عالم میں زبان زد ہیں۔ مگر وہ فقط اتنی

سند کے لئے کار آمد ہیں کہ اس عہد میں فارسی الفاظ کا دخل ہندؤں کی زبانوں پر بھی ہو گیا تھا۔ انھیں اس نظم سے علاقہ نہیں جو فارسی سے آکر اردو کے لباس میں ظاہر ہوئی اور ملکی مالک کو بے دخل کر کے گوشے میں بیٹھا دیا۔

سیوا۔ ایک مصنف دکن میں گذرا ہے۔ جس نے روضۃ الشہداء کا دکھنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ مرثیے اس کے اب تک امام باڑوں میں پڑھے جاتے ہیں اور غالب ہے کہ اس طرح کے شاعر اُن عہدوں میں بہت ہوں گے۔ مگر ایسی شاعری کو علمی شاعری نہیں کہہ سکتے۔

نواز۔ نام ایک مصنف نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں لکھا۔ اس عہد میں نظم اردو کے ضعف کا یہی سبب ہو گا کہ جو ذی استعداد اردو کے اہل زبان ہوتے تھے وہ اردو کی شاعری کو فخر نہ سمجھتے تھے کچھ کہنا ہوتا تھا تو فارسی میں کہتے تھے۔ البتہ عوام الناس موزوں طبع دل کی ہوس پوری کرنے کو جو منہ میں آتا تھا کہے جاتے تھے جو اہل ولایت شاعر ہوتے تھے اردو انھیں آتی نہ تھی کہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تمسخر کرتے ہیں۔ چنانچہ مرزا معز موسوی خاں فطرت کہ زبدۂ شعرائے ایران اور عمدۂ شعرائے عالمگیری سے تھے اور بعد اُن کے قزلباش خاں امید کے متفرق اشعار دیکھیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اُس وقت ٹوٹی پھوٹی زبان تھی۔ اُسے پورا ادا نہ کر سکتے تھے۔

اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ نظم موجودہ نے دکن سے ظہور کیا۔ چنانچہ میر تقی میر نے بھی ایک غزل میں شاعرانہ انداز سے اشارہ کیا ہے۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی۔ ہم ریختہ گوئی کے ‌ ‌ ‌ معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور قائم اُن کے ہم عصر نے صاف کہہ دیا ہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ‌ ‌ ‌ ایک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

بہر حال عالمگیر کے عہد میں دلی نے اس نظم کا چراغ روشن کیا جو محمد شاہ کے عہد میں آسمان پہ ستارہ ہو کر چمکا۔ اور شاہ عالم کے عہد میں آفتاب ہو کر اوج پر آیا۔

نظم اردو کے آغاز میں یہ امر قابل اظہار ہے کہ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں ذو معنیین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے۔ مگر کم۔ اردو میں پہلے پہلے شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی۔ اور دور اول کے شعرا میں برابر وہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند اشعار بھی نمونے کے طور پر لکھتا ہوں۔

لام نستعلیق کا ہے اُس بت خوشخط کی زلف ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

تم دیکھو یا نہ دیکھو۔ ہم کو سلام کرنا یہ تو قدیم ہی سے سر پہ ہمارے کرے

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے کہ آخر بد نما لگتا ہے دیکھو چاند کا گہنا

شاہ حاتم نے بڑی کوشش کر کے ان رنگ آمیزیوں سے اردو کو پاک کیا۔ سودا کے عہد میں بھی اس مادہ فاسد کا بقیہ چلا آتا تھا۔ اگرچہ وہ انداز پہلے کی نسبت بالکل نہیں رہے پھر بھی جس قدر ہیں وہ ایسے زبان پہ چڑھے ہوئے ہیں کہ جن مضامین کے ادا کرنے کی ہمیں آجکل ضرورت پڑتی ہے اُس کے لئے خلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی بھولنی نہ چاہئے کہ جس طرح ایک نوجوان مرغ اپنے پہلے پر جھاڑ کر نئے پر نکالتا جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری زبان بھی اپنے الفاظ کو بدلتی چلی آئی ہے۔ چنانچہ بہت سے لفظ ہیں۔ جن کا دور بدور شعرا کا کلام میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ اظہار قابل افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے یعنی مضامین عاشقانہ میخواری مستانہ بے گل و گلزار۔ وہمی رنگ و بو کا پیدا کرنا۔ ہجر کی مصیبت کا رونا۔ وصل موہوم پر خوش ہونا۔ دنیا سے بیزاری۔ اسی میں فلک کی جفاکاری۔ اور غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصلی ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں تو بھی خیالی استعاروں میں ادا کرتے ہیں نتیجہ جس کا یہ

کہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ میرے دوستو! دیکھتا ہوں کہ علوم و فنون کا عجائب خانہ کھلا ہے اور ہر قوم اپنے اپنے فن انشا کی دستکاریاں بھی سجائے ہوئے ہے۔ کیا نظر نہیں آتا ہماری زبان کس درجے پر کھڑی ہے؟ ہاں صاف نظر آتا ہے کہ پا انداز میں پڑی ہے؟

ہمارے بزرگوں میں سے دلی میں سے اوّل مرزا رفیع سودا پھر شیخ ابراہیم ذوق نے زبان کی پاکیزگی۔ الفاظ کی شستگی۔ اور ترکیب کی چستی سے کلام میں خوب زور پیدا کیا۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زار نالی۔ افسردہ دلی۔ دنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا۔ غالب نے بعض مواقع پر ان کی عمدہ پیروی کی مگر معنی آفرینی کے عاشق تھے اور زیادہ توجہ ان کی فارسی پر رہی۔ اس لئے اردو میں غالباً صاف اشعار کی تعداد دو سو ۲۰۰ شعر سے آگے نہ نکلے گی۔ جرأت نے عاشق معشوق کے معاملات۔ اور دونوں کے دلی خیالات کو نہایت خوبی اور شوخی سے بیان کیا۔ مومن خاں نے باوجود مشکل پسندی کے بیدردی کی۔ لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخ خواجہ حیدر علی آتش۔ رند۔ صبا۔ وزیر وغیرہ نے شاعری کا حق ادا کیا۔ مگر پھر خیال کرو کہ فقط زبانی طوطہ مینا بنانے سے حاصل کیا؟ جو شاعر ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان پورا نہ نکال سکے گویا ایک ٹوٹا قلم ہے جس سے پورا حرف نہ نکل سکے۔ دارالخلافہ دہلی جو کہ انشا اور شاعری اردو کے لئے دارالضرب تھا وہاں ذوق اور غالب نے اسی شاعری پر خاتمہ کیا۔ لکھنؤ میں ناسخ و آتش سے شروع ہو کر رند۔ وزیر۔ صبا۔ تک سلسلہ جاری رہا۔ ایک زمانے میں مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ لیکن لکھنؤ میں ان دونوں شاخوں کے صاحب کمال بھی ایسے ہوئے کہ اصلوں کو رونق دے دی۔ اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر خاتمہ شعرائے اردو کا ہیں اور چونکہ اس فن کے صاحب کمال کا پیدا ہونا نہایت درجے کی آسودگی اور زمانے کی قدر دانی۔ اور متعدد ساما نوں پر منحصر ہے اور اب زمانے کا رنگ اس کے بالکل برخلاف ہے۔ اس لئے ہندوستان کو اس شاعری کی ترقی اور ایسے شعرا کے پیدا ہونے سے بالکل مایوس

ہونا چاہئے۔ البتہ کوئی نیا فیشن نکلے پھر اس میں خدا جانے کیا کیا کمال ہوں۔ اور کون کون اہل کمال ہوں۔

خاتمہ کلام میں عقل کے نجومی سے سوال ہوا کہ اس شاعری کا ستارہ جو نحوست زوال میں آگیا ہے۔ کبھی اوج پر بھی طلوع کرے گا یا نہیں؟ جواب ملا کہ نہیں۔ پوچھا گیا کہ سبب؟ جواب ملا کہ حکام وقت کی یہ زبان نہیں۔ نہ اُن کے کارآمد ہے۔ اسی لئے وہ اس کے قدر دان نہیں۔ نہ وہ اسے جانتے ہیں۔ نہ اُس کے جاننے کو کچھ فخر جانتے ہیں۔ وہاں سے ہمارے شعرا کو جھوٹے خوشامدی کا خطاب ملا ہوا ہے۔ اچھا یا قسمت! یا نصیب یا جن لوگوں کلام ہماری زبان کے لئے سند سمجھے جاتے تھے اُن کی تو یہ عزت ہوئی۔ اب اس نیم جان مردہ کے رونے والے چند بڈھے رہے۔ جن کی دردناک آوازیں کبھی کبھی آہ سرد کے سردں میں بلند ہو کر سینوں میں رہ جاتی ہیں۔ وہ کبھی دل آسودہ ہوتے ہیں۔ تو ایک مشاعرہ کر کے مل بیٹھتے ہیں۔ اور آپس ہی میں ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے جی خوش کر لیتے ہیں۔ شاعر غریب اپنے بزرگوں کی قبریں قائم رکھنے کو اتنی ہی تعریف پر قناعت کریں۔ مگر پیٹ کو کیا کریں؟ یہ دوزخ تو بہت سی تعریف سے بھی نہیں بھرتا۔

پھر سوال ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر ہے؟ جس سے اس کے بھی دن پھریں اور پھر ہماری نظم کا باغ لہلہاتا نظر آئے۔ جواب ملا کہ ہاں۔ ہمت و تدبیر کو خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ صورت یہی ہے کہ ایشیا میں ایسے کمالوں کی رونق حکام کی توجہ سے ہوتی ہے۔ شاعروں کو چاہئے کہ اسے حاکموں کے کارآمد یا اُن کی پسند کے قابل بنائیں۔ ایسا کریں گے تو شعر کہنے والوں کو کچھ فائدہ ہوگا۔ اور جس قدر فائدہ ہوگا اُسی قدر چرچا زیادہ ہوگا۔ اُسی قدر ذہن اور فکر جودت کریں گے۔ اور دلچسپ ایجاد اور خوشنما اختراع نکالیں گے۔ اسی کو ترقی کہتے ہیں۔

یہ تو ہم نے دیکھ لیا کہ اردو میں جو سرمایہ انشاپردازی کا ہے فارسی کی بدولت ہے۔

قدمائے فارس ہر قسم کے مضامین سے لطف اٹھاتے تھے۔ متاخرین فقط غزل میں منحصر ہو گئے
ذی استعداد قصیدے بھی کہتے رہے۔ اردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام
پسندی کی غرض ٹھہرا کر حسن وعشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اس میں کچھ شک نہیں
کہ جو کچھ کیا بہت خوب کیا لیکن وہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے
وہی مقرری باتیں ہیں۔ کہیں ہم لفظوں کو پس وپیش کرتے ہیں۔ کہیں ادل بدل کرتے
ہیں اور کہے جاتے ہیں گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں۔ انھیں
کو چباتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو اس میں کیا مزا رہا۔ حسن وعشق سبحان اللہ
بہت خوب لیکن تابکے، حور ہو یا پری۔ گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے حسن
وعشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے! اور اب تو وہ بھی سو برس کی بڑھیا ہو گئی۔
ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ان خیالات کے ادا کرنے کے لئے ہمارے بزرگ الفاظ و
معانی اور استعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں اور وہ اس قدر زبانوں
پر رواں ہو گئے ہیں کہ ہر شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے۔ اگر اور خیال نظم کرنا
چاہے تو ویسا سامان نہیں پاتا۔ البتہ ذی استعداد مشاق چاہیں تو کر بھی سکتے ہیں
لیکن کمبخت حسن وعشق کے مضمون اس کے خط وخال اور بہار وگلزار کے الفاظ ان
کی زبان ودہان میں رچے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ کہنا چاہیں تو اول اُسے بھلائیں۔ پھر اسکے
مناسب مقام ویسے ہی نرالے استعارے۔ نئی تشبیہیں۔ انوکھی ترکیبیں اور لفظوں کی
عمدہ تراشیں پیدا کریں اور یہ بڑی عرقریزی اور جانکاہی کا کام ہے۔ بے ہمتی جو ہماری
قوم پر حاکم با اختیار بنی ہوئی ہے اُسے اس سے زیادہ رُکنے کا موقع کیا مل سکتا ہے۔
اس اتفاقی معاملے میں اور تو جو کیا سو کیا بڑی قباحت یہ پیدا ہوئی کہ ارباب زمانہ نے
متفق اللفظ کہہ دیا کہ اردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے۔ اسے ہر ایک مضمون کے
ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے

دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے اور کیوں کر دھوئے؟ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دریاؤں کے کناروں پر قابض ہوگئے ہیں اُن کی ہمت آبیاری کرے گی دونوں کناروں سے پانی لائے گی اور اس سے داغ کو نہ فقط دھوئے گی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی۔

(مولوی محمد حسین آزاد - از آبِ حیات)

پہلا لکچر

فارس کی قدیم تاریخ

عزیزانِ وطن! اگرچہ ہندوستان میں زبان فارسی کا آفتاب مدت سے ڈھلتا چلا جاتا ہے لیکن جب ہم عموماً ممالک ایشیا پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہی ایک زبان نظر آتی ہے۔ جس نے ہر ایک ملک میں تاثیر برقی کی طرح اپنی حرارت دوڑائے ہوئے ہے۔ کوئی شہر ایسا نہیں جہاں کچھ نہ کچھ اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود نہ ہوں تو تم ذرا اس کی برکت پر خیال کرو اکثر گانوں ایسے کہ مثلاً عرب یا ترک، یا انگریز یا فرنچ یا جرمن آدمی وہاں جا پڑے تو اس کی روٹی اور پانی کی بات بھی کوئی نہ سمجھے گا۔ لیکن ایک ایرانی تازہ ولایت جہاں جا نکلے گا وہاں کوئی نہ کوئی ایسا آدمی ضرور موجود ہو گا جو اُسے کھانے پینے کی ضرورتوں سے تنگ نہ ہونے دے گا اور اہل ہند کے واسطے یہ زبان اس سبب سے خصوصاً قابل توجہ ہے کہ اردو کے پتلے کا ایک قوی عنصر ہے۔

اس کا خزانہ استعاروں مجازوں اور کنایوں کے جواہر سے دولت مند ہے سامان موجود ہے ہر مطلب کو نظم خواہ نثر سادہ خواہ رنگین جس قالب میں چاہتی ہے ڈھال دیتی ہے۔ ادائے مطلب میں جو اسے کمال ہے اور زبانوں کو کم حاصل ہے اُس کی زمین انشاء پردازی کی گلکاری میں جیسی نثر کے لئے موافق ہے ویسی ہی نظم کے حق میں مناسب ہے - ہر اقلیم کے زبان دانوں نے اسے پسند کیا ہے - کیونکہ سیکھنے میں سہل ہے۔ اور ادائے مطلب میں مختصر۔

اور بولنے میں خوشگوار۔

کسی زبان کی نکتہ فہمی کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کے ملک کی تاریخ اور جغرافیہ۔ اور ملکی حالات۔ اور اہل ملک کے عادات واطوار سے بخوبی واقفیت نہ ہو۔ زبان فارسی میں زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ اُس کی شیرینی گفتار نے اُس میں بہت سے نازک اور باریک لطف پیدا کر دئے ہیں۔ اسی واسطے اسکی اصطلاحوں اور اشاروں کنایوں کا کچھ شمار نہیں۔ مختلف زبانوں کے پرکھنے والوں نے زبان مذکور میں یہ جوہر خاص پایا ہے کہ اُس کے ہر فقرے میں ایک نکتہ ہے اور ہر بات میں ایک لطیفہ ہے وہ جن استعاروں اور تشبیہوں سے مرصع ہے۔ اُن کی بنیاد ضرور کسی نہ کسی خصوصیت ملکی پر ہے جس میں ملک کی حالت سرزمین کی صورت لوگوں کی ریت رسوم رہنے سہنے کے دستور۔ ملاپ جلاپ کے طریقے۔ طرز لباس نشست برخاست کے قاعدے وغیرہ وغیرہ سب کو دخل ہے اور انھیں کی بنیاد پر وہ نمکین محاورے اور رنگین استعارے چبھتے ہوئے اشارے۔ کھٹکتے ہوئے کنائے قرار پائے ہیں۔ جو اُن کی انشاپردازی کو اور زبانوں کی فصاحت سے الگ جلوہ دے کر روشن اور ممتاز دکھاتے ہیں۔

میں آج کل دیکھتا ہوں کہ مدارس تعلیمی کی رونق اور نئی تصنیفات نے جو ایران سے آتی ہیں۔ اُس کی طرف بہت لوگوں کی طبیعتیں مائل کر دی ہیں۔ لیکن شوقین طلبا اُس کے خاص خاص حالات وخیالات سے واقف نہیں۔ اس لئے جب کوئی شعر سنتے ہیں تو بجائے اس کے کہ سن کر اُس کی کیفیت سے لطف اُٹھائیں اور ذوق وشوق سے وجد میں آجائیں وہ اس طرح سوچتے رہ جاتے ہیں۔ جیسے یہ حالت ہوئی انشاپردازی کی جان پر سخت ستم ہے۔ ہمارے محقق اس میٹھی زبان کی تحقیقات میں کوششوں کے حقوق کو پورا پورا ادا کر گئے۔ اور شائقوں کے لئے کافی سامان دے گئے ہیں۔ لیکن وقت ایسا تھا کہ اس انداز پر کوئی تالیف لکھنے کی ضرورت

انھیں نہیں معلوم ہوئی جو آج ہے۔ اُس زمانے میں یہاں کے اکثر لوگ خود ولایت زادتھے
یت سے اُن کی اولاد تھے۔ اس طرح کہ باپ یا دادا ولایت کے تربیت یافتہ تھے۔ اور
اہل ایران اس کثرت سے یہاں موجود تھے کہ ہر وقت اُن کی صحبتوں اور گفتگوؤں سے
ذخیرے خیالات کے جمع کرتے رہتے تھے۔ اس لئے وہ باتیں کتابوں میں مرتب نہ ہوئیں
اور یہ افسوس کا مقام ہے۔ کیوں کہ وہ صاحب کمال لوگ تھے۔ اگر لکھتے تو شوق
کی پیاس کو خوب بجھاتے اور مطالب مذکورہ کو اس جادو بیانی سے ادا کرتے کہ فقط
ملک ایران کی تصویر ہی نہ کھینچتے بلکہ اُس کے ہرے بھرے جنگل سرسبز پہاڑ بہتے چشموں سے
پھولے پھلے باغ لگاتے۔ اور اُن میں نسیم وصبا کے گزار۔ پرندوں کے چہچہے۔ صبح کی
کیفیت۔ شام وشفق کی بہار سامنے دکھاتے۔ آباد شہر۔ چلتے بازار۔ سجے سجائے گھر۔
سامنے نظر آنے لگتے۔ اور بلبلانِ شیراز۔ یعنی میرزایانِ ایران اُن میں پھرتے چلتے۔ بولتے
چالتے نظر آتے۔ لیکن افسوس ہے بڑوں کے مرنے کا کہ جس نے مجھ چھوٹے کو بڑائی دی
اور میرے عزیز دوستوں اور پیارے شاگردوں نے مجھ سے اس بارگراں کے اُٹھانے
کی درخواست کی ؎

آسماں بار امانت نہ توانست کشید　　قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

میں حقیقۃً اس تحریر اور تقریر کے لئے ناقابل ہوں۔ مگر ان کے کہنے سے چارہ نہیں۔ اس
لئے کچھ نہ کچھ کہے بغیر گزارہ نہیں۔ ناچار اس رستے میں قدم دھرتا ہوں۔ لیکن مناسب
دیکھتا ہوں کہ مطالب مذکورہ کے بیان کرنے سے پہلے کچھ فارسی قدیم کا حال بیان کرلوں جس
کا سلسلہ اُس ملک باستانی سے اُلجھا ہوا ہے اور وہ اس زبان کا جزو اعظم ہے۔

فارس کے حالات۔ اور فارسی زبان کے خیالات

آدم زاد کی تصویر جو صانع قدرت نے اوصاف رنگارنگ سے سجائی ہے اُس کے

جس رنگ پر عقل نظر کرتی ہے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ غور کے قابل اُس کی
زبان اور حسن بیان ہے۔ کیونکہ ہر ملک میں زبان ہی ایک ایسی شے ہے جس سے اُس کے
بولنے والوں کی لیاقت یا جہالت یا تہذیب و بے تہذیبی کا اندھیرا اُجالا معلوم ہوتا ہے۔
غور کرو تو کسی قوم کی تحقیقی حالت اور حقیقی لیاقت اور طبیعت کی اصلیت ہمیں نہیں معلوم
ہوتی۔ اور تاریخ بھی ہمارے دل پر تصدیقی اور یقینی نقش نہیں کرتی۔ ہاں جو باتیں
خود اُن کے منہ سے نکلی ہے اور کتابوں میں لکھی گئی ہیں۔ اگر وہ ہاتھ آجائیں تو اُن کے
ہمارے کاروبار اور حالات و خیالات گویا اقراری تصدیق کو پہونچ جاتے ہیں۔
تاریخ کا عجیب حال ہے۔ کسی ملک کا مسافر یا سیاح وہاں کے حال کو اپنے سفرنامے
میں باتوں کا افسانہ بناتا ہے۔ یا سادہ لوح مورخ جو کچھ سنتا ہے اپنی تاریخ میں ایسی
باتیں ایک قوم سے منسوب کردیتا ہے جو اکثر خلاف عقل کہانیاں ہوتی ہیں ہاں جب خود
ایک زبان کے بولنے والوں کے اصلی الفاظ اور محاورے ایسے موجود ہیں جن سے اُن کی خاص
خاص رسومات اور سرگذشتوں کے نشان اور اُن کے خیالوں کے رستے کھلے نظر آتے ہیں
تو کون سی عقل ہوگی جو اُس سے انکار کرے گی؟ اس تصور کا نمونہ ملک فارس اور
زبان فارس کی حالت ہے۔ بہت افسوس ہے کہ اس ملک کی راہِ تواریخ میں سُراغ
بالکل مٹے ہوئے ہیں۔ اور جو کچھ ہیں وہ نظم میں ہیں۔ اور افسانوں کے لباس میں چھپے
ہوئے ہیں۔ ہاں یورپ میں علم زبان کے محققوں نے اپنے علم کے ذریعے سے اب اتنا پتہ لگایا
ہے کہ یونان کی تاریخ سے بھی تقریباً ہزار برس پہلے وہی شرافت پناہ فرقہ جو ایریا کہلاتا ہے
بخارا خواہ تاتار غرض وسط ایشیا سے اٹھا۔ اور چاروں طرف عالم میں پھیل گیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا
ہے کہ اشخاص نامور قدوں کے لمبے۔ رنگ روپ کے گورے چٹے۔ باپ دادا سے اولوالعزم۔ اور
ہمت والے چلے آتے تھے۔ خود شائستہ تھے اور جانتے تھے کہ شائستگی کے کام اور راحت و آرام کے
سامان کیونکر حاصل ہوسکتے ہیں۔ اِن کی ایک شاخ نے اپنے خیالات کو مذہبی نقش و نگار سے گو

نگارخانہ چین سجایا۔ دوسرے نے یونان میں جاکر فلسفہ وحکمت کا طوفان باندھا۔ تیسرے نے روما کی بنیاد ڈال کر روئے زمین پر حکومت شاہی اور حکمت عملی کا نقارہ بجایا۔ ایک شلخ نے اندلس میں جاکر کیسۂ خاک سے چاندی نکالی اور انگلستان سے خبر آئی کہ پانی سے مچھلیاں۔ بلکہ پہاڑ کے سینے کو چیر کر لوہا تک نکال لائے۔ ہندوستاں میں ہمالہ اتر کر آئے اور برہمن دیوتا کہلائے۔ ایران میں شمشیر وگرز سنبھالا۔ اور درفش کاویانی کو مرصع کر کے ہوا میں لہرایا۔ ممالک مذکورۂ بالا میں الفاظ کا اتفاق ان کی اتحاد اصلیت پر گواہی دیتا ہے۔ اُن میں بھی جو اتفاق الفاظ کا سنسکرت اور فارسی میں ہے غالباً کسی زبان میں نہ ہوگا۔ چنانچہ گروہ در گروہ لفظوں کے انبوہ بہ آواز بلند پکار رہے ہیں کہ ان دو خاندانوں کا نسب نامہ ایک ہے۔ اور کہتے ہیں کہ قوم ہی کے نام سے ملک مذکور نے ایران نام پایا ہے۔ اسی کو یونان کی کتب مغلیہ آریاں پکارتی ہے۔

سیامک جسے اہل ایران برگزیدۂ یزداں۔ خدیو جہاں۔ شاہنشاہ پیشداد کہتے ہیں۔ (بعض کہتے ہیں کہ شیث پیغمبر وہی تھے) نیک نیتی اور داد و دانش کی برکت نے اُسے پارسا خطاب دیا۔ اور اُسی تقدس سے اُس نے ملک مذکور کا نام پارس رکھا تھا کہ پاک اور مقدس کو پارس کہتے ہیں (اور اسی سے ہے پارسا)

بعضے کہتے ہیں کہ پیشداد ہوشنگ جس کے باقبال اور روشن زمانے میں پتھر سے آگ نکلی اُس کا لقب بھی پارس تھا۔ اور اُسے ایران شاہ بھی کہتے تھے۔ اُس نے ایک شہر آباد کر کے اُس کا نام ایران رکھا تھا۔ وہی ادل بدل کر آج نشاپور کہلاتا ہے۔ اور ایران کے معنی پاک اور پاکیزہ بھی آتے ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ فریدوں ابن آبتین کے تین بیٹے تھے۔ جب سلطنت کی ترقی دل کے ارمان نکال چکی تو ملک کے تین حصے کئے۔

(۱) ملک مشرقی تورج کو دیا - ایرانی اُسے ان ایران کہتے تھے - عرب نے ماوراالنہر اُس کا نام رکھا -

(۲) ملک مغربی سَلم کو - اہل ایران اُسے ایران پتہ کہتے تھے -

(۳) ملک وسطی ایرج کو دیا - کہ اسے بیٹے کو بہت چاہتا تھا - یہ خطِ اُستوا سے جانب شمال - اور ممالک ربع مسکوں کے وسط میں واقع تھا - اسی واسطے مملکت کے کل شہروں میں معتدل اور خوش آب و خوش ہوا تھا -

ہر قوم کا دستور تھا کہ اپنے ملک میں ایک مقام کو مذہبی برکت سے عظمت دیتے ہیں - چنانچہ موسائیوں اور عیسائیوں نے بیت المقدس - اور عرب میں اکثر انبیا نے اور سب سے آخر اسلام نے مکۂ معظمہ کو معظم تسلیم کیا - ہندوستان میں کاشی متھرا وغیرہ وغیرہ - ایران نے اس قطعۂ زمین کو متبرک سمجھا -

بعض مؤرخ لکھتے ہیں کہ فریدوں نے بھی اس مقدس مقام اور اپنے باقبال بزرگوں کا قدمگاہ سمجھ کر یہ ملک پیارے بیٹے کو دیا تھا - اور اس میں سے قطعۂ خاص کو اعلیٰ اور روح افزا دیکھ کر پارس نام رکھا تھا (یعنی ارض مقدس) افسوس کہ اِن خوبیوں نے اور باپ کی محبت نے بھائیوں کے دلوں میں عداوت کا خنجر ڈھالا - اور دونے مل کر ایک بے گناہ کو مار ڈالا - ایرج کی ماں کا نام ایراں دخت تھا -

کرماں شاہان کے پہاڑوں میں کوسوں تک پرانے ویرانے پڑے ہیں - وہ شاہانِ قدیم کے جاہ وجلال کی مٹی ہوئی تصویریں ہیں - انھیں میں ایک مقام طاق بستان مشہور ہے - اور دستکاریوں سے نقش و نگار میں ایک جگہ شاپور ذوالاکتاف کی تصویر ہے -

ہندوستان کے آریا بھی اپنے تئیں آرج کہہ کر یہاں کے شودروں سے امتیاز کرتے ہیں - اور ان ہی کی آبادی سے یہاں کا ملک ہماچل سے بندھیاچل تک آریاورت کہلاتا تھا - اور تم ابھی سن چکے ہو کہ فارسی قدیم کی کتابوں میں ایراں کے معنی شریف و

دانا و ہنرمند بھی لکھے ہیں (یہی ارجمند کا ترجمہ ہے)
اکثر اہل یورپ ان ہی تحقیقاتوں کے لئے بمبئی اور خاندیس تک آئے۔ ایران بھی پہنچے۔ پارسیوں کے دستوروں اور موبدوں سے اُن کی کتب قدیمہ بہم پہنچائیں۔ ساتھ ہی سنسکرت کی معلومات بھی حاصل کی۔ اور دونوں کو مطابق کرکے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر دنیا کی پرانی کتابوں میں وید سب سے پرانی کتاب تسلیم کی جائے تو پارسیوں کے گاتھا اُن سے دوسرے درجے میں ہوں گے۔ ہزار بلکہ پندرہ سو برس پہلے سنہ عیسوی سے اُن کی انشاء پردازی درجۂ تکمیل کو پہنچی ہوئی تھی۔
اس ملک کے جاہ و جلال۔ علوم و فنون۔ اور تہذیب و شائستگی کی طرف ہر ملک کے مؤرخ عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن افسوس یہی ہے کہ وہ اپنی مسلسل تاریخ اپنے پاس نہیں رکھتا۔ کچھ مختصر بیان جن کی بنیاد شاعرانہ افسانوں پر ہے مثلاً شاہنامہ۔ سکندرنامہ۔ زینت التواریخ۔ وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اور جب تاریخ کا یہ حال ہے تو زبان کی اصلیت اور اُس کے انقلابوں کا سلسلہ کب مسلسل ہاتھ آسکتا ہے۔ باوجود اس کے یہ بالاتفاق ثابت ہے کہ ساڑھے چار ہزار برس سے کم اور چار ہزار برس سے زیادہ ملک مذکور میں اُسی قوم کے بادشاہ اس دھوم دھام سے سلطنت کرتے رہے اور شمشیر اور دولت مندی سے کسی قوم کے آگے سر نہیں جھکایا۔
صحیح بخاری میں ایک جگہ اہل فارس کا بھی ذکر آگیا ہے۔ ابن امام صاحب فتح الباری نے اُس کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ شہسوار اور بہادر لوگ تھے۔ پھر مجوس ہو کر آتش خانے بنائے لیکن ریاست سیاست حسن مملکت تدبیر جنگ۔ ہر چیز کو برمحل برتنا۔ فن انشا۔ نفاست مزاج۔ لذیذ کھانوں اور خوشبوؤں کی ایجاد اور خوش لباسی میں بے مثل و بے نظیر تھے رسوم ملک داری میں اور لوگ ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔
جب یہ بات ثابت ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ ایسی باعظمت اور قدیمی سلطنت کیا علوم

سے بے بہرہ ہوگی؟ یا فنون و صنائع کی دولت سے محروم ہوگی؟ اُن کی زبان علمی الفاظ کے اعتبار سے ناتمام ہوگی؟ اور نظم کے گلزار سے خالی ہوگی؟ ہرگز نہیں جس آریا قوم کی ایک شاخ نے ہندوستان میں آکر علم کے دریا بہا دئے کیا دوسری شاخ نے وہاں جاکر بزرگوں کا نام ڈبویا ہوگا؟ نہیں نہیں۔ اور ہرگز نہیں۔ تب کیا آفت آسمانی آئی جس کے سبب سے ایسے مہذب لوگ ایسے علوم و فنون کے خزینہ دار جاہ و جلال کے سپہ سالار اس حالت میں نظر آنے لگے جسے اور نقصانوں کے ساتھ آج لوگ کہتے ہیں کہ "فارسی زبان علمی زبان نہیں" اس کا سبب یہ ہے کہ اوّل تو کیانیوں کی آخر سلطنت میں زرتشت کے نئے دین اور نئے آئین نے صدہا برس کی رسوم اور علوم اور اُس کی کتابوں کو خاک سیاہ کیا۔ تم ضرور کہو گے کہ مذہب کا زبان پر کیا اثر ہوسکتا ہے۔ ہم کہیں گے کہ اس تغیر کو خیال کرو جو کہ بودھ کے سبب سے سنسکرت پر ہوا۔ دیکھ لو سنسکرت کے دین آئین سب بدل گئے تھے کتب خانے نیست و نابود ہوگئے تھے۔ عاصیوں کی زبان جو ایک پراکرت زبان تھی۔ وہی بودھ قادر مطلق کی زبان کہلاتی تھی۔ وہی ازلی و ابدی قرار پائی تھی۔ پالی حروف دفتروں سے لے کر کتب مذہبی تک حروف الٰہی ہوگئے تھے۔ نئے کتب خانے سج گئے تھے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ جب زرتشت نے بادشاہ وقت (یعنی گشتاسپ) اور ولی عہد (یعنی اسفندیار رُوئیں تن) اور تمام خاندان شاہی اور امرائے دربار کے دلوں پر آگ کی روشنی سے دین الٰہی کا جلوہ دیا ہوگا تو قدیمی رسوم و رواج سے باقی کیا چھوڑا ہوگا؟ زرتشت نے روما سے علوم حاصل کئے تھے۔ اور اضلاع شام سے خروج کیا تھا۔ کچھ نہ کچھ مزاحم وہ زبان پر آیا ہوگا۔

غرض دین زرتشت نے سلطنت کے بازوں سے ایسا زور پکڑا کہ تمام ایران و خراسان پر چھا گیا۔ اور تخمیناً دو برس تک اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور کہتا ہوا اٹھا کہ ؎

نہ آتش گذارم نہ آتشکدہ — شود ہر دو از دستم آتش زدہ

جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے ہندؤں پر گذری تھی وہی وہاں ژندواستا پر آئی۔ افسوس جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتاسپ نے تاج کیانی سر سے آتارا۔ اسفندیار روئیں تن نے گرز و شمشیر نذر چڑھائے۔ وہ آگ آب شمشیر سے بجھائی گئی۔ ژندواستا کے ورق ورق برباد گئے۔ سکندر نے شراب کے نشے میں شہر استخر کو آگ لگوادی۔ تاریخ کے سینے پر آج تک داغ ہے۔ اُس شہر کا کہ تختگاہ ملک جم کا تھا اور پشتوں سے یہ مقام شاہ نشین سلاطین ایراں زمیں کا چلا آتا تھا۔ غضب یہ ہوا کہ اُس کا عظیم الشان کتب خانہ آگ کا نذر ہوا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یونانیوں نے جب ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر کیونکر زور دکھایا ہوگا۔

سکندر کے تھوڑے ہی دنوں بعد پارتھیا والوں کا عمل ہو گیا۔ جس ایران کو ہزاروں برس سے فتح کے نشان سلامی سے آتارتے تھے۔ اور فتحیابی دربار میں سر جھکاتی تھی۔ ۵۰۰ برس تک نئے ظفریابوں کے قبضے میں دبا رہا۔ اور ژند کی مقدس کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کیں۔ آخر ۲۲۶ء کے بعد ۵۰۰ برس کے مردے میں اقبال ساسانی نے سانس پڑا۔ اور دم شمشیر سے تن بے جان میں جان آئی۔ اردشیر بابکان خاندان مذکور کا بانی تھا۔ اُس نے ملک و مملکت کے قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کے نور کو بھی روشن کیا۔ آتش خانے پھر تعمیر کئے۔ مذہب مٹ گیا تھا۔ کتابیں ضائع ہو گئی تھیں۔ لوگوں کی زبانوں سے یا جن جن مقاموں سے پھٹے پرانے اوراق پریشان ہاتھ آئے۔ انھیں سمیٹ کر پھر مذہب کی شیرازہ بندی کی اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہوا۔ اردشیر ایسے ذوق و شوق بلکہ سخت جوش و خروش سے ملک اور قوم کے کام میں مصروف ہوا کہ مؤرخ اُس کو تعصب اور سخت مزاجی کی تہمت لگاتے ہیں

اور یہ جرم ممکن ہے کیونکہ پارتھیا والوں کے کئی سو برس کے جمے ہوئے رنگ کو مٹا کر اپنا نقش جمانا۔ اور اُن سے بھی پہلے سکندر کی اکھڑی ہوئی بنیادوں کو چن کر نئی عمارت کا اٹھانا سختی کے بغیر کیونکر ہو سکتا تھا۔ اس خاندان نے پانچ سو برس بادشاہی کی اہل فارس کو اس سلطنت کے سلسلے کا بھی فخر ہے۔ اور فی الحقیقۃ اردشیر شاپور نوشیروان جیسے بادشاہ جس خاندان میں نیک نامی کے نشان بلند کریں اُن کی قوم جو ناز کرے بجا ہے ساڑھے چار سو برس کے بعد ریگستان عرب سے ایک آندھی اُٹھی۔ اس کے پیچھے گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیر اسلام کے قربان ہو گیا اور درفش کاویانی قادسیہ کی خاک پر سرنگوں ہوا۔ اللہ اللہ وہی مبارک چمڑا تھا جس کے اقبال سے ضحاک کی بلا دفع ہوئی تھی اور کیانی خاندان کا حقدار اپنے حق کو پہنچا تھا۔ وہ ہر میدان میں فتح کا ستارہ ہو کر چمکا۔ اور اُس کی برکت پر پھولوں کی جگہ جواہر اور موتی چڑھائے گئے تھے۔ اس کے شگون پر جنگ کے معرکوں میں امیدوں کی آنکھیں لگی رہتی تھیں۔ آج وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا اور دیندار بہادروں میں اُس کے جواہرات اور موتی مٹھی مٹھی کھجوریں تھیں کہ بٹ گئیں۔ عالیشان آتش خانے ڈھائے گئے۔ اُن کی نورانی آنکھ خاک کے نیچے دھم ہو کر رہ گئی۔ دینی اور دنیاوی کتابیں ورق ورق اُڑ گئیں اور جل کر خاک ہو گئیں۔ اس وقت میں میرے پارسی بھائی وہاں سے بھاگے اور جانوں کے ساتھ ایمانوں کو بھی بچا لائے۔ چنانچہ مدراس اور بمبئی کے ملکوں میں آکر پھر آتشخانے بنائے اور اپنے بزرگوں کے نام کو روشن کیا۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس موجود ہے وہ ٹوٹا پھوٹا بقیہ ہے جو کئی صدموں کے بعد بچا ہے (۱) یونانیوں کا طوفان (۲) پارتھیا والوں کی پانسو برس کی سلطنت جس کی پریشانی کو ساسانیوں کی ہمت نے فراہم کیا تھا (۳) عرب کا حملہ جس کے بعد پھر پارسیوں کو جمعیت نصیب نہ ہوئی۔ اب پارسی بھائیوں نے اپنے گھر دیں جب آگا ہی کے

لیمپ جلائے تو روشن ہوا کہ ژند کے ۲۵ باب تھے اُن میں سے ایک وندیداد انیسواں باقی ہے اور متفرق اوراق یا فصلیں ہیں کہ زبانوں یا سینوں میں امانت آئے تھے۔ اُنھیں میں کتاب زورہ استا ہے اُس میں بہت سی دعائیں وظائف کی ہیں۔ ایک ایرانی محقق کہتا ہے کہ زورہ وہی لفظ ہے جو قرآن میں سورہ ہو کر لکھا گیا ہے۔

ہماری معلومات کو پارسی بھائیوں کا شکریہ کرنا چاہیئے کیونکہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے۔ اسی سے ہم تک دو پرانی نسلوں کی ایک اصل ثابت ہوئی اسی سے دو زبانوں کے لغات کا رستہ نکل آیا اور اس سے ان کی خاندانی رسموں کی بلکہ اتحاد مذہب کی حقیقت معلوم ہوئی۔ اور یہ خبر ہوئی کہ سنسکرت کے بعد ژند ہی زبان ہے جو قدامت کا تمغہ اپنے پاس رکھتی ہے اور وہ قوانین زباں اور اصول صرف و نحو۔ اور طرز بیان اور سلاست اور فصاحت میں اُس درجہ پر پہنچی ہوئی ہے کہ یورپ کے محققوں نے اُس کے رتبے کو تسلیم کیا ہے۔

اُن کے علوم و فنون پر بار بار ادبار کے طوفان آئے پھر جو کچھ باقی ہے اُس کے طالب خبر دیتے ہیں کہ ہم کس دریا کے قطرے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ جہاں ہم تھے وہاں سب کچھ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے پارسی بھائی خانہ برباد ہو کر ادھر آئے اور اُن کی خورجینوں میں زیادہ تر فلسفۂ الٰہیات اور مذہبی کاغذات کے پرزے تھے یہ ہے ایسے وقتوں میں خدا یاد آتا ہے اور ایمان والوں کے ساتھ ایمان ہی جاتا ہے اُن کے مطالب بھی دیکھو تو معلوم ہو گا کہ علم مذکور کس اوج رفعت پر تھا۔ اُن کی علمی اصطلاحیں جب عربی کی اصطلاحوں سے مطابق کرتا ہوں تو بازار دنیا کے لین دین کا تماشا نظر آتا ہے۔

ابھی دیکھتا ہوں کہ دارا کی لوٹ میں سکندر علم کے صندوق بھی لئے جاتا ہے اور اُن سے یونان و روم کے مدارس و کتب خانوں کو افزائش دیتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد دیکھتا

ہوں کہ عرب کے بہادر قطار در قطار اونٹ کچھ ادھر سے لادے لئے آتے ہیں کچھ فارس سے لئے جاتے ہیں اور اُس سے بیابان ریگستان کو آباد کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد دیکھتا ہوں کہ اُنھوں نے فارس کو اپنا سرمایہ دے دیا مگر امانت دار تھے جو کچھ لیا جوں کا توں حوالے کر دیا۔ خود اپنے ریگستانوں میں ویسے ہی رہ گئے جیسے کہ تھے۔

ساسان پنجم کے فضائل و کمالات میں لکھا ہے کہ اُس کے مباحثے کے ارادے سے ایک فلسفی کامل مصر سے چلا اور ساسان آباد میں پہنچا۔ جس مدرسے میں ساسان پنجم درس دیتا تھا وہاں کے دربان کے گھر میں ایک لونڈی تھی۔ اتفاق یہ کہ فلسفی مصری رات کو اُس لونڈی کے شوہر کے گھر میں اترا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ اس گھر کو میرے حریف سے کیا علاقہ ہے۔ رات کو لونڈی کی ماں نے پوچھا کہ میاں مسافر تم کس شہر کے رہنے والے ہو؟ اور یہاں کس ارادے سے آئے ہو؟ چھوٹا سفر۔ (حرکت جسمانی) بڑے سفر۔ (سفر آخرت) کے سامان کے لئے چاہئے۔ نہ کہ دنیا کے نفع کے لئے کیونکہ یہ ناپائدار ہے اور اس کا تعلق اصلی ٹھکانے تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ مصری فلسفی سنکر حیران ہو گیا۔ ناچار علم کی آڑ میں چھپا اور کہا کہ تلاش علم۔ پھر عورت سے پوچھا کہ "واجب کا فعل قدیم ہے یا حادث؟ عورت بولی "حادث وہ ہے کہ زمانی ہو اور زمانہ فلک الافلاک کی گردش کو کہتے ہیں۔ چونکہ واجب اُس سے برتر ہے تو چاہئے کہ واجب قدیم ہو اور اُس کا فعل بھی قدیم ہو۔ حکیم مصری نے پوچھا کہ واجب تک بھی فنا پہنچ سکتی ہے۔ عورت نے کہا۔ نہیں! اس لئے کہ ممکنات موجود ہیں اور یہ بیدان فاعل کے موجود نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ معلول بغیر علت کے نہیں رہ سکتا۔ حکیم نے اعتراض کیا کہ باپ بیٹے کی علت ہے۔ باپ مرجاتا ہے بیٹا جیتا رہتا ہے عورت نے کہا کہ باپ بیٹے کی علت نہیں وہ اُس کے سبب کا ایک جز ہے نہ کہ علت! دیکھتا نہیں؟ ماں بانجھ ہوتی ہے تو باوجود باپ کے بچہ نہیں ہوتا۔ اور واجب الوجود تو علت تامہ ہے۔ جب تک

وہ ہے تب تک سب کچھ ہے۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ غرض کتب مذکورہ میں سے جو رسالے
فارسی میں ترجمہ ہو گئے اور میری نظروں تک پہنچے ہیں۔ ان میں صدہا مسائل الٰہیات
اور فلسفہ کے ہیں کہ کہیں فلسفۂ یونان سے مطابق ہیں اور کہیں اُن کا پہلو توڑ جاتے ہیں۔
ریاضی اور اُس کی تمام شاخیں صفاً صفاً ہو گئیں۔ دساتیر میں ایک جگہ سیاروں کے
دور وغیرہ اور اُن کے شمار بتلائے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ہیئت تھا اور
بہت بلند رتبے پر تھا۔

ان کے ہندسے کی مفلسی آج رحم کے قابل ہے۔ کہ ہزار سے زیادہ مرتبۂ اعداد بھی
نہیں بتا سکتے۔ مگر دساتیر میں انھیں سیارات کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مراتب
اعداد کا شمار معمولی حد تک ضرور تھا۔ اور جب کہ نکتے کو دانگ اور خط کو کشک کہتے
تھے تو اُن کے استعمال کے مقام ومحل بھی ضرور ہوں گے۔

جغرافیے کی کوئی کتاب نہیں نظر آتی مگر تقسیم روئے زمین کے بعض مطالب جو کہیں
کہیں لکھے ہیں اور اُن سے اکثر اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ سراغ بتاتی ہیں کہ
ایک زمانے میں بھاری ذخیرہ ہو گا۔

ان کی دستکاری اُن عمارات قدیمہ سے نمودار ہے جو کوہ بے ستون طاق بستان
نواح کرمان۔ شاہان وغیرہ وغیرہ مقامات میں کھنڈر پڑے ہیں ؎

از نقش ونگار در و دیوار شکستہ   آثار پدید است صنادید عجم را

یا قدیمی سکوں اور پرانے نگینوں سے معلوم ہوتی ہے جو کہ خزانۂ خاک سے کہیں کہیں
نکل پڑتے ہیں۔ ایران۔ خراسان تک۔ انھیں کی تواریخ کا گورستان ہے۔ قصر
شیریں اور خرابۂ شاپور خرابہ استخر کہ شیراز کے پاس ہے اور اُس کے علاوہ اکثر
پہاڑوں میں شاہان قدیم کی شکارگاہیں ہیں اور دربار منقوش ہیں۔ سواری اور
سواری کے جلوس۔ اور فوجیں چلی جاتی ہیں۔ اُن سے فقط صنعت اور دستکاری

کی باریکی ہی نہیں روشن ہوتی بلکہ پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے جوکیاں اور دریاں بنتے جاتے ہیں۔ وہ خبر دیتے ہیں کہ ہمارے ملک کی جنگی فوج باقاعدہ تھی اور ہم قواعد جنگ کو علمی اصول سے کام میں لاتے تھے۔

طاق لبنان کی تصویروں میں ایک مقام پر شاپور اور اس کا باپ آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک حلقے کو دونوں پکڑے ہیں۔ اس سے کرۂ زمین کا اشارہ ہوگا ایک طرف زرتشت کی تصویر ہے اس کے چہرے سے پرتو آفتاب کا ملح شعاعیں پھیلاتا ہے۔

کنارہ خراسان سے لے کر ادھر غزنی اور کابل تک اور بلخ اور اس سے آگے کنارہ جیحوں تک عجیب وغریب یادگاریں عہد قدیم کی نظر آتی ہیں۔ شاہان کیانی کی بزم گاہوں کے نقشے اور رزم گاہوں کے معرکے خاک پر مٹے پڑے ہیں۔ کابل سے چل کر بامیان اور بلخ کے درمیان دونوں طرف بلند پہاڑ دیواروں کی طرح چلے جاتے ہیں۔ بیچ میں فراخ شاہراہ ہے۔ کہیں دوطرفہ۔ کہیں دائیں۔ کہیں بائیں دو منزلہ۔ سہ منزلہ مکانوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح تراشا ہے جیسے کوئی صابون یا چربی کی ڈلی کو تراشتا ہے۔ استحکام و استواری کا تو کیا کہنا ہے۔ طرز تحریر اور نقش و نگار دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ اور وہاں کے ہزاروں اور افغانوں کے کلام کو تصدیق کرنا پڑتا ہے کہ کہتے ہیں یہ دیوزادوں کا کام ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے بنائے ہیں۔ شمار میں ۱۲ - ۱۵ سو سے کم نہ ہوں گے

اسی سلسلے میں ایک عمودی پہاڑ کی سل میں ایک بت تراشا ہوا ہے۔ جس کا چالیس گز کا قد ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا نام سا سال ہے۔

ایک عورت کی تصویر ہے۔ اس کا قد ۲۵ گز بلند ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس کی بی بی ہے۔ اس کا نام شمامہ ہے۔

ایک بچہ ہے اس کا ۱۲ گز کا قد ہے نام معلوم نہیں ہوا ان سوتوں کے تناسب

اعضا خط و خال زیور اور خوشنمائی آج تک سیاحوں سے اپنے دستکاروں کے لئے تعریفیں لیتے ہیں۔

رستے سے کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ کو قلعۂ ضحاک ویران پڑا ہے۔ اسے شہر غلغلہ کہتے ہیں۔ اس کی فرسودہ فصیلیں اور بے شمار برج و کنگرے دور سے اداسی اور مایوسی کی تصویریں دکھلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں خرابے اور ویرانے گمنام پڑے ہیں اور تہ کے شہر ہیں۔ کہ زیر زمین مدفون ہیں۔ جابجا پرانے زمانے کے پیسے۔ روپے۔ اشرفیاں اور نگینے نکلتے ہیں۔ ان پر ایرانی۔ یونانی اور ہندوانی سکے اور تصویریں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ معمولی اور غیر معمولی سیکڑوں چیزیں اگلے وقتوں کی ایسی نکلتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتیں۔ بلخ خاص دار السلطنت ان بادشاہوں کا تھا یہ باختر زمین اور ادھر مقابل میں خراسان زمین باختر کو یونانیوں نے بیکٹر یا بنا دیا۔

قندھار اور غزنی کا علاقہ زابلستان کہلاتا تھا۔ رستم حامی ایران کا وطن یعنی سیستان انہیں علاقوں میں ہے سر بلخ کے رستے میں بائیں ہاتھ چند کوس کے فاصلے پر ایک مقام تخت رستم کہلاتا ہے وہ اس دشت میں اکثر شکار کھیلا کرتا تھا۔ ایک سنگ سیاہ کی چٹان ہے۔ اُسی کو تخت رستم کہتے ہیں۔

اہل تحقیق نے ایجاد علوم کی تحقیقات کی۔ کہ یہ درخت اول کہاں سے پھوٹا اور اُس کی پود کہاں سے کہاں تک پہنچی۔ اور اس کا شجرہ اس اس طرح سرسبز ہوا۔ دیکھو ہند نے یا فارس نے اپنے علم کا سرمایہ مصر کو دیا۔ مصر نے دونوں سے لے کر یونان کو دیا۔ یونان نے رومیہ کو دیا۔ رومیہ اور یونان اور فارس نے عرب کو دیا۔ اور عرب سے پھر تمام یورپ اور ایشیا میں پھیلا۔

اب خیال کرنا چاہئے کہ جس قوم نے ساڑھے چار ہزار برس اس شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی ہو اور علوم و فنون کی ترقی اس مرتبے پر پہنچائی ہو۔ کیا اُس کی زبان ایسی مفلس۔ بے سکّے۔ بے ٹکسال ہو گی۔ کہ جب تک اُس میں آدھوں آدھ عربی لفظ نہ ملائیں تب تک زبان نہ ہلا سکیں۔

عرب کا ملک جس میں قبل اسلام نہ کبھی سلطنت کا گزر ہوا۔ نہ علوم و فنون کی ہوا لگی۔ وہاں ایک شیر کے لئے سو سے زیادہ نام تھے۔ اور اسی طرح شراب کے لئے پھر زین اور لگام کے ایک ایک جز کے الگ الگ نام تھے۔ غرض اب تک ذرا ذرا سے فرق پر ہر شے کے لئے جُدا جُدا لفظ موجود ہیں۔ کیا ایسی عالی نژاد قوم اور قدیمی سلطنت کے پاس بات کرنے کو بھی الفاظ نہ ہوں گے۔ عرب کے صحرا نشین ہر دانت کے جوڑ کے لئے جُدا جدا نام رکھیں اور ہر انگلی کا الگ الگ نام۔ فارس جیسے شائستہ لوگوں کو سوا دنداں اور انگشت کے کچھ نہ آتا ہو گا؟ کیا ان اشیا ذیل کی ضرورت انھیں کبھی نہ پڑتی ہو گی؟ آخر وہ بھی علمی ضروریات رکھتے تھے۔ طب رکھتے تھے۔ تشریح رکھتے تھے۔ ملکی کاروبار رکھتے تھے۔ آپس کے معاملات و مقدمات رکھتے تھے۔ اُن کے کام کیوں کر چلتے ہوں گے۔

سنسکرت میں انگشٹ انگوٹھے کو کہتے ہیں۔ اب اُسے فارسی میں نر انگشت کہتے ہیں اور اُس کے پاس والی انگلی کو انگشت شہادت کہتے ہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ نماز میں ایک موقع پر اس سے اشارہ کرتے ہیں کہ وحدانیت الٰہی کا اقرار پایا جائے تو اسلامی اصطلاح ہوئی۔

شہد کی مہال میں جو بادشاہ ہوتا ہے اُسے عربی میں یعسوب کہتے ہیں۔ فارس کے مصنف شاہ زنبوراں لکھتے ہیں۔ ایران کا ملک جس کے پہاڑوں میں شہد موجیں مارتا ہے کیا وہاں اس کے لئے لفظ نہ ہو گا؟ ضرور ہو گا۔

سمجھنے کو یہی کافی ہے کہ ہم درہم کو عرب کا مال جانتے ہیں مگر عرب میں سکہ کہاں تھا تجارت کی وکالت سے دینار روم سے آیا۔ درہم پارس سے گیا اور فارس میں کسی کو خبر نہیں کہ وہ ہمارا مال ہے۔ آج سے صدہا سال تک عہد بعہد کے سکے پرکھو تو بیسیوں نام نکلیں گے۔ مگر کوئی عربی۔ کوئی ترکی۔ اور اب یورپی۔

اسی طرح آج فارس کے ملک سخن میں ہزاروں غیر ملک کے پردیسی زبانوں پر چلتے پھرتے ہیں۔ خاک ایران کی آفرینش گم ہیں بعض الفاظ فارسی ہیں۔ مگر مرکب ہیں یا مشتق ہیں اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ نوزائیدہ ہیں۔

تم ضرور کہو گے کہ اس کا سبب کیا؟ میں کہتا ہوں۔ گواہان بے زبان سے سنو کہ کیا کہتے ہیں۔ وہ کون؟ تاریخی کتابیں۔ اگرچہ اس عہد کے مصنف ایسی باتوں پر اٹکتے نہ تھے تو بھی قرینے کا پہلو کہیں نہ کہیں سے نکل آتا ہے۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جب اسلام کا سایہ اس ملک پر آیا تو کل دفتر و دربار کی زبان عربی ہو گئی بادشاہی فرمانوں سے لے کر دفتروں کے احکام تک اسی زبان میں جاری ہونے لگے اسی میں عرائض اور کل مقدمے کے فرائض طے ہوتے تھے۔ اسی میں عام خط و کتابت ہوتی تھی۔ آخر ۴۴۲ھ میں الپ ارسلاں کا دور تھا کہ ملک کی خاک نے پھر زور کیا اور عمید الملوک اس کے وزیر کی تجویز سے ملکی دفتر زبان فارسی میں ہو گئے۔ اگرچہ ملک کو بہت آسائش ہوئی مگر علماء نے وزیر کو بڑا مطعون کیا بلکہ کم علمی اور بے لیاقتی کے داغ لگائے۔

خیال کرو! جہاں تین سو برس تک کل دفتر اور تحریریں عربی زبان میں جاری رہی ہوں اور بادشاہ وقت اور اس کے اہل دربار اسی کا جامہ پہنے ہوں۔ اس کی تاثیر ملکی زبان پر کس قدر چھائی ہو گی اور عربیت نے کس قدر فارسیت کو مٹایا ہو گا اسی کتاب میں پھر لکھتا ہے کہ نوشیرواں کے زمانے میں حکماء فارس نے اس کے نام پر

وامق و عذرا کی داستان بہت دلچسپ طور پر لکھی تھی ۔ جب ایران میں اسلام آیا تو خلفائے عباسی کے زمانے میں عبداللہ ابن طاہر حاکم خراسان تھا ۔ ایک شخص نے وہ کتاب امیر کے سامنے لا کر رکھی اور اُس کی فصاحت و بلاغت اور طرز بیان کی تعریف کی ۔ امیر نے کہا ہم تو قرآن پڑھا کرتے ہیں ۔ ہمیں قرآن و حدیث کے سوا کوئی کتاب درکار نہیں ۔ یہ مغان آتش پرست کی کتاب ہے ۔ جب الحکم کتاب پانی میں فنا کی گئی اور تمام فارسی کی کتابیں جس جس شہر میں پائیں جلادیں ۔

فارسی قدیم کی کتابیں کم و بیش جو کچھ ہیں وہ سمجھنے کے لحاظ سے ہمارے حق میں قریب سنسکرت کے ہیں ۔ بعض کے ترجمے انگریزی میں بعض کے فارسی میں دیکھئے تو اُس میں حمد الٰہی کے زمزمے ہیں ۔ بعض کتابیں الٰہیات یا تصوف کی ہیں ۔ ان کی مقدس عبارتوں کی طرف انشا پردازی کا مبصر ادب کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کہتا کیونکہ ہر چمن کی آب و ہوا جدا ہوتی ہے ۔ مذہبی تحریر کا عالم کچھ اور ہے اور انشا پردازی کا رنگ کچھ اور ۔ تحقیق کی آنکھیں روتی ہیں ۔ اُس گئے وقت پر جو کسی طرح نہیں آسکتا ۔ اُن خانہ بربادوں کے ہاں بھی تاریخ ۔ اخلاق ۔ افسانے نظم ۔ نثر ۔ سب کچھ ہوں گے ۔ کیا اُن کی عبارتوں کا بھی یہی سیدھا سادا بے تکلف رنگ تھا ۔ افسوس آج اُس عہد کو کہاں سے لائیں اور جو کچھ فنا ہو گیا کیوں کر پائیں کہ دوستوں کو دکھائیں اور کچھ فائدہ اٹھائیں ۔ خیر جس بات کا پورا مزہ نہ لے سکیں ۔ ادھورے کو چھوڑنا بھی دانائی سے بعید ہے ۔ اس لئے جو سامان میری معلومات کی الماری میں مدت سے جمع ہو رہا ہے اُسے نکالوں گا ۔ اول قبل اسلام کی تصنیفات کے نمونے دکھاؤں گا پھر بعد اسلام کی عبارتیں عہد بہ عہد اور صدی بہ صدی سجاؤں گا کہ تغیر کے رنگ خوشنما نظر آئیں ۔

(مولوی محمد حسین آزاد ۔ از سخندان فارسی)

ساتواں لکچر

ہر ایک سرزمین اور اُس کے موسموں کی بہار انشا پردازی پر کیا اثر کرتی ہے؟

عزیزان وطن! میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر ایک انشا پردازی اپنے ملک کی سرزمین آب و ہوا اور پیداواری بلکہ اُس کے جغرافیے کو آئینے کی طرح دکھاتی ہے۔ کیونکہ جو چیزیں انشا پرداز کو آس پاس نظر آتی ہیں۔ انھیں کو وہ ادائے مطلب کے سامان میں خرچ کرتا ہے۔

ایک خوش رنگ خیال ہے ذرا غور کر کے دیکھو ہر ملک میں جو رنگ رنگ کی اشیا مختلف اجناس اور مخلوقات ہیں۔ وہ حقیقت میں مختلف کیفیتیں ہیں کہ اُس سرزمین کی طبیعت یا مزاج نے باہر نکالی ہیں۔ اسی طرح ہر ملک کی زبان ایک سرزمین ہے کہ بیان کو وہیں کے اجناس و اشیاء کے استعاروں میں جلوہ دیتی ہے۔ دیکھو جس طرح کسی سرزمین کی طبیعت مجبور ہے کہ قدرتی پیداواروں کو باہر نکالے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح اُس کی زبان کی طبیعت مجبور ہے کہ وہیں کے تشبیہہ و استعاروں میں مطلب کو رنگ دیتی ہے۔ ہر سرزمین اپنی تاثیر میں مجبور ہے۔ اُس کی زبان اپنی خاصیت میں مجبور ہے۔

اس خیال کو میری تقریر نے پیچیدہ کر دیا۔ اچھا اب یوں سمجھو کہ کسی ملک کا انشا پرداز جب کوئی مطلب بیان کرنے لگتا ہے تو وہاں کے اشیا و اجناس وغیرہ جو آس پاس ادھر اُدھر سامنے ہیں۔ وہ ہجوم کر کے اُس کے دل اور زبان پر اُمنڈ کر آتے ہیں اور مجبور کرتے ہیں کہ جو کچھ کہنا ہے ہمارے استعاروں اور ہماری تشبیہوں میں ادا کر وہ خیال کہ اُسے مجال نہیں ہوتی۔ بجز اس کے کہ انھیں کو اپنے ادائے مطلب کا سامان بنائے جب بیان میں صفائی کے ساتھ لطف آئے۔

لطیفہ۔ تین شخص ہم سفر تھے۔ سنار۔ پنیر والا۔ نانبائی۔ شام کو ایک جنگل میں اُترے۔ بستر ایسے مقام پر ہوئے کہ سامنے کوسوں تک کھلا میدان تھا منہ ہاتھ دھوئے۔ کھانے کھائے۔ جب کچھ رات ہوگئی۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی

دل شگفتہ ہوئے - ۱۳ - ۱۴ تاریخ تھی - چاند نے سامنے سے سر نکالا - سنار نے کہا - آہا - کندن ڈلک ڈلک کرتا ہے - ابھی کٹھائی سے نکالا ہے - پنیر والا بولا - تاب چکتی ہے - ابھی چاقو تک نہیں چھوایا - نانبائی نے کہا - یہ تو میرے تنور سے پھر پھراتی روٹی نکلی ہے - دیکھو جو شخص جس جس حال میں تھا ویسے ہی خیال اُس کے دل میں پیدا ہوئے -

گر خیالت گلشن است تو گلشنی   ور خیالت گلخن است تو گلخنی

ہر ایک ملک کی سرزمین میں اکثر پیداواریں ایسی بھی ہوتی ہیں - جن سے دوسرا ملک محروم ہے - اسی واسطے ہر ایک زبان میں ادائے خیالات کے انداز جدا جدا ہوتے ہیں بلکہ اشیائے مذکورہ صاحب زبان کو مجبور کرتی ہیں اور اپنے ہی خیالات زبان پر لاتی ہیں اکثر چیزیں دو ملکوں میں مشترک ہیں - اس لئے اکثر خیالات بھی مشترک ہیں بعض ایسے خیالات کہ غیر ملکوں سے آئے ہیں - مگر اپنی خوبی یا دوسری قوم کی شدت ارتباط سے زبان میں داخل ہو گئے ہیں -

بہرحال مناسب ہے کہ آج فارس کی ملکی حالت بیان کروں اور دکھا دوں کہ یہ خیالات - یہ ترکیبیں - یا اصطلاحیں - یا محاورے جو اس کی انشا پردازی میں ہیں کیونکر اپنے قدرتی زور سے انشا پرداز کے زبان پر آئے ہیں اور اُن کی نزاکت - لطافت اور رنگینی جو اور زبانوں سے سفید و سیاہ کا امتیاز رکھتی ہے - یہ حقیقت میں اصل سرزمین کی حالت اور اُس کی لطافت اور نفاست کا نقشہ کھینچتی ہے -

عرب کا ملک - ریگستان اور کوہستان ہے - پتھریلی خاکی - مخلوط - ہموار ناہموار سہل - دشوار گذار - بادرخت - بے درخت وغیرہ وغیرہ اقسام کی زمینیں تھیں جن میں رات دن - رہنا - سہنا - خانہ بدوش پھرنا - اُن کا کام تھا - اس واسطے ہر ایک کے لئے جدا جدا لفظ تھے - درخت تھے تو - اسل - طلح - کھجور کے اور اکثر سوکھی روکھی قسم کے درخت نظر آتے تھے - اونٹ - شتر مرغ - جنگلی گائیں - پہاڑی بکری - ہرنیاں

بکریاں وغیرہ جانور آنکھوں کے سامنے پھرتے تھے۔ چنانچہ اونٹوں اور کھجوروں کے متعلق بہتیرے لفظ ہیں۔ بادشاہت اور امارت کی شان وشکوہ سے ملک محروم تھا۔ پس عیش وعشرت اور تکلف کے سامان بھی اسی حیثیت بموجب سمجھ لو۔ لوگ بیابان گرد اور صحرانشیں تھے۔ لطافت اور نزاکت کے تکلفات کا وہاں کچھ کام نہ تھا۔ پھر بھی طبیعت میں قدرتی فصاحت کا جوش تھا۔ جن چیزوں کی وہاں بہتات تھی اور ہر وقت آنکھوں کے سامنے نظر آتی تھیں۔ انھیں کی تشبیہوں اور استعاروں میں بے تکلف طور سے اپنے مطالب ادا کرتے تھے اور فصاحت کے زور اور کلام کے سحر کا پورا اثر دلوں پر پہنچاتے تھے۔

فصیح عرب۔ معشوق کی تعریف کرتا ہے تو آنکھ کو ہرن یا گاو دشتی کی آنکھ کہتا ہے۔ زلف کو لا یعنی زغال کہتا ہے اور جب بالوں کی رنگ وبو کو زیادہ چمکاتا ہے تو لونگیں بھی پیس کر ڈالتا ہے۔ مگر مشک وعنبر کی خوشبو سے بھی غافل نہیں ہے ہونٹوں کا سیاہی مائل ہونا۔ قابل تعریف سمجھتا ہے۔ ملک گرم ہے۔ رنگ کالے ہیں دانتوں کو کبھی اولا کبھی گل بابونہ کہتا ہے۔ انھیں چمکاتا ہے۔ مگر مسوڑھوں پر سرمہ چھڑک کر سیاہ کرتا ہے۔

ہند کا انشا پرداز۔ زلف کی تشبیہ میں بھونرا اڑاتا ہے اور سانپ کے پھن بھی لہراتا ہے۔ مگر پہلی تشبیہ خاص ہندوستان کی ہے۔ اور ملک کے لوگوں کو خبر ہی نہیں۔ وہ کیونکر سمجھیں۔ اور کہتے تو سننے والے کیا مزہ لیتے۔ آنکھ کے لئے کنول کے پھول دکھاتا ہے۔ مولے کی اچپلاہٹ دکھاتا ہے کہ ہندوستان کے لئے خاص ہیں جی چاہتا ہے تو ہرن سے بھی آنکھ لڑا لیتا ہے۔ دانت موتی کی لڑیاں ہیں۔ یہ تشبیہ مشترک ہے۔ ناک کو طوطے کی چونچ سے تشبیہ دیتا ہے کہ خاص ہند کا جانور ہے۔ رفتار میں کبھی ہنس کبھی ہاتھی کی چال دکھاتا ہے یہ بھی خاص ہند کا

حسن ہے۔ بدن کی نرمی اور صفائی کو کیلے کے گابھے اور نیلوفر کے پھول سے تشبیہ دینا ہے۔ یہ بھی یہیں کی لطافت ہے۔ رنگ سانولا ہو تو میگھ برن۔ کھلا ہو تو چمپئی کا سا رنگ۔ پہلے دونوں رنگ خاص ہندوستان کا حق ہیں۔ ملک کی گرمی پر خیال کرو۔ خوش آوازی کے لئے کوئل۔ کوکلے۔ پپیہے کی کوک سناتا ہے۔ یہ جانور ہندوستان کے سوا کہیں نہیں۔ رنگ کی صفائی کے لئے اوبٹنا ملتے ہیں کہ سانولے رنگ کا یہی بناؤ ہے۔ فارس والے گلگونہ ملتے ہیں کہ گوری رنگت کا سنگار ہے۔ یہاں کاجل لگاتے ہیں۔ وہاں سرمہ۔ غرض ہر ملک کا انشا پرداز اپنی اپنی چیزوں سے اپنے کلام کو سنوارتا ہے اور چونکہ مطلب اُن استعاروں میں ادا ہوتا ہے جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اور ہر جگہ عام ہیں۔ اس لئے اُن کے استعارے کلام میں مزہ اور سمجھنے میں آسانی اور صفائی پیدا کر لیتے ہیں نہ کہ کلفت یا دشواری۔

قد کی خوبی کو بان اور راسل اور ارنڈ کی لچکتی ٹہنی سے تشبیہ دیتا ہے معشوق کا گندمی یا چمپئی رنگ عام تعریفی رنگ ہیں۔ وجہ اس کی یہ کہ گرمی کے سبب سے ملک کالا ہے۔ وہاں ذرا سا اجالا بھی غنیمت ہے اور گوری رنگت کا تو کیا کہنا۔ اُس کی سبحان اللہ کیوں نہ ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ بعض ہونٹوں پر ایک قدرتی تحریر سیاہی کی ہوتی ہے وہ عرب کے جمال کا جزو اعظم ہے۔ یہ بھی ملک کی گرمی کا سبب ہے۔ حقائق زبان کا ماہر۔ صفحہ کو الٹ کے دیکھے گا تو اور مضمون نظر آئے گا۔ وہ ان خیالات کو دیکھ کر صاف کہہ دے گا کہ یہ ملک گرم ہوگا جو وہاں کے لوگ ان وصفوں کو غنیمت سمجھتے ہیں اور انھیں کی تعریفیں کر کے خوش ہوتے ہیں۔

عرب کا شاعر گھٹا گھنگھور کو بہت پسند کرتا ہے۔ مینہ کی بوچھاڑ سے خوش ہوتا ہے

اور بجلی کے کوندنے کو کہتا ہے۔ گویا سخی کے ہاتھ سیاہ چادر سے نکل کر بخشش کر رہے ہیں۔ ہائے۔ تہی دست ہی جانتا ہے کہ سخاوت کی کیا قدر کرنی چاہیے؟

اونٹ۔ کھجوریں۔ میدان۔ میدانی پہاڑیاں۔ ہرنیاں۔ شتر مرغ۔ قطا۔ وغیرہ وغیرہ اُن کے معمولی مضامین ہیں۔

فصیح فرنگ ایک پہاڑی جزیرے کا رہنے والا ہے۔ جب بہار کا سماں اور صبح کی بہار دیکھتا ہے تو اور رنگ سے لطف اُٹھاتا ہے۔ سمندر کا کنارہ۔ پانی پر ہوا کا لوٹنا۔ موجوں کا لہرانا۔ جہاز دور سے نمودار ہوتا ہے۔ بادبان ہوا میں فراٹے لیتے ہیں۔ پاس پاس کشتیاں دوڑتی پھرتی ہیں۔ دام دار جال پھینک رہے ہیں۔ مچھلیوں کے شکار ہوتے ہیں۔

پھر شفق میں سورج کا کنارہ افق سے نمودار ہوتا ہے۔ اُس کی کرنوں سے پانی جگمگاتا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ سنہری رنگ دکھاتی ہے کہیں دھوپ ہے۔ کہیں چھاؤں ہے۔ سبزے لہلہاتے ہیں۔ چشمے بہتے ہیں۔ پانی لہراتے چلے جاتے ہیں دیکھو! سمجھنے والے انھیں اشاروں کو دیکھتے ہیں۔ اور انشا پردازی سے ملک کی جغرافی ہیئت دریافت کر لیتے ہیں۔ یہ اختلاف ضرور ہے کہ حسن میں ہمارے یہاں سیہ چشم کی تعریف ہے۔ اُن کے ہاں کبود چشم۔ یا سبز چشم کی تعریف ہے ہمارے ہاں بالوں کی سیاہی پسند ہے۔ وہاں سرخی یا بھورا پن۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ملک کا شاعر جو اپنی تشبیہیں اور استعارے کام میں لاتا ہے اُسے اس کا قصداً ارادہ نہ سمجھو۔ بلکہ اشیا وہاں کی جو ہر دم سامنے ہیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہی کو کام میں لا۔ اور ہم ہی میں مطالب ادا کر۔ اور وہ بھی جانتا ہے کہ اسی طرح اپنے مطلب پر جلد کامیاب ہوگا۔ کیونکہ اشیائے موجودہ کے پیرائے میں جو باتیں ادا کی جاتی ہیں سننے والوں کے دلوں پر فوراً اثر کرتی ہیں۔ طبیعتیں لطف اٹھاتی ہیں۔ آپ کے چٹخارے

زبانوں سے واہ واہ کے غل مچواتے ہیں - جو بات سمجھ میں نہ آئے۔ اُس کا دل کیا مزا اٹھائے - اور زبان کیا واہ واہ کرے؟

فارس میں گوری رنگت عام ہے بستی چیز کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ اسی واسطے اُس کی انشا پردازی میں تعریف نہیں - ہاں اُس کی سرخی اور صفائی پر مرتے ہیں کہ آئینہ رخسار کے صدقے۔ اور گل رخسار کے قربان۔ اُن میں جو کہیں سانولا رنگ ہوتا ہے تو غضب ہی ہوتا ہے۔ اُس کے لئے نظر بازوں نے حسن سبز۔ اور حسن سبز رنگ کے الفاظ رکھے ہیں۔ ہندوستان کی سانولی رنگت کا خیال کرتے ہیں اور مزے لیتے ہیں کہ کشتۂ ہندم و سبزانِ زمرد پوشش + کشمیر کا نازک خیال کہتا ہے۔

حسن سبزے بہ خط سبز مرا کرد اسیر دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

آنکھوں کی خوبیاں جو ہند میں ہیں وہی وہاں ہیں۔ کیونکہ ایک دادا کی اولاد ہیں۔ البتہ ترکوں کے حسن نے جب انداز دکھایا تو چشم تنگ کی بھی تعریف ہونے لگی۔ اس کا کیا سبب؟ وہی اصول عام یاد کرو۔ انشا پرداز جو سامنے دیکھتا ہے اسی کو انشا پردازی میں داخل کرتا ہے۔

عزیزان وطن! حقیقت یہ ہے کہ زمین مذکور قدرت کا گلزار ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ روئے زمین پر جو ہوا کا اختلاف اور موسموں کا فرق ملکوں میں ہوتا ہے وہ فرق اُس کے قطعہ قطعہ میں آشکارا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ سخت گرم ہے۔ بعض جگہ معتدل ہے یا سرد ہے۔ اضلاع جنوبی میں کرمان۔ یزد۔ لارستان وغیرہ اضلاع گرم ہیں۔ اور بعضے عرب کی طرح ریگستان ہیں۔ گرمی میں سخت گرمی ہوتی ہے۔ اور اول کے دو مہینوں میں آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ جنگل کے جنگل ریت کے اڑتے ہیں۔ مگر جاڑا اور بہار ایسے شگفتہ ہیں کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔

فارس یعنی شیراز اور اُس کے تمام متعلقات میں نہایت لطیف اور شگفتہ آب و ہوا ہے۔ نہ سخت گرمی ہے نہ سخت سردی۔ چھوٹی چھوٹی نہریں جاری ہیں۔ بادسرد خواجہ حافظ

گے کلام میں چشمۂ اللہ اکبر - اور آب رکنا باد کا کنارہ - پہاڑوں کے دامن بھرے ہیں -
اور پھولوں سے بھرے - سعدی اور حافظ جیسی بلبلیں جہاں زمزمے کریں وہ خدائی باغ
ایسا ہی ہونا چاہیئے - سرسبز پہاڑ - اور لہلہاتے مرغزار - صحرا نشین مخلوقات کو پالتے
ہیں - اور اُن کے مویشی کو فربہ کرتے ہیں - ان علاقوں میں غلے اور میوے دانے
کی بہتات ہے - جوں جوں شمال کو چڑھتے جاؤ آب و ہوا اچھی ہی ہوتی جاتی ہے -
اصفہان ایک زمانے میں پایۂ تخت سلاطین صفویہ کا تھا - اب ویران کہلاتا ہے - مگر
سب آبادیوں سے زیادہ رونق دکھاتا ہے - گرمی شیراز سے نرم ہے - اور جاڑہ زیادہ
ہے - سال بھر میں فقط کئی ہفتے برف ہے باقی آسمان صاف - برف بھی ایسی نرم کہ پڑی
اور پانی ہوئی - مینھ بھی کچھ سخت نہیں - ہوا دیکھنے میں صاف - اور اثر میں خشک -
صیقل دار چیز کو جہاں چاہو رکھ لو - زنگ نہیں لگتا - چاروں فصلیں شگفتہ بہار
آذربایجان اور اُس کے متعلقات مثلاً تبریز وغیرہ میں ایسا جاڑا پڑتا ہے - کہ
تھرمومیٹر ۱۴ درجے پر آجاتا ہے - اکتوبر میں اس شدت سے برف پڑنے لگتی ہے -
جنوری میں یہ عالم ہوتا ہے کہ ابھی کٹورے میں پانی ڈالا ابھی جم گیا - بخاری کے پاس لکھنے پڑھنے
کا سامان رکھتے ہیں - اس پہ بھی دم بدم دوات جم جاتی ہے - شیشوں کے منہ بند ہوتے ہیں
اس پہ شربت اور عرق جم جاتے ہیں - انڈے ہانڈیوں اور قبلیوں میں رکھتے ہیں - مگر مارے
سردی کے پھٹ پھٹ جاتے ہیں - تانبے کا آفتابہ رات کو باہر رہ جائے تو صبح کو
تڑخ جاتا ہے - کھیتی کا یہ حال ہے کہ ہندوستان میں فروری میں کٹ جاتی ہے -
پنجاب میں آخر مارچ اور اپریل میں - وہاں ۱۵ جولائی کو کٹتی ہے - ہمداں میں
بھی برف بہت ہے - کُردستان اگرچہ جنوبی ملک ہے مگر زمین بلند ہے - اس لیے
زیادہ سرد ہے -
شمال ایران میں مازندران - گیلان وغیرہ گرم بھی ہیں اور سیراب بھی ہیں جیسا

ہند ہیں نرگالہ) خراسان نہایت سرد ہے۔ مگر جو علاقہ سیستان سے ملا ہوا ہے وہ نہایت گرم ہے۔ گرمی میں کئی کئی دن باد سموم کے ڈر سے باہر نہیں نکلتے۔

ممالک مذکور کا ہر شخص بلکہ حیوان بھی بالطبع سردی کو پسند کرتے ہیں۔ اور سردی ہی ان کی طبیعت کے موافق ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زمان قدیم میں کبھی بلخ کبھی اصفہان دار السلطنت تھا۔ وہ برفانی ملک ہے اور روسا اور اہل دول اور اُن کے سبب سے فرقے فرقے کے لوگ دار السلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل ملک سیاست پسند اور اکثر تجارت پیشہ ہیں۔ اس لئے گرم ملکوں کے رہنے والے بھی اگر کچھ قدرت رکھتے ہیں تو اپنے کاروبار کی تقسیم اس طرح کر لیتے ہیں کہ گرمی اُن کی سرد ملکوں میں کٹتی ہے۔ اب کہ چالیس پچاس برس سے طہران دار السلطنت ہے۔ ۱۸۸۵ء کا جاڑا میں نے وہیں بسر کیا۔ سردی موذی نہیں۔ تمام فصل میں تین چار دفعہ برف پڑی۔ لوگ کہتے تھے کہ گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے چار پانچ مہینے بادشاہ طہران کو چھوڑ دیتا ہے۔ دامن کوہ الوند میں کئی کوس تک برابر باغستان اور قدرتی سبزہ زار چلے جاتے ہیں۔ وہ اُن کا شملہ اور کوہ مری ہے۔ جب تک گرمی رہتی ہے شاہ۔ ارکان دولت۔ اور خاندان شاہی سمیت وہیں رہتا ہے۔

جیسے ہمارے ملک کے لوگوں کو سردی کی برداشت نہیں ویسی ہی اُنھیں گرمی کی برداشت نہیں۔ سردی میں خوش رہتے ہیں اور جو ایرانی کہلاتے ہیں۔ ٹھنڈے ہی ملک کے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ گویا ٹھنڈا ہی ملک اُن کا وطن ہے۔ یہی سبب ہوگا کہ مزاج پرسی کے فقروں میں کہتے ہیں۔ مزاج مقدس؟ احوال بخیر؟ دماغ چاق۔ کیونکہ سردی میں رہنے سے زکام وغیرہ عوارض کی شکایتیں رہتی ہیں۔

ہندوستان کے حکمائے ہند نے دو دو مہینے کا ایک ایک موسم کر کے سال کے چھ موسم کئے ہیں۔ بسنت۔ گریکھم۔ برکھا۔ سرت۔ ہمنت۔ سسر۔ ایران میں ۴ موسم ہیں

۱۔ بہار۔ ۲۱ مارچ سے	اپریل۔ مئی۔ ۲۱۔ جون تک	حمل۔ ثور۔ جوزا۔
۲۔ تابستاں۔ ۲۱ جون سے	جولائی، اگست ۲۱۔ ستمبر تک	سرطان۔ اسد سنبلہ
۳۔ پائیز۔ ۲۱۔ ستمبر سے	اکتوبر۔ نومبر ۲۱۔ دسمبر تک	میزان۔ عقرب۔ قوس
۴۔ زمستاں۔ ۲۱ دسمبر سے	جنوری۔ فروری ۲۱ مارچ تک	جدی۔ دلو۔ حوت

بہار نوروز

آفتاب آخر حوت پر پہنچا اور موسم میں تبدیلی آئی۔ دل گھبرانے لگتے ہیں۔ آمد بہار کی تاثیر سے زمین سانس لیتی ہے۔ در و دیوار کے مسامات سے گرمی نکلتی معلوم ہوتی ہے اِسے کہتے ہیں کہ "زمین نفس دزدہ میگیرد" پھر چند روز کے بعد کچھ اس سے زیادہ ہوتا ہے کہ در و دیوار میں پسینہ سا آتا ہے۔ تب کہتے ہیں کہ "زمین نفس آشکار می کرد" ساتھ ہی بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ ۲۱۔ یا ۲۲ مارچ کو نوروز ہوتا ہے یا تو درختوں پر پتیوں کا نام نہ تھا۔ سب شاخ بلور سے کھڑے تھے اور زمین آسمان برف ہی برف نظر آتے تھے۔ یا برف باری موقوف ہو جاتی ہے ۸۔ ۱۰ دن کے بعد کبھی ایک آدھ کوئی ہلکا سا جھالا پڑ گیا۔ پڑ گیا۔ ورنہ برف برطرف۔ زمستان موقوف۔ جہاں ہوتی ہے پانی ہوتی جاتی ہے۔ نہریں۔ حوض۔ تلاؤ وغیرہ بلکہ اکثر دریا کہ جم کر آئینہ ہو گئے تھے وہ پگھلنے لگتے ہیں۔ نہروں کی نالیوں سے چپکے چپکے پانی سرسرانے لگتا ہے۔ پھر حوضوں کے اوپر کا تختہ کنارے کنارے سے پگھل جاتا ہے۔ حوض نے دہن کھول دیا۔ کناروں پہ سبزہ اور سبزے میں کلیاں آجاتی ہیں۔ نظامی

دہن ناگشادہ لب آبگیر   کہ آید لب غنچہ را بوئے شیر

میرے دوستو! جب تک ایسے ملکوں میں جاکر حالت مذکورہ کو آنکھوں سے نہ دیکھے تب تک شیر مذکور اور اس قسم کے اشعار کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ اکثر شارح اور محشیوں

نے صفحے سیاہ کئے ہیں۔ اور اصل مطلب کے سائے تک نہیں پہنچے۔ پھر دیکھو انشا پرداز نے اپنے ملک کی حالت اور موسم کی کیفیت کو کیوں کر ظاہر کیا ہے۔

زمیندار اپنے کھیتوں پر آتے ہیں۔ باغ والے باغوں میں پہنچتے ہیں۔ باغیچے سب کے پاس ہیں۔ بعض کے گھروں میں چھوٹے چھوٹے خانہ باغ ہیں۔ غریب اپنے دوست آشناؤں کو لے کر انگوروں کی دار بستیں باندھتے ہیں۔ درختوں کو چھانٹتے ہیں۔ کیاریاں صاف کرتے ہیں درخت جو سوکھی جھاڑیاں نظر آتے تھے ان میں پھر جان آتی ہے۔ اس طرح کہ آج صبح کو دیکھا۔ ٹہنیوں پر برف نہیں رہی۔ کل صبح کو دیکھا تو سبزی کی تحریر معلوم ہوئی دوسرے دن دیکھا تو ہری ہری کوپلیں مگر سبزی بھی ایسی صاف شفاف کہ آنکھوں میں طراوت آئے جس درخت کی طرف دیکھو زمرد کی ٹہنیاں بن گئیں! ۸۔۱۰ دن میں ہرا بھرا درخت لہلہا رہا ہے۔ باغ و گلزار میں بلکہ گھر گھر کیاریوں میں گلاب کھل گیا ہے۔ در و دیوار پر سبزۂ خودرو بھی اگا تو ایک گل خودرو لئے اگا۔ لوگ گھروں میں سکڑے بیٹھے تھے۔ نکل کھڑے ہوئے۔ بند کام جاری ہو گئے۔ آسودہ حال لوگ گھوڑوں پر چڑھے۔ دوست آشناؤں کو لے کر باغوں میں گئے۔ بہاریں منائیں۔ عورتیں بھی باغوں اور کھیتوں میں گئیں اور دل خوش کرنے لگیں۔ جس شخص کے دل پر یہ خیالات چھائے ہیں خاقانی کے بہاریہ قصیدے کا اسی کو مزہ آئے گا۔

نوروز برقع از رخ زیبا برافگند   بر گستواں بہ دلدل شہبا برافگند

نوروز اپنے رخ رنگیں سے برف کا برقع الٹ دیتا ہے یا پری رو یوں کے رخ زیبا سے کہ جو برف کے سبب سے لحافوں میں دبکے بیٹھے تھے ہر طرح لطف زیادہ زیادہ ہے

ادھر گلاب کھلا۔ ادھر بلبل ہزار داستان اس کی شاخ پر بیٹھی نظر آئی۔ بلبل نہ فقط پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے اور چہچہے کرتی ہے اور گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہے کہ بولتی ہے۔ بولتی ہے۔ حد سے زیادہ مست ہوتی ہے تو

پھول پر منہ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے زمزمہ کرتی رہ جاتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں نے جو اُس کے اور بہار کے اور گل و لالہ کے مضمون باندھے ہیں وہ کیا ہیں اور کچھ اصلیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ وہاں گھروں میں نیم۔ کیکر کے درخت تو ہیں نہیں۔ سیب۔ ناشپاتی۔ بہی۔ انگور کے درخت ہیں۔ چاندنی رات میں کسی ٹہنی پر آ بیٹھتی ہے اور اس جوش و خروش سے بولنا شروع کرتی ہے کہ رات کا کالا گنبد پڑا گونجتا ہے۔ وہ بولتی ہے۔ اور اپنے زمزمے میں تانیں لیتی ہے اور اس زور شور سے بولتی ہے کہ بعض موقعہ پر چھ چھ گھر کے جوش و خروش کرتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اہل درد کے دلوں میں سن کر درد پیدا ہوتا ہے اور دل بے چین ہو جاتے ہیں۔ میں ایک فصل بہار میں اُسی ملک میں تھا۔ چاندنی رات میں صحن کے درخت پر آ بیٹھتی تھی اور چہکارتی تھی تو دل پر ایک عالم گزر جاتا تھا۔ کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی۔ کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر اڑا دیا۔ یہ موسم دلوں میں جوش پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جب چاندنی رات ہوتی ہے تو چند آشنا ہم طبع۔ ہم نفس۔ زندہ دلی کی امنگ میں آ کر کہتے ہیں "بیا ئیدا مشب شب گل کنیم"۔ باغ جاتے ہیں۔ رات کو وہیں رہتے ہیں۔ بہار مناتے ہیں۔ اور زندگی کی بہاریں لوٹتے ہیں۔

نگار خانۂ قدرت کے دیکھنے والے دیکھیں گے کہ ہمارے ہندوستان کی بہار کا موسم برسات ہے جو لطف وہاں بہار میں ہوتے ہیں یہاں برسات میں ہوتے ہیں ہندوستان میں بلبل کا زمزمہ نہیں۔ کوئل کی کوک۔ پپیہے کی ہوک دلوں پر آفت لاتی ہے۔ تالاب بھرے چھلکتے ہیں۔ جھیلیں موجیں مارتی ہیں۔ دریاؤں کے چڑھاؤ۔ مستیاں دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ گل اور لالہ ان دنوں میں نہیں پھولتا۔ مگر چمپا۔ موتیا۔ رائے بیل۔ وغیرہ وغیرہ پھولوں کی خوشبو سے عالم مہک جاتا ہے۔ دلوں پر بھی جو اثر شگفتگی کے

برسات میں ہوتے ہیں بہار میں نہیں ہوتے۔ گھٹا گھنگھور چھائی ہے۔ کبھی مینہ برس رہا ہے کبھی پھوہار پڑتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ بجلیاں چمکتی ہیں۔ مور بولتے ہیں۔ باغوں میں جاتے ہیں پینگیں چڑھتے ہیں۔ آموں کی سیریں ہو رہی ہیں۔ ٹپکا لگا ہوا ہے۔ درختوں میں جھولے پڑے ہیں۔ شاعروں نے بھی جو برسات کے گیتوں میں مزے لئے ہیں۔ وہ بسنت میں نہیں لئے وجہ اس کی یہ ہے کہ قدرتی بہار بسنت کی ہندوستان میں سوائے سرسوں کے اور کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ عمر بھی تھوڑی ہے۔ دو تین ہفتے میں گرمی آتی ہے اور سارا لطف خاک میں ملا دیتی ہے۔ ہند کے انشا پردازوں نے جب کسی باغ کا لطف یا عیش کا سماں باندھا ہے تو اکثر برسات ہی کا موسم لیا ہے۔

ایران ایک قدرتی بہشت ہے وہاں جن چیزوں کی بہتات ہے وہی اُن کے انشا پردازی کا سامان ہے۔ گل۔ بلبل۔ سبزہ۔ شبنم۔ برف۔ اولے۔ مرغزار۔ آب رواں۔ گلشن۔ چمن۔ درخت۔ جوانان چمن۔ مرغان چمن۔ نغمہ سنجان چمن ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ان ترکیبوں میں ہزاروں نازک اور لطیف خیالات ادا کرتے ہیں۔ گلاب کے پھول میں جو زردی ہے اُسے زرِ گل کہتے ہیں۔ گل اپنا خزانہ لٹاتا ہے اور ہنستا ہے۔ مگر غنچہ مٹھی بند کر کے اپنی زرداری پر خوش ہوتا ہے اور مسکراتا ہے۔ شبنم بے ثباتی پر روتی ہے۔ جس طرح بلبل گل کی عاشق ہے۔ قمری سرو کی شیدا ہے۔ اُسکا گیر والباس ہے نغمے لالہ زار ہیں مگر سبزہ بے گانہ ہے۔ زمزموں کی کثرت سے اُس کا نام ہزار داستان۔ ہزار آواز رکھا ہے۔ بیسیوں صفتیں خوشنما اور خوش آیندہ نکالی ہیں۔ مرغ شب خواں خوش آہنگ۔ آتش نوا وغیرہ وغیرہ ایک ایک ترکیب سے کئی کئی مضمون شاعرانہ جداگانہ پیدا کئے ہیں۔ کوہ۔ صحرا۔ مرغزار۔ چشمے۔ آب رواں کہ قدرت کے عجائب خانے ہیں۔ ان سے ہزار در ہزار خیالات زبان میں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔

اہل عرب نے کھجور سے۔ انھوں نے شراب وانگور سے ملکا اُس کی تازگی۔ کھنگی

مستی۔ سیہ مستی۔ بدمستی۔ سرخوشی۔ خمار۔ سرگرانی مے۔ خندۂ جام۔ گریۂ شیشہ۔ قلقل مینا۔ قہقہۂ مینا۔ وغیرہ وغیرہ سے سرور کئے ہیں۔ افغیس کی ہتات ہے کہ انشاپرداز کو اپنے رنگیں مضموں اور استعاروں سے نکلنے نہیں دیتی۔ ایک گل کو دیکھو کتنی عمدہ عمدہ اصطلاحیں رنگی ہیں۔ گل کردن (ظاہر ہونا) گلگشت (گلزار میں پھرنا) گل زمیں۔ (قطعۂ زمیں) گلک (طنز کی بات) وغیرہ سیکڑوں اصطلاحیں ہیں کہاں تک سنوگے۔ آب رواں کی کثرت اور زمین کی شادابی اور سرسبزی سے صدہا نہیں ہزاروں اصطلاحیں اور کنائے سرسبز کئے ہیں۔ فقط آب کی ترکیب سے جو سیراب اور خوشنما معنی پیدا ہوئے ہیں۔ اگر لکھوں تو ایک رسالہ بنتا ہے۔ سبزہ کی خوشنمائی نے اپنی فراوانی کے سبب سے مختلف ترکیبوں میں لہلہاتے معنی پیدا کئے۔ مثلاً گنبد سبز۔ پل سبز۔ دریائے سبز۔ (آسمان) سبز آخور (خوشنمائی میں رہنے والا گھوڑا) سبز بخت (خوش نصیب) سبزکار۔ سبز گر (جو اچھے کام کرے) آنما سبز کردۂ شما ہاستم (تمھارے پرورش کئے ہوئے ہیں ہم) سبز رنگ (سانولا معشوق) سبز۔ گلگونہ۔ اُن کا تعریفی رنگ۔ اور ایک راگ کا بھی نام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا کیا کہوں۔ شیخ نے کہا ہے ؎

پرورند بادش درخت امید سرش سبز درویش پر رحمت سفید

اب تم عرب فارس۔ اور ہندی انشا پردازی تو پہلو بہ پہلو ترتیب دے کر دیکھو۔ ہر ملک کے محاورے اور اصطلاحیں تمھیں بتا رہی ہیں کہ اُس ملک کی کیا حالت ہے۔ سرزمین کی کیا کیفیت ہے؟ آب و ہوا کا کیا عالم ہے؟ پیداواروں کی کیا صورت ہے؟ اور لوگوں کی طبیعتوں پر اُس کا کیا اثر ہے؟ جو زبانوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

تابستاں

گرمی کا موسم آیا۔ رستے برف سے بند پڑے تھے۔ سب کھل گئے۔ کارواں تیار ہوئے

سوداگروں نے دساور باندھے۔ کاریگروں کے کارخانے جاری ہوئے۔ درختوں پر میوے دانے ہرے دکھائی دینے لگے۔ پہاڑوں پر برفیں پگھلتی ہیں۔ جہاں باقی ہیں سبز مخمل پر سفید چادریں بچھی ہیں۔ چشمے بہ نکلتے ہیں۔ دریا چڑھاؤ پر آکر زور شور دکھاتے ہیں اور موجیں مارتے چلے جاتے ہیں۔ نہریں بہتی ہیں۔ پانی کی چادریں اس زور سے گرتی ہیں کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی جگہ جگہ پن چکیاں چلنے لگتی ہیں۔ پانی آگے بڑھ کر آبادیوں میں آتے ہیں۔ گھر گھر گنگا بہتی ہے۔ کھیتیاں دھوپ کی گرمی سے روز روز زرد ہوتی ہیں۔ ہوا کی قدرتی خشکی دنوں کی جگہ گھڑیوں میں سُکھاتی ہے۔ اور جھٹ پٹ کاٹنے کے قابل کر دیتی ہے۔ باہر کسان کھیت کاٹ اناج نکال کر ٹھکانے لگاتے ہیں۔ اب چند روز دَم لیتے ہیں۔ اور زمین کو بھی دم لینے دیتے ہیں کہ آیندہ فصل کے مسافروں کے لئے تازہ دَم ہو جائے۔

باغوں میں میوے پک کر تیار ہو جاتے ہیں۔ بازاروں میں باسلیقہ دُکاندار ایسی خوبصورتی سے دُکانیں سجاتے ہیں گویا نعمتِ الٰہی کا نگار خانہ کُھلا۔ سیب۔ ناسپاتی بہی۔ انگور۔ رنگا رنگ بو قلموں۔ گھروں میں کوئی گھر خالی نہیں۔ دُو دُو چار چار قسم کے درخت موجود ہیں۔ آپ میوے توڑتے ہیں کھاتے ہیں کھلاتے ہیں۔ اور باغ والوں کے گھروں میں باغوں سے کٹ کر میوے آتے ہیں۔ میوہ خانے کے حُجروں میں۔ انگور۔ خربوزے۔ تربوز۔ لٹکاتے ہیں کہ قندیلیں۔ قمقمے نظر آتے ہیں۔ سیب۔ بہی۔ ناسپاتیاں اتنی ہوتی ہیں کہ دُنبے اور بکریاں بھی نہیں کھا سکتیں۔ زمین کھود کھود کر ایک ایک تہ بھُس کی دیتے جاتے ہیں۔ اور تہ بہ تہ جماتے جاتے ہیں۔ ہوا کی لطافت اور پاکیزگی یہ ہے کہ سڑنے نہیں دیتی بلکہ پرورش کرتی ہے۔ گرم ملکوں کے لوگ اپنے اپنے اجناس لے کر ٹھنڈے ملکوں کی طرف بیچنے کو نکل جاتے ہیں۔ کیونکہ سیاحت وہاں کی فقط وہاں کی رسم ملکی ہی نہیں۔ باعثِ زندگی ہو گئی ہے۔

شہروں میں بازار گرم ہوتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ سے رونق ہو جاتی ہے۔ جا بجا مرزا منش خوش پوشاک۔ خوش وضع۔ خوبصورت خوبصورت لوگ پھرتے ہیں۔

گرمی کا موسم اِس ولایت میں بند کاموں کو کھولتا ہے۔ منافع کو پھیلاتا ہے۔ اور عموماً گرمی آسائش اور آرام کا سامان ہے۔ دیکھو! اسی واسطے لفظِ گرم نے مختلف لفظوں کے ساتھ ترکیب پاکر خوبی و خوشنمائی یا تیزی اور شوخی پیدا کی ہے۔ مثلاً حُسنِ گرم۔ شعر گرم۔ گرم نفس (صاحب تاثیر آدمی) گرم صحبت (جوشِ محبت والا۔ گرمیِ ہنگامہ۔ گرمیِ بازار۔ گرمیِ صحبت۔ گرمیِ اختلاط۔ گرم کردنِ نظر (حُسن یا خوشنما چیز سے نظر کا لطف اٹھانا) گرم کردنِ دماغ۔ گرمیِ گفتار۔ گرمیِ رفتار وغیرہ بیسیوں محاورے پیدا ہو گئے ہیں کہ معنوں میں لطف۔ شوخی یا زور بڑھاتے ہیں۔

اگرچہ وہاں کی گرمی ایسی ہے جیسے یہاں کا گلابی جاڑا۔ لیکن اکثر گرم میوے اور دُنبے کے گوشت کھاتے ہیں۔ یخنیاں اور چائیں پیتے ہیں۔ اس لئے مزاجوں کو گرمی کی برداشت نہیں۔ تھوڑی دیر چلتے پھرتے ہیں پسینے پسینے ہو جاتے ہیں۔ دوکاندار پہاڑوں میں سے برف ڈھیمے کے ڈھیمے کاٹ کر لاتے ہیں۔ فالودے کی دُکانیں سجاتے ہیں۔ تم نے پیسا دو پیسے دئے۔ اُس نے کٹورے میں تھوڑا شربت انگور تھوڑا برف کا لچھا ڈالا اور حوالے کیا۔ جام از دستش گرفتیم و بسر کشیدیم۔ شکرِ خدا کردیم و راہِ خود گرفتیم۔

بہر حال الفاظِ مذکورۂ بالا کی ترکیبوں کو دیکھو اور سمجھو کہ وہ کیونکر ملک کی حالت بتاتے ہیں۔ یا یہ کہو کہ ملک کی حالت نے محاورات مذکورہ پیدا کر دئے۔

پائیز

آفتاب میزان میں آیا۔ جاڑے کا پیام لایا۔ یخ بندیاں شروع ہو گئیں۔ پہاڑوں پر چشمے بند ہو گئے۔ دریا اُترنے لگے۔ نہریں سوکھنے لگیں۔ کہیں پانی ہے تو اتنا کہ اوپر انگل دو انگل برف کی پپڑی۔ نیچے پانی بہتا چلا جاتا ہے۔ اوّل اوّل پپڑی کو مکا مار کر توڑا۔ پانی

بھر کرے گئے۔ پھر محلوں میں حوض بھر لیتے ہیں۔ وہ سب یخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اُن سے
اور آب انباروں کے پانی سے کام چلتے ہیں
یخ بندیاں دیکھتے ہی کسان زمینیں جوت کر بیج بو دیتے ہیں۔ اسی عرصے میں
برف کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ سب کھیتوں اور باغوں کو چھوڑ کر گھروں کا رُخ
کرتے ہیں۔ جو بیج بوئے تھے خدا کے سپرد یا برف کے حوالے۔ وہ قدرتی دائی
آپ ہی بچے نکالے گی۔ آپ ہی پالے گی۔
عزیزانِ وطن! جب تک ممالکِ سردسیر میں رہ کر موسموں کی حالتیں آنکھوں
سے نہ دیکھی ہوں۔ اکثر کتابوں کے خاص خاص مقاموں کا مزا نہیں آتا۔ بلکہ سمجھ میں نہیں
آتے۔ کوئی کیا جانے ع کدیور شد از باغ بر خاستہ، کا کیا مطلب ہے۔ اور موسم
خزاں میں کھیتوں اور باغوں میں اُداسی کا کیا عالم ہوتا ہے۔ غرض باہر کے کام
والے شہروں میں آئے۔ پوستینیں۔ لحاف۔ توشک۔ انگیٹھیاں۔ آتشدان گھر گھر
موجود ہیں۔ ضروری سامانوں کے ذخیرے بھرے ہیں میوہ خانوں میں تر و خشک میوے
دھرے ہیں۔ دُنبے کے دُنبے ٹُلمہ کئے ہیں۔ اور نمک سود کر کے لٹکا دئے ہیں۔ گوشت قاق
تیار ہیں یخنیاں اور شبدیگیں پکائیں گے۔ پلاؤ دم دیں گے۔ اور گھروں میں بیٹھے کھائینگے
اتنے میں ہوا جاڑے کی سواری لائی۔ سنّاٹے چلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے کیا باغ کیا
جنگل تمام درخت زرد ہو گئے۔ اور زردی بھی وہ کہ گویا عالم زعفرانی ہو گیا۔ اور
بعض درختوں کے پتّے تو سرتاپا ایسے سرخ ہو جاتے ہیں جیسے تپا یا ہوا تانبا۔ میں
ایک دن دیوانِ انوری پڑھ رہا تھا۔ ایک قصیدے کے دعائیہ میں دو شعر آئے سہ

تا ہوائے خزاں بہ بہمن و دے — زرگرِ باغ و بوستاں باشد
باغ ملکِ ترا بہار سے باد — نہ چناں کز پئش خزاں باشد

ایک طالب علم نے پوچھا کہ خزاں کو زرگر کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ جب میں نے اُس کے

سامنے کیفیتِ مذکورہ کا رنگ دکھایا تو اُس کے چہرے پر سمجھ کا رنگ چمکا۔ خاقانی نے بھی اسی مضمون کا رنگ دیا ہے۔ ؎

سحی ہنگامِ درویشی فزدں تر کُن کہ شاخِ رز — چو درویش از خزاں گردد فزوں گردد زر افشانش

پہلے مصرع میں شاخِ رز۔ شاخِ انگور ہے۔ اور زر افشانی اُس کی برگ ریزی ہے۔ فصلِ خزاں میں بہرحال ایسے مضامین بار بار میرے اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ کسی زبان کا شائق جب تک برس دو برس تک خود اُس ملک میں جاکر نہ رہے گا تب تک نہ رمزِ سخن کو پاسکے گا۔ نہ زبان کا لطف حاصل کرسکے گا۔

زمستاں

دفعتہً ہوا بند ہوئی۔ ابر سا گھر آیا۔ دُنیا دھواں دھار ہوگئی۔ پھر سفید غبار سا برستا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر کوٹھوں پر دیواروں اور مُنڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا۔ رات گزری۔ صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور۔ اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتّے کا نام نہیں۔ جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتّوں سے بھرے تھے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں۔ جیسے کسی نے کپڑے اُتار لئے۔ وہ بھی سیاہ رنگ جیسے بجلی مارا لوہا۔ ایک دو دن بعد برف برسنی شروع ہوئی مگر کس طرح؟ جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا روئی دُھنک رہا ہے۔ ایک دن رات جو برف کا تار لگا تو در و دیوار۔ زمین۔ آسمان تمام سفید۔ وہ سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلّور کے درخت اور شیشے کی شاخیں ہوگئیں۔ دیکھنا۔ انشا پردازی نے کیونکر جغرافیہ ملک کا نقشہ کھینچا ہے۔ ؎

بر آمد زکوہ ابرِ کافور بار — مزاجِ زمیں گشت کافور خوار

اور شیخ سعدی نے ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ دیا۔ "چہ حرام زادہ مرد ماتند کہ سنگہا را

بستہ اند و سنگ ہا راکشادہ۔"
پہاڑوں پر برف کے پہاڑ چڑھ گئے۔ جنگلوں میں برف سے رستے رُک گئے۔ سوداگر جہاں کے تہاں بیٹھ رہے۔ میدان، کھیت، گلی، کوچے میں، گھر گھر قدِ آدم برفیں چڑھ گئیں۔ بازاروں میں سناٹا۔ کارخانے بند۔ غریب کاریگروں کے کاروبار اُن کے ہاتھوں سے بھی سوا ٹھنڈے۔ کوٹھوں پر برف کے انبار ہیں۔ جلدی گرا نہیں تو گھر بیٹھا۔ اُمرا کے غلام۔ نوکر۔ مزدور۔ لکڑی کے پنج شاخے اور پھاوڑے لیے ہیں۔ برف گرا رہے ہیں غریب غربا اپنا کام آپ ہی کرتے ہیں۔ پھر گھروں میں آ گھسے ہیں۔ آگ بغیر گزارہ نہیں۔ انگیٹھی بیچ میں لے بیٹھتے ہیں۔ جن کو خدا نے دیا ہے اُن کے ہاں آتشدان اور بخاریاں روشن ہوتی ہیں۔ کمروں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ وہ گھروں میں دُنبے کاٹتے ہیں۔ مرغ ذبح کرتے ہیں۔ نہیں تو گوشت قاق کے پلاؤ دَم دیتے ہیں۔ اُس کی یخنیاں پیتے ہیں۔ کلّے پائے اور شبدیگیں پکا پکا کر کھاتے ہیں۔ اور چائیں اُڑاتے ہیں۔ لیکن باہر تمام عالم ویرانہ ہے۔ کھیت اور باغ سب سنسان۔ گیدڑ۔ لومڑی۔ خرگوش بلکہ چوہا تک جنگل میں نظر نہیں آتا۔ اپنے اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھس رہتے ہیں۔ اُس وقت نظامی کا دیباچہ اور اُس کے خزاں کے مضمون مزا دیتے ہیں۔
گرگ آشتی بھیڑیوں کو اس موسم میں سخت مشکل ہوتی ہے۔ وہ گوشت کے سوا اور کچھ کھاتے نہیں۔ اور کسی قسم کا ذخیرہ رکھتے نہیں۔ باہر برف کی کثرت سے کتا تک نہیں نظر آتا۔ گلّے سب بند ہو جاتے ہیں۔ یہ دس دس بیس بیس جمع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر ہر بھیڑیا اس طرح بیٹھتا ہے کہ اُس کی آنکھ سب پر پڑے۔ ہر چند بھوک۔ پیاس۔ تھکن سے تنگ ہوتے ہیں مگر ایک کو دوسرے پر اعتبار نہیں۔ اس لئے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ آخر نیند تو ظالم ہے کسی کی آنکھ جھپکی اور

جتنے بیٹھے تھے جھٹ اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فوراً پھاڑ چیر تکا بوٹی کرکے کھا ہی جاتے ہیں۔ اسی سے اہل ملک نے اصطلاح نکالی ہے گرگ آشتی۔ یعنی اس بدذات جانور کے ملاپ کا بھی اعتبار نہیں۔

ملک کے لوگ اسی برف کے کیڑے ہیں۔ اُنھیں یہ سردی کچھ بہت دکھ نہیں دیتی۔ اس لئے بازار چلتے رہتے ہیں۔ حاجت مند بچارے یا اکثر مصیبت کے مارے سفر بھی کرتے ہیں۔ اُن کے نمدی چغوں پر برف پڑی ہوئی۔ پلکوں پر برف جمی ہوئی موچھیں اور ڈاڑھی میں گویا شیشے کی سلائیاں لٹکتی ہیں۔ اس عالم میں پرند جانور بھی کم نکلتے ہیں۔ البتہ خاص قسم کے کوّے۔ اور بعض بعض اور جانور اُڑتے پھرتے ہیں۔ اُن کی پیٹھ اور بازوؤں پر برف جمی ہوتی ہے۔ اُس وقت نظامی کی تشبیہ کا مزا آتا ہے ع مرا برف بارید بر پرِّ زاغ۔ اور انہی کو مزا بھی آتا ہے جن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب چیزیں ہیں۔ کیونکہ تشبیہ اور استعارہ جتنا قریب کا ہو اُتنا ہی قریب الفہم ہوتا ہے۔ اسی واسطے زیادہ مزا دیتا ہے۔ اس حالت میں کبھی جھکڑ چلنے لگتا ہے۔ اور جو برف پڑی ہوئی تھی وہ خاک کی طرح اڑتی ہے۔ بدن اور چہرے پر چھرّے کا کام کرتی ہے۔ اور کوئی ذرّہ آنکھ میں پڑ جاتا ہے تو بڑی تکلیف دیتا ہے۔ اسے دُوروبہ کہتے ہیں۔

ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اُسی ملک میں تھا۔ برفیں پڑ رہی تھیں دو مہینے برابر سفر کرنا پڑا۔ دریائے سیحوں رستے میں ملا۔ اس پار سے اُس پار تک ایک تختہ آئینے کا تھا۔ شتری اور راہی قافلے پیادہ اور سوار برابر چلے جاتے تھے۔ میں ایک بلند کنارے پر کھڑا دیکھتا تھا۔ چیونٹیوں کی سی قطار عجب بہار دیتی تھی۔ رستے میں کئی منزلیں ایسی ہیں کہ جہاں سرا یا مکان کچھ نہ تھا کہ جس میں ذرا سر تو چھپا بیٹھیں۔ زمین پر کمر کمر برف چڑھی تھی اور اِدھر اُدھر پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے۔

ہم نے ایک پتھر کی آڑ میں برف ہٹا کر زمین نکالی۔ اِدھر اُدھر سے دو چار لکڑ گھسیٹ لائے اُن میں آگ سلگائی۔ بستر کر کے پڑے اور گٹھری ہو کر سکڑ رہے۔ غنیمت یہ ہے کہ رات کو ہوا بند ہوتی ہے۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے بعد اُٹھ کر چائے بناتے۔ ایک ایک پیالی پی کر سینے گرم کرتے۔ اور پھر پڑ رہتے خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔

لطیفہ۔ جاڑے کا موسم زور پر تھا۔ ایک قلندر مشرب کے پاس جاڑے کا کپڑا کچھ نہ تھا۔ سردی کے مارے مرنے لگا۔ کسی سے پوچھا غضب سردی ہے۔ آفتاب کس برج میں ہے۔ اُس نے کہا "عقرب میں"۔ قلندر نے کہا کہ "خدا کی لعنت عقرب پر۔ زمین پر بھی دُکھ۔ آسمان پر بھی دُکھ"۔ تم نے دیکھ لیا جب آفتاب عقرب میں ہوتا ہے تو عین جاڑے کی جوانی ہوتی ہے۔ وہاں ہاتھ پاؤں باہر نہیں نکال سکتے۔ یہاں اُن دنوں میں ایک چادرے کا جاڑا ہوتا ہے۔ اس خیال کا لطیفہ پیدا ہوگا تو اسی ملک میں پیدا ہوگا۔ اس ملک کے لوگ سنتے ہیں چپکے ہو رہتے ہیں۔

زبان اپنی اصطلاحوں یا استعاروں کے علاوہ ادائے مطالب میں بھی ملک کے موسم سے آگاہ کرتی ہے۔ دیکھو فصیح فارس اپنی مضمون آفرینی میں ملک کی سردی کو کس طرح دکھاتا ہے؟ ؎

عجب جائیست ایں کاخِ دل آویز   کہ چوں جا گرم کردی گفت برخیز

جب تم تھوڑی دیر کہیں بیٹھتے ہو تو جگہ گرم ہو جاتی ہے۔ گرم ملک میں ٹھنڈی جگہ پر بیٹھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ٹھنڈے ملک میں گرم جگہ پر بیٹھنے سے آرام آتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ دنیا عجب مقام ہے۔ جہاں ذرا آرام سے بیٹھنے کا موقع آیا اور حکم ہوا کہ اُٹھ کھڑے ہو۔

آگ ایسے موقع پر فقط باعثِ آرام نہیں بلکہ چشمہ بہت سے منافع کا ہوتی ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ اکثر موقع پر باعث زندگی ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انشا نے

فارسی نے اس سے بیسیوں لفظ ترکیب دئے ہیں جن سے تیزی، چستی، رونق، قدر و مرتبہ وغیرہ کے خیالات روشن ہوتے ہیں۔ مثلاً آتش زبان۔ آتش بیان۔ آتش سخن (تیز کلام آدمی) آتش مزاج (تیز مزاج) آتش کار (چالاک) آتش لباس (سرخ لباس) آتش و آب۔ آتش آب پرور۔ آتش مجسّم (تلوار) آتش پُر آب۔ آتش بے باد۔ آتش تو بہ سوز۔ آتش سرد۔ (شراب) آتش بے دود (سورج۔ شراب۔ غصہ) آتش پیکر۔ آتش زمزم۔ آتش بید (سورج) آتش ہندی (تیغ ہندی) وغیرہ وغیرہ بیسیوں لفظ ہیں کہ خوبی معنی سے مختلف کاموں اور مختلف چیزوں میں رونق اور خوبی پیدا کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ "گائے وغیرہ بہت سی مفید چیزیں جو انسان کی آسایش اور زندگی میں مدد دیتی ہیں ہندوؤں میں واجب التعظیم ہوئیں۔ یہاں تک کہ لوگ رفتہ رفتہ انھیں دیوتا ماننے لگے۔ کیا عجب ہے کہ آگ سے اُن ملکوں میں بہت تکلیفیں رفع ہوتی تھیں اور اکثر قسم کے فائدے حاصل ہوتے تھے۔ شاید اوّل تعظیم کے لئے حکم ہوا ہو پھر رفتہ رفتہ عبادت ہونے لگی"۔

برخلاف اس کے سردی سے لوگوں کے کاروبار رُک جاتے ہیں۔ فوائد میں نقصان آتے ہیں۔ پھرتے چلتے۔ بیٹھتے اُٹھتے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جن الفاظ سے سردی ترکیب پاتی ہے معنوں میں بھی کمی۔ بے لطفی اور خرابی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً وعدۂ سرد۔ گریۂ سرد۔ آہ سرد۔ نازخنک۔ نوائے خنک۔ گفتار خنک۔ سرد شدن اختلاط (کمی محبت) سرد حرف۔ سرد بیاں۔ سرد گو۔ سرد مہر۔ سرد نفس۔ سرد رو۔ خنک طبع۔ خنک ادا۔ خنک گفتار۔ خنک روے۔ وغیرہ وغیرہ بہت سے الفاظ ہیں۔ برخلاف اس کے عرب کا ملک گرم ہے۔ اسی واسطے سردی سب کو عزیز ہے۔

زبان ایران یہ بھی کہتی ہے کہ میری سرزمین تمام کوہستان ہے جو بے شمار

خلقت سے آباد ہے۔ یہی سبب ہے کہ پہاڑ کے متعلق بہت سے محاورے استعارے اور خیالات ان کی انشا پردازی میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کوہ پشت (کوزپشت کو کہتے ہیں اُس کے کُب کی شباہت کے سبب سے) کوہِ جگر (شجاع) کوہِ آب (موج آب) اسے اپنے دریا اور نہر کی لہریں نہ سمجھو۔ سمندر اور اس کے طوفانوں کی طرف خیال کرو اور عموماً بلندی کا اشارہ بھی اسی لفظ سے کرتے ہیں۔ مثلاً کوہہ زمین یا پیش کوہہ اور پس کوہہ۔ یعنی اُس کے آگے کی بلندی اور پیچھے کی بلندی۔ فصیح فارس اپنے سردں میں آتا ہے تو کہتا ہے "درعالمے کہ کوہ بنگ از سر بریدہ بود۔ کبھی کہتا ہے "کوہ تا کوہ بنگ از سر بریدہ بود۔ اور۔ کوہ کوہ کیف از سر مے گذشت" یہ استعارے بھی ملک کی سرسبزیوں نے زبان کو دئے ہیں۔

پہاڑ کے مختلف حصوں کے نام اس کی صورتِ حال کے بموجب تراشے ہیں اور ضرور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ وہیں کا رہنا سہنا ہے۔ کام۔ کاج۔ آنے جانے ہیں۔ اور ہر موقع کا اُتا پتا بتاتے ہیں۔ جدا جدا جگہ کے واسطے جدا جدا نام چاہئیے ہیں۔ اس سے زبان کی وسعت معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کاروبار میں ہرج ہوتے۔ مثلاً کمر کوہ۔ دامن کوہ۔ تیزی کوہ۔ تیغ کوہ۔ بینی کوہ۔ قلّہ کوہ۔ درہ کوہ۔ کوہ پایہ۔ اسی صورت حال کو اور موسم کی کیفیت کو دیکھ کر ملک کے شاعر نے کہا ہے

بر آمد ز کوہ ابر کافور بار مزاجِ زمیں گشت کافور خوار

سعدی

آفتاب از کوہ سر برمے زند ماہِ من انگشت بردمے زند

مُلّا محتشم کاشی نے مرثیے میں کہا ہے

چوں شد بہ نوک نیزہ سرِ آں بزرگوار خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار

دیکھو! وہ ایک صاحبِ زبان کا خیال تھا۔ جو کہ خالص خیال بند تھا۔ میر انیس مرحوم ہند

کے شاعر تھے انھوں نے اسی خیال کو رنگین کیا ہے

تھا بسکہ روز قتل شہِ آسماں جناب　　نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب

اور کسی اہلِ زبان نے بڑھاپے کے سر کو دیکھ کر کہا۔ آفتاب بر سر کوہ است۔ یاد کرو شعر مذکورۂ بالا۔ ع مرا برف بارید بر پر زاغ ✣ تم نے دیکھا اس طرح ایک زبان بتاتی ہے کہ میرے بولنے والے کن خیالات کے لوگ ہیں؟ اور میں کس ملک کا سبزۂ خودرو ہوں؟۔

اگرچہ چار موسم اپنا اپنا لطف جدا جدا رنگوں میں دکھاتے ہیں مگر عموماً ہر موسم میں زمین سرسبز اور شاداب ہی دکھائی دیتی ہے۔ خشک یا شور زار قطعہ بہت کم نظر آتا ہے۔ جدھر دیکھو ہریاول لہلہاتی ہے۔ اور سبزہ ہوا سے پانی کی طرح لہریں مارتا ہے۔ سبزی جتنی تیز ہے اس سے سوا جگر بیز ہے۔ درخت جتنے ہرے ہیں اس سے زیادہ پھولے پھلے ہیں۔ جو ہوا آتی ہے صبا ہے یا نسیم ہے۔ بو آتی ہے تو نکہت ہے یا شمیم ہے۔ آسمان بھی یہ آسمان نہیں۔ جب دیکھو رنگ نکھرا ہوا ہے۔ اُسی کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ چرخ فیروزی۔ چرخ مینائی۔ فلک مینا رنگ۔ چرخ آئینہ فام۔ آبگوں۔ آبگینہ رنگ۔ چرخ نیلی چرخ نیلگوں۔ گوئے لاجورد۔ اور گنبد لاجوردی۔ حق پوچھو تو یہ الفاظ اسی آسمان کے لئے زیبا ہیں نہ کہ فلک ہند جس کے نیچے سدا خاک اُڑے۔

بلبل ہزار داستان کا زمزمہ اور تذرو کا قہقہہ ناحق مشہور ہو گیا ہے۔ وہاں ہزاروں جانور ہیں۔ جو ہے اپنی اپنی ٹہنی پر بلبل اور آشیانے پر ہزار داستان ہی ہے۔ خوش رنگ ایسے ہیں کہ شوخی آنکھوں کو قوت دیتی ہے۔ وہاں کی چڑیا کا رنگ بھی ڈھڑتا ہے۔ نہ کہ ہندوستان کی چڑیا جس کے بھورے رنگ سے خاک جھڑتی ہے۔ چرندوں کو دیکھو تو غزال و آہو۔ ہرنیاں۔ گوزن۔ گورخر۔ نیلہ گاؤ وغیرہ خوشنما جانور دامن دشت اور دامن کوہ میں قلانچیں مارتے پھرتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ نے کیا کہا ہے اور کس عالم میں کہا ہے؟ ہے

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را　　کہ سر بہ کوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

پہاڑوں کے چشمے میدانوں میں نہریں بہلتے ہیں۔ اور شہروں میں پانی پہنچاتے ہیں۔ گھر گھر گنگا بہ رہی ہے۔ کوئی مکان ایسا نہیں جہاں پانی جاری نہ ہو۔ ان کی انشاپردازی سے ٹپکتا ہے کہ قدرتی خوشنمائیاں ہر وقت سامنے ہیں۔ اور وہی لوگ ہیں کہ مزے لے لے کر ان پہاڑوں کے لطف اٹھاتے ہیں۔ شستہ الفاظ عمدہ ترکیبیں۔ لطیف اشتقاق۔ نازک خیالات۔ پاک تشبیہیں اور استعارے تراشتے ہیں۔ مثلاً آبرو و عزت آبش از سرگذشتہ است (خرابی حد تدارک سے گذر گئی ہے) تنک آب (کم ظرف) تم نے بھی اکثر برسات میں دیکھا ہوگا۔ میدان میں پانی پھیلا ہوتا ہے۔ تم ایک ہری گھاس پر قدم رکھتے ہو کہ نیچے زمین ہے۔ پانوں رکھا تو غڑپ پانی میں جا پڑا۔ اسی واسطے جس شخص کا ظاہر خوشنما اور باطن خراب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔ "آب زیر کاہ است" پانی کی بہتات نے بہت سے عمدہ وصف اپنے موصوفوں کے لئے پیدا کئے۔ اور انشاپرداز نے کہا شعر تر۔ نغمۂ تر (مزے دار شعر یا نغمہ) گوہر تر (آبدار موتی) تر دست (صنعت گر کامل یا سخی) تر زبان (فصیح) وغیرہ وغیرہ۔

پانی کی مختلف حالتوں اور کاموں کے سبب سے بہت کہاوتیں نکل آئیں۔ مثلاً آب آمد تیمم برخاست۔ آب ندیدہ موزہ از پا کشیدہ وغیرہ وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی کثرت نے انھیں قدرتی چشموں کی طرح زبان سے جاری کیا ہے جس سے ہماری طبیعتیں بالکل محروم ہیں۔ بابر نے اپنی توزک میں یہ نکتہ خوب کھولا۔ لکھتا ہے "اہل ہند کے دل ان کیفیتوں سے ایسے بے مذاق ہیں کہ اگر سیر و سفر میں ہوں اور اتفاقاً آب رواں کے کنارے آن اتریں تو ادھر خیمے کی پشت کرتے ہیں۔"

وہ شگفتہ مزاج لوگ اپنے دلوں کو ہمیشہ انھی گلزاروں میں شگفتہ رکھتے ہیں۔ اسی واسطے طبیعت بات بات میں شگفتگی دکھائی رہتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ خوشی نے اپنے اصلی معنوں سے بڑھ کر بہت سے معنوں پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ کباب خوش نمک۔ اور طعام خوش نمک (جس میں اعتدال سے نمک ہو) اور خوب اور اچھا۔ خوش انگشت۔ خوش نواز (اچھا ستار بجانے والا) گوہر خوش آب۔ خوشنما۔ خوش جلا۔ خوش نظر۔ خوش طینت۔ خوش نہار۔ خوش رو۔ اسی طرح شاداب۔ شادکام۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی بیسیوں ترکیبیں ہیں۔

لطیفہ۔ شاہِ طہماسپ کے حضور میں حکیم حسن گیلانی اول روز باریاب ہوا نو نوجوان اور نہایت حسین تھا۔ بادشاہ نے حال پوچھا اور مسکرا کر کہا ع خوش طبیبے است بیا تا ہمہ بیمار شویم + اور کثرت کے معنی بھی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ مرد خوش برگ (بسیار ساماں) درخت خوش ثمر۔ باغ خوش حاصل۔ زمین خوش حاصل۔ یہیں وہی لطف پیدا ہوتا ہے۔ خوش سواد۔ خوش معاملہ اور یہی معنی دیتا ہے۔ خوش غلاف۔ وہ تلوار کہ ذرا سے اشارے میں میان سے نکل آئے۔

خرّم۔ مرکب ہے خور۔ رم سے۔ اس کے معنی سرسبز و شاداب کے ہو گئے اسی سے عہد قدیم میں خرّم روز ایک عید کا نام تھا۔ پھر خورم گاہ۔ اور مکان خورم۔ فضائے خورم۔ گلستان خورم۔ اور خورم روے (خوبصورت) وغیرہ وغیرہ بہت سی ترکیبیں پیدا کیں۔ اور اسی طرح شگفتہ رو۔ شگفتہ مزاج۔ شگفتہ طبع۔ شگفتہ کلام۔ اور زمین شگفتہ۔ اور جبین شگفتہ۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان میں اس کے مقابل میں صبح بنارس۔ اور شام اودھ ہے۔ غریب سے غریب ہوگا گر گھر میں ہوگا تو گھر کو قدرتی سنگاروں سے سجائے گا۔ باہر جائیگا تو آب رواں کی سیر اور گلگشت سے جی بہلائے گا۔ لفظ گلگشت کی ترکیب دلالت کرتی ہے کہ ان کی چہل قدمی گلزاروں میں واقع ہوتی ہے۔ یہی شگفتگی ان کے مزاجوں کو شگفتہ رکھتی ہے کہ ہفتے دو ہفتے بعد مُلّا۔ شاعر۔ سوداگر۔ پیشہ ور۔ غرض اپنے اپنے ڈھنگ کے

ہم طبع اور ہم نفس باغوں میں جاتے ہیں گھروں سے سامان لے جاتے ہیں۔ درختوں کے نیچے آب رواں کے کنارے چبوترے بنے ہوتے ہیں اُن پر یا جہاں موقع کی جگہ پاتے ہیں فرش بچھاتے ہیں۔ سامنے مرغزار ہیں۔ دامن کوہ لالہ و گل سے بھرے ہیں پہلو میں پلاؤ دم ہو رہا ہے۔ ایک طرف کباب لگے ہوئے۔ چائے کی پیالی چل رہی ہے شعر خوانیاں ہو رہی ہیں۔ زمزمے اُڑ رہے ہیں۔ دو تین دن زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

جن لوگوں نے دامن کوہ نہ دیکھا۔ اُس میں چشمے کا رساؤ نہ دیکھا۔ دامن صحرا میں بہاؤ نہ دیکھا انھیں کیا مزا آئے گا کہ اشک کا آنکھ سے بہنا اور چشمے سے پانی کا رِسنا کیسی تشبیہ ہوئی؟۔

میوؤں کی آبداری اور شادابی کا یہ عالم ہے کہ مُنھ میں ڈالو تو شربت ہوئے جاتے ہیں۔ بھوک کا نام نہیں۔ خربوزہ کاٹو تو شیرہ و شربت پڑا بہتا ہے۔ نزاکت کا یہ حال ہے کہ پکی ہوئی فالیز کے برابر سے سوار گھوڑا مارے ہوئے نکلتا ہے تو دہقاں بچارا ہاتھ باندھے دوڑا آتا ہے کہ برائے خدا گھوڑا نہ دوڑاؤ۔ دھمک سے میرے خربوزے پھٹ جائینگے انگور کے خوشے جب درخت سے کاٹتے ہیں تو دانے پھوٹ پھوٹ کر رس کے سرلے بہتے ہیں۔ وہاں کے چقندر یہاں کے شلجموں سے بڑے ہوتے ہیں۔ جوش کر لیتے ہیں یا بھوبل میں دبا دیتے ہیں صبح کو چنگیریوں میں رکھکر گلی کوچوں میں پھانکیں کاٹ کاٹ کر بیچتے ہیں۔ مٹھاس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے عرق کا قند بناتے ہیں۔ سفیدی میں برف اور لطافت میں ہمارے قند سے بہتر ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی کلھاڑیاں ہوتی ہیں ان سے توڑتے ہیں۔ رات کے وقت اُس پر چوٹ لگاتے ہیں تو آگ کے پتنگے اُڑتے ہیں اسی بنیاد پر صدہا محاورے اور اصطلاحیں شیرینی کی پیدا ہو گئی ہیں۔ ہر ایک نایاب اور خوشنما اور خوش آیندہ چیز کو شیریں کہتے ہیں۔ خوش حرکات۔ اور خوش مزاج بچے کو

کہتے ہیں۔ عجب بچہ شیریں است۔ اور خواب شیریں یا میٹھی نیند۔ اور شیریں حرکات شیریں کار شیریں ادا شیریں کلام۔ شیریں مقال وغیرہ بہت سی ترکیبیں پیدا کی ہیں۔ زبان میں مہارت پیدا کرو اور اہل زبان کے کلام پر عبور کرو۔ پھر ان بیانوں کو ان سے مطابقت دو تو لطف حاصل ہو۔

اُس ملک کا نگار خانۂ قدرت کہیں یا صنعت خانۂ الٰہی سمجھیں۔ قلمدان میں جس قدر آب و رنگ الفاظ و عبارت کے تھے اس کے نقشے میں لگا دئے مگر دل کا ارمان نہیں نکلا۔ خیر مجھے ملک۔ زبان ملک سے تعلق دکھانا ہے۔ اس کے لئے اتنا کافی ہے۔ اب اس نقشے کو لپیٹنا چاہیئے۔ (مولوی محمد حسین آزاد۔ از سخندان فارس)

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی

آپ یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی۔ کوچۂ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے ۱۸۴۴ء میں جبکہ آپکی عمر ۱۲ سال کی تھی آپ دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہوئے یہاں سے علحدہ ہونے کے بعد آپ آگرہ کالج میں اُردو زبان کی تعلیم کیلئے مامور ہوئے۔ لاہور اور آگرے میں ملازمت کا زمانہ ۷ سال تک گذرا۔ ۱۸۵۵ء میں آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر اضلاع مراد آباد و بلند شہر میں رہے۔ ۱۱ سال تک اس عہدے پر رہ کر نہایت عمدگی سے کام کو انجام دیتے رہے۔ ۱۸۶۹ء میں دہلی نارمل اسکول کی صدر مدرسی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۳ سال تک اس عہدے پر رہے۔ وہاں سے الٰہ آباد میور سنٹرل کالج میں تشریف لائے۔ ۱۵ سال تک اس کالج میں ایم۔ اے تک عربی فارسی کا درس دیتے رہے۔ ۳۷ سال کی ملازمت کے بعد آپ پنشن لیکر علحدہ ہوئے۔ ۲۴ سال تک وظیفے سے مستفید ہونیکے بعد ۷۔ نومبر ۱۸۹۱ء کو ۶۲ برس کی عمر میں دہلی میں وفات پائی۔

اردو زبان کی جس قدر خدمت آپ نے کی ہے۔ کسی نے کم کی ہوگی۔ تہذیب الاخلاق انسٹیٹیوٹ گزٹ۔ مخزن۔ زمانہ۔ خاتون وغیرہ مختلف پرچوں میں آپ کے مضامین اکثر نکلتے رہے۔ آخر دم تک آپکی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ علوم ریاضیہ و طبعیات میں آپ کو خاص مہارت تھی۔ ان علوم کا ایک عمدہ ذخیرہ آپ نے اُردو زبان میں جمع کر کے ایک سلسلہ قایم کر دیا

جو کئی شخصوں کی محنت سے باہر تھا۔ ریاضیات۔ تاریخ جغرافیہ علم ادب۔ علم اخلاق طبیعیات وہیئت۔ سیاست مُدن میں آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۴۳ ہیں۔ آپ کی کتابوں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر تاریخ ہندوستان۔ تاریخ برٹش گورنمنٹ۔ سوانح عمری ملکہ معظمہ وغیرہ ہیں۔ سلسلۂ ریاضیات کے صلے میں آپ کو برٹش گورنمنٹ سے پندرہ سَو روپیہ کا بیش قرار انعام عطا ہوا۔ اور **شمس العلماء۔ خاں بہادر** کے معزز خطاب سے مخاطب کئے گئے۔
آپ کا طرز تحریر سادہ اور صاف ہے۔ اُس میں زبان دہلی کی خوبی اور ظرافت کا چٹخارا بھی موجود ہے۔

سرشتِ انسانی

انسان کے لئے خدائے تعالیٰ نے دو عالم پیدا کئے ہیں ایک عالم تو وہ ہے جو آنکھوں کو نظر آتا ہے۔ اُس کو عالم ظاہری یا صوری۔ یا جسمانی یا مادی یا ناسوت کہتے ہیں۔ دوسرا وہ عالم ہے جو دل کی آنکھ کو دکھائی دیتا ہے۔ اس کو عالم باطنی یا معنوی یا روحانی یا لاہوت کہتے ہیں۔ عالمِ جسمانی میں تمام قوانین اور آئین مادی جاری ہیں۔ اس کے انتظام کو جسمانی سلطنت یا گورنمنٹ کہتے ہیں۔ اسی طرح عالم باطنی میں معنوی یا روحانی احکام سے انتظام ہو رہا ہے۔ اور اُس میں قوانین آئین جاری ہیں۔ اس کو اخلاقی سلطنت یا گورنمنٹ کہتے ہیں۔ اس کا مدبّر و فرماں روا خلق ہے۔ اور اس کا بڑا اہلکار پیشکار انسان ہے۔ اسی سبب سے انسان کیلئے اس کے اعمال و افعال کی بازپُرس و جواب دہی لازم ہوئی ہے۔ انسان کے گرد جتنی اشیا ہیں اُن سے وہ کچھ نہ کچھ خاص تعلقات رکھتا ہے۔ ایک تعلق اس کا ہر نفس کے ساتھ بالانفراد ہے۔ دوسرا تعلق ایک جماعت کے ساتھ مشارکت کا۔ اس مشارکت کی یہ صورتیں ہیں۔ اوّل ایک گھر میں ہو۔ دوم شہر و ملک و اقلیم میں ہو۔ ہر انسان عنایت شفقت و احسان کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ پھر ہر فرد بشر کا تعلق اپنے خدا کے ساتھ ہے جو اس کا خالق و رازق ہے۔ اور اس نے اس دنیا کو اس کے لئے مزرعۃ الآخرۃ بنایا ہے غرض اُدھر قوائے عقلیہ

انسان کو سمجھاتی ہیں کہ اُس کے ذمے فرائض کیا ہیں۔ اور اُدھر قوائے عملیہ اعمال کی جواب دہی اور باز پُرس سے ڈراتے ہیں۔ ہر انسان پر یہ فرض عظیم ہے کہ وہ ان دونوں قوائے عقلیہ و عملیہ کے اصول کو ایسا نشو و نما دے کہ جس سے وہ اعلیٰ درجے کا دانا۔ والاخرد۔ پاک باطن۔ مقدس۔ بزرگ ہو جائے۔ وہ یہ خوب سمجھ لے کہ جیسی مجھے اپنے دماغ کی اصلاح قوائے عقلیہ کی تقویت کے لئے ضروری ہے اس سے زیادہ تر قوائے عملیہ کی تکمیل سے دل کی فلاح لازم ہے۔ بس یہی اصل اصول انسان کا مالک اور فرمانروا ہے۔ اگر وہ صحیح و درست ہے تو ہمارے سارے افعال بخیر و خوبی انجام پائیں گے۔ اور اگر وہ غلط و نادرست ہے تو ہمارے سارے اعمال تباہ و خراب ہیں۔ نفس کو وہ اطمینان و راحت جس سے دل کا اضطرار و اضطراب دور ہو وہ نہ بڑے لمبے چوڑے خطابوں سے حاصل ہو نہ یہ اطمینان قلب دولت کی کثرت سے مول لیا جا سکتا ہے۔ آدمی چاہے کیسا ہی مال سے مالا مال ہو عاقل و فرزانہ ہوشمند و دانا ہو اگر اُس کا دل سعادت و خیر سے خالی ہے تو ذلیل ہے۔

نیک اخلاقی سے انسان میں ہر قسم کی بزرگی اور عظمت پیدا ہوتی ہے۔ جو آدمی نیک اخلاق نہیں ان کے کارہائے عظیم جن کی معراج پر وہ عروج کرتے ہیں اور زیادہ ان کی بد افعالی کو چمکا کر آشکارا کر دیتے ہیں۔

نپولین بُوناپاٹ جس کی سطوت و جبروت اور تسلّط نے مغربی ممالک میں تہلکہ عظیم مچا دیا تھا وہ ایک مشہور مثال طاقت انسانی کی فوق العادت ہونے کی ہے۔ یعنی ایسی قوت جو شاذ و نادر ہی انسان میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ انسانیت کی عظمت سے خالی تھی۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ نپولین بد نہاد تھا۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی ساری توجہ ملک گیری اور ہنگامۂ جنگ و پیکار کرنے میں اس طرح صرف کی کہ عظمت و شان و شکوہ حاصل ہو۔ اور کسی موقع پر وہ سب سے بڑی خوبی اور نیکی دکھائی جو بغیر خود غرضی

اور خود مطلبی و خود کامی کے ہوتی ہے۔ اس لئے نیک اخلاقی کے اعتبار سے اس کی موت ایک مفلس غریب کی موت سے بھی بدتر تھی۔

فردوسی شاعر جس کو شاہنامے نے شہنشاہ سخن بلکہ خدائے سخن کا خطاب دلایا اُس نے محمود غزنوی کے ساتھ سخن فروشی میں داد و ستد کی گفتگو کی۔ پہلے طمع زر سے مدح سرائی کی اور پھر جب دولت ہاتھ نہ آئی تو ہجو کہی۔ جو خود شاعر کو ذلیل کر دیتی ہے۔ اور اُس کی پست فطرتی و بدطینتی پر شہادت دے رہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ دولت و طاقت کی ایسی ضرورت ہے۔ نہ ہوشیاری و دانائی کی۔ نہ صحت و تندرستی کی۔ جیسی کہ نیت بخیر و نیک عمل ہونے کی حاجت ہے۔ یہی انسان میں انسانیت پیدا کرتی ہے۔ (مولوی ذکاءاللہ دہلوی۔ از تعلیم الاخلاق)

قوائے عملی نفسانی محرّک بالعمل

خدائے تعالیٰ نے انسان کو ایسا نہیں پیدا کیا جیسا شہد کی مکھیوں کے چھتّے میں نر مکھیوں کو۔ کہ سارے دن نکمّے پڑے دھوپ میں اینڈا کریں۔ اور اپنے تئیں سکھایا کریں۔ بلکہ اس کو شہد کی مکھی کی طرح پیدا کیا ہے کہ تادمِ مرگ کام کیلئے اور زندگی کے بعض اتفاقیہ جھگڑوں کے چکانے کے واسطے آمادہ و مستعد و سرگرم رہے۔

کام کا کرنا انسان کی بہبود کا ایک قانون ہے اور اُس کا فرض ہے۔ اُس کے ذمے اپنے کاموں کی چھانبین کرنی اور اپنے فرائض کا ادا کرنا واجب ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُس کے نفس کو کیا کیا قوتیں اپنے کاموں کے سرانجام دینے کیلئے عطا فرمائی ہیں؟ اس مضمون کو دو طرح بیان کرتے ہیں۔

اوّل مشرقی خیالات کے موافق۔ طبیعت بشر کو نقص لازم ہے۔ اُس کے ازالہ کے لئے وہ کام کرتا ہے۔ جتنی چیزوں کے لئے وہ لائق بنایا گیا ہے سب اُس کے پاس

نہیں ہیں۔ اُن کے حاصل کرنے کے واسطے اُس کو کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے
خداتعالیٰ نے تین قوتیں اُس کے نفس کو دی ہیں۔ جو اُس کے سارے افعال
ارادی کی محرک ہوتی ہیں۔ اوّل قوت ادراک معقولات وتمیز مصالح ومفاسد افعال
س کو قوت نطق کہتے۔ دوم قوت شہوی کہ وہ مبدأ ہے جذب منافع وطلب غذا
وغیرہ کا۔ سوم قوت غضبی ہے کہ مبدأ ہے دفع مضار وآلام پُراہوال اور شوق تسلّط
وترفع کا۔ آخر دو قوتیں حیوان اور انسان میں مشارکت رکھتی ہیں۔ مگر اوّل قوت
مخصوص انسان کے ساتھ ہے۔ قوت ناطقہ کو نفس ملکی۔ اور قوت غضبی کو نفس
سبعی۔ اور قوت شہوی کو نفس بہیمی کہتے ہیں۔

کبھی اس مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ نفس ایک لطیفہ ربانی ہے۔
واقع میں انسان وہی ہے جو بحسب اختلاف احوال صفات مختلفہ کے ساتھ موصوف
ہوتا ہے۔ جب شہوات سے مزاحمت کرتے کرتے اُس کا اضطراب دور ہوجاتا ہے
اور وہ سوائے افعال جمیل کے راضی نہیں ہوتا تو اُس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔
اور جب سکون کامل نہیں ہوتا مگر نفس ندامت اور ملامت کے ساتھ بدفعلی کے
اقدام چشم بصیرت میں قبیح دکھلاتا ہے۔ تو اُس کو نفس لوّامہ کہتے ہیں۔ اور جب
نفس ارتکاب شہوات پر حکم کرتا ہے تو اُس کو نفس امّارہ کہتے ہیں۔

اب مغربی خیالات کے موافق نفس انسانی میں جو اصول محرک بالعمل ہوتے
ہیں وہ یہ ہیں۔ اوّل شہوات جو انسان کے جسم سے متعلق ہیں۔ دوم خواہشیں
یعنی طلب اشیاء اپنے اغراض کے لئے۔ سوم محبت۔ چہارم عقل۔ پنجم۔ کونشنس۔
ششم۔ ارادہ واختیار۔ اب دفعات ذیل میں ہر ایک کا بیان جدا جدا کیا جاتا ہے۔
انہیں اصول کی اصلاح پر انسان کی کامیابی اور ناکامی موقوف ہے۔

۱۔ شہوات۔ شہوت یا اشتہا کے معنی صرف کسی چیز کے چاہنے کے ہیں۔

مگر خاص معنی خواہش تن کے لیتے ہیں۔ یعنی جن خواہشوں میں جسمانی لذائذ حاصل ہوں۔ اس خواہش میں انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں۔ یہ خواہش بقاے جسم کے لئے ضروری ہیں۔ جیسے بھوک پیاس۔ اگرچہ ہم یہ نہ جانتے ہوں کہ بھوک پیاس کی اصل حقیقت کیا ہے مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم کو ایک ناملائم الم محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ غذا کھانے سے دفع ہو جاتا ہے۔ یہی پیاس کا حال ہے کہ تالو اور معدہ اور سارا جسم تری کا طالب ہوتا ہے۔ پانی پینے سے پیاس بجھ جاتی ہے۔ پس جب یہ شہوات رفع کردی جاتی ہیں تو فقط یہی نہیں ہوتا کہ جو ناملائم اور ناگوار احساس ہوتا تھا وہ رفع ہو جاتا ہے بلکہ اُس کے ساتھ ایک طرح کا سرور ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ شہوات اپنی قدرتی حد سے تجاوز کرتی ہیں اور ان میں اعتدال نہیں رہتا تو ان کے رفع کرنے سے جو فرحت و مسرّت حاصل ہوتی تھی وہ کم ہو جاتی ہے۔ یا بالکل جاتی رہتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ ہمارے مایحتاج میں داخل تھیں مگر جب وہ اُس سے آگے بڑھیں تو انھوں نے ہمارا سرور بالکل دور کردیا اور ایک ہُو کا اذیت پہنچانے والا پیدا کر دیا۔ یہ افراط جسم کے حق میں بھی مضر ہوتی ہے۔ اور نفس کو بہائم سیرت بنادیتی ہے۔ پس اس لئے ہم کو چاہئے کہ ان شہوات کو حد اعتدال میں رکھیں کہ ان سے لذائذ جسمانی حاصل ہوں۔ ان کو بڑھائیں نہیں۔ کہ وہ بجائے نعمت و رحمت کے زحمت ہو جائیں۔ جب شہوات اپنی حد سے تجاوز کرتی ہیں اور اُن میں افراط ہوتی ہے تو وہ انسان کو ناقص بناتی چلی جاتی ہیں۔ اور حیوانیت کے اسفل درجے پر پہنچا دیتی ہیں۔ اور شوق فاسد اور میل اُس میں پیدا کر دیتی ہیں۔ جو شخص ان شہوات رویہ میں پھنس گیا وہ انسانیت کے درجے سے گر گیا۔ کوئی بدتر حالت اس سے زیادہ انسان کیلئے نہیں ہے کہ وہ بہائم سیرت بن جائے اور جانوروں کے برابر ہو جائے۔ جہاں تک ممکن ہو آدمی کو

چاہئے کہ ان شہوات کو مغلوب و معتدل رکھے۔
۲۔ خواہشات و محبتیں۔ خواہش کے معنی کسی چیز کی طرف میلان کرنا۔ یا کسی چیز کی طرف جانا۔ محبت کے معنی کسی شخص کی طرف میلان کرنا۔ طبیعت بشر کو نقص لازم ہے۔ اس لئے وہ اشیاء اور اشخاص کا محتاج ہے۔ اپنے اغراض کے لئے اُس کو دونوں کی طلب ہوتی ہے۔ اور بے اختیار اُن کا طالب ہوتا ہے۔ اگرچہ ہم اشیا کے خواص جاننے میں غلطی کرتے ہیں مگر جس وقت ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں شے ہمارے لئے ضرور ہے اور اس سے ہم کو منفعت حاصل ہوگی تو اُس کے ہم طالب ہوتے ہیں۔ بعض محققین کا یہ قول ہے کہ انسان کی تمام خواہشوں اور محبتوں کا مآل یہ ہوتا ہے کہ اپنے مطالب و مقاصد کو حاصل کرکے مسرور و خوش دل ہو۔ دولت۔ حکومت۔ جاہ۔ علم پر اُن کا یہ قول صادق آتا ہے کہ ان کے طالب بہت آدمی ہوتے ہیں۔ مگر انسان اپنی درازی عمر کا بھی طالب ہوتا ہے جس میں ایک مدت کے بعد سراسر تکالیف و رنج پیش آتے ہیں۔ پس یہ درازی عمر کا چاہنا حصول مسرت کی غرض سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں کچھ خوشی نہیں ہے۔ درحقیقت خواہشوں کا مآل خوشی نہیں ہوتا بلکہ انسان ناقص ہے وہ اپنے نقصوں کو دور کرکے کامل ہونے کی غرض سے خواہشیں کرتا ہے۔ ایک فرانسیسی حکیم نے لکھا ہے کہ دل کو ایک شے اپنے لئے مناسب و مفید معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لئے اس کا دل طالب ہوتا ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں سرگرمی کرتا ہے۔ اور ایسی ہی چیز کو وہ جانتا ہے کہ میرے لئے مناسب و مفید نہیں معلوم ہوتی تو اس سے اس کا دل سرد ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ بچتا ہے۔ غرض انسان مفید چیز کا طالب و محب اور مضر چیز کا دافع اور دشمن ہوتا ہے۔ جس کے سبب سے شہوات کا شہود ہوتا ہے۔ اور دل کے سبب سے خواہشیں اور محبتیں موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کا نام

اصول عقلیہ رکھتے ہیں۔ وہ جسمانی شہوات پر زیادہ غلبہ رکھتی ہیں۔ انھیں خواہشوں اور محبتوں کی افراط کا نام جذبات ہے۔ جذبات کی حالت میں عقل معطل ہو جاتی ہے۔ ہماری نیک افعالی اور اخلاق کی درستی اور راستی کے لئے ضرور ہے کہ یہ ہماری خواہشیں اور محبتیں مصالح افعال کی طرف راغب ہوں۔ اور اُن کا زور ہماری حالت کے مناسب ہو۔ اگر ان خواہشوں اور محبتوں کی روک تھام انتظام کے ساتھ نہ ہو گی تو ان کی افراط جذبات پر نوبت پہنچائے گی۔ اور صدہا طرح کی خرابیاں سر پر لائے گی۔ اپنی ان خواہشوں اور محبتوں کو باقاعدہ اور منتظم نہ رکھنے کے سبب سے بہت خرابیاں انسان پر آتی ہیں۔ دیکھو کہ دولت کی محبت سے حکومت کی تمنا سے حب جاہ سے رقیبوں کے ساتھ عناد و فساد سے اپنی جماعت کی طرفداری سے حسد، نفرت، دشمنی، کینہ، انتقام یہ سب برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جاہ طلبی و الوالعزمی میں کیسی کیسی پیچدار دقتیں پیش آتی ہیں۔ اپنی خود غرضی و خود پرستی کے آگے اور انسانوں کی مصائب کا خیال نہیں ہوتا۔ یوں ہی ملک کے ملک تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ میدانوں میں خون کے ندی نالے بہتے ہیں۔ یہ نتیجے جب ہی پیدا ہوتے ہیں کہ انسان کی خواہشیں اور محبتیں ایسی نہیں ہوتیں کہ وہ انسانیت کیلئے زیبا و موزوں ہوں اور نیک کرداری کے قوانین کی پابند ہوں۔ کوئی خود مطلبی اپنی مقررہ حد سے جب آگے قدم نکالتی ہے تو عقل کی موزونی برباد ہو جاتی ہے۔ اور انسان کے خصائل و سیرت پر صدمۂ عظیم پہنچاتی ہے۔ بس نیک سیرتی کی اصل یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشوں اور محبتوں کو باقاعدہ اور منتظم و منضبط و معتدل رکھے۔

اگر انسان کو فقط یہی اشتہائیں اور خواہشیں اور محبتیں ہی اعمال پر تحریک کرتیں اور کوئی اور اصول درمیان میں واسطہ نہ ہوتا تو اُس کا حال جانوروں کا سا ہوتا کہ ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف جلدی جلدی دوڑتا پھرتا اور اپنی زندگی کیلئے کوئی منصوبہ

اور اپنے چال چلن کی کوئی تدبیر نہ کرتا۔ اور کسی طرح سے اپنی خواہشات کی برانگیختگی اور جذبات کے ہیجان کو فرو نہ کر سکتا۔ مگر انسان کی فطرت حیوان کی سی نہیں ہے۔ اس میں سوائے ان ادنیٰ اصول کے جو عمل پر محرک ہوتے ہیں اور اعلیٰ اصول یعنی قوے بھی ہیں جو اُس کی خواہشات نفسانی کی روک تھام انتظام کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور اس کو ہدایت کی راہ بتاتے ہیں۔ ان میں سے ایک قوت عقل ہے کہ وہ حال کی حالت کے پس و پیش کو دیکھتی ہے۔ اور اس امر کا فیصلہ کرتی ہے کہ کس بات میں بہ حیثیت مجموعی فائدہ ایک زمانۂ دراز تک حاصل ہو گا؟ اور اس زمانہ دراز کی مدت کو بھی وہی ٹھہراتی ہے۔ یہ پہلا اُصول انسان کی دانائی کا ہے۔ دوسری ایک اور قوت ہے جس کو کونشنس (قلب) کہتے ہیں وہ فقط یہی نہیں تبلاتا کہ کونسی چیز خوش کرنیوالی اور آرام دینے والی ہے۔ بلکہ کیا کرنا صواب و راست ہے۔ اس کو اصول فرض کہتے ہیں۔ بعض ان دونوں اصول دانائی اور فرض کو متحد اس لئے بتاتے ہیں کہ کارِ صواب کا کرنا ہی مفید ہوتا ہے۔ مگر ان میں فرق ہے۔ ایک کام جو فقط منفعت کی ضرورت کے سبب سے کیا جائے اور دوسرا کام جو محض فرض کے خیال سے کیا جائے۔ ان دونوں کاموں میں بڑا تفاوت ہوتا ہے۔

۳۔ عقل۔ مدت سے لوگ کہتے چلے آئے ہیں کہ عقل ہی انسان کو ممیز از حیوان بناتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خواہشیں حیوانات کو ادھر اُدھر پھراتی ہیں۔ ان میں بالکل پیش بینی و عاقبت اندیشی اور اندازہ و محاسبہ کی قدرت نہیں ہوتی۔ یہی حال انسان کے بچوں کا ہوتا ہے کہ نہ ان کو گذشتہ کا خیال نہ آیندہ کا فکر ہوتا ہے۔ وہ یونہیں بے ٹھکانے خیالات اور تاثر و انفعال قلبی کے تابع ہوتے ہیں۔ مگر انسان میں ایک قوت ہمیشہ ہوتی ہے جو آخر بین اور عاقبت اندیش ہوتی ہے۔ اور وہ بتاتی ہے کہ کس کام کا کرنا اور کس کام کا نہ کرنا مفید اور اچھا ہو گا۔ جو خواہشات نفسانی اسفل

وادنیٰ درجے میں انسان کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ ان سے یہ اصول یعنی قوت عقل بچاتی ہے مثلاً انسان کے دل میں انتقام کا جذبہ اٹھے گا تو یہ عقل اگر مناسب و مفید جانے گی تو اس جذبے کو بالکل مٹا دے گی۔ اور اگر انتقام پر آمادہ کرے گی تو اس خوش اسلوبی سے کہ آدمی اس سے زیادہ آفت میں نہیں پھنس جائے گا۔ لیکن انسان کی رائے و فکر خواہ کیسی ہی صائب ہوں خطا کرتے ہیں۔ خصوصاً اس سے زیادہ غلط کاری اپنے کردار اور افعال اور چال چلن کے باب میں یہ ہوتی ہے کہ وہ خود غرضی کو دانائی جانتا ہے۔ تحریکات نفسانی کی مصالح کار میں گو عقل سب سے بڑھ کر محرک ہو۔ مگر وہ ہادی بے خطا نہیں ہو سکتی کہتے ہیں کہ عقل مشیر بن کر مشورہ دیتی ہے۔ مگر جو حکم نہیں دیتی وہ حکم دینے والا فقط کونشنس یعنی اصول اخلاق ہے جو قانوناً یہ بتلاتا ہے کہ انسان پر کیا کرنا فرض ہے۔

۴۔ کونشنس (قلب) جس کے باب میں بہت سے مباحثے ہوتے ہیں وہ خدائے تعالیٰ نے ایک قوت دل میں جمادی ہے جو ہمارے قول و فعل خیال کے بھلے برے ہونے کو ہمیں تبلاتی ہے۔ بعض کام ہم اس لئے کرتے ہیں کہ اُن کو اچھا جانتے ہیں۔ اور بعض کام اس لئے نہیں کرتے کہ ان کو بُرا جانتے ہیں۔ عصمت اور عصیاں کی یہ علامتیں ہیں کہ ایک میں حیا کا نور چمکتا ہے دوسرے میں شرمندگی کا رنگ۔ بچوں میں بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ دیانت و شفقت کو پسند کرتے ہیں۔ اور مکر و فریب سے نفرت۔ ہر زبان میں ایسے الفاظ ہیں جو نیک و بد کے معانی میں تمیز بتلاتے ہیں۔ غرض انسان خواہ انسانیت کے پایہ سے کیسا ہی گر جائے مگر بُرے بھلے کام میں تمیز کرتی اس میں باقی رہے گی۔ یہ سچ ہے کہ سب آدمی ایک ہی کام کو اچھا نہیں جانتے بلکہ کبھی کبھی یہ بُرے بھلے کی تمیز معکوس ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ خواہ یہ سر کی آنکھیں ہوں خواہ اخلاق کی آنکھیں وہ جب ہی اچھی طرح دیکھ سکتی ہیں کہ روشنی صاف ہو۔ پس جہاں روشنی

نہیں ہے وہاں اخلاق کی آنکھ صحیح نہیں دیکھتی۔

کونشنس (قلب)، ہم کو حکم دیتا ہے کہ نیک کام کرنا چاہیئے اور بُرے کام سے بچنا چاہیئے۔ وہ فقط رستہ ہی نہیں بتلاتا۔ بلکہ اُس میں چلنے کا حکم دیتا ہے۔ اس کے برابر کوئی قوت انسان کے نفس پر حکمرانی نہیں کرتی۔ وہ حکومت کا دعویٰ رکھتی ہے اور ہم سے اطاعت چاہتی ہے۔ کوئی اس کا سبب پوچھے تو سیدھا سا جواب یہ ہے کہ کونشنس کا تعلق خدا کے ساتھ ہے۔ وہ ہر انسان کے دل میں ایک لطیفۂ ربانی ہے جو خلافت الٰہی کا کام کرتا ہے۔ اس کے برابر کوئی ہادی اور مرشد نہیں ہے۔

پس انسان میں عمل کی طرف مختلف قواء تحریک کرتی رہتی ہیں۔ شہوات اس کو ایک طرف لے جاتی ہیں۔ جذبات دوسری طرف کھینچتے ہیں۔ عقل اور راہ پر لیجانا چاہتی ہے۔ کونشنس سب راہوں سے دوسری راہ کا رہنما ہوتا ہے۔ غرض سارے اصول اور قواء ایک دوسرے سے متضاد اور مخالف ہوتے ہیں۔ انسان ان کی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان مخصوں میں انسان کو اپنی تسلی و اطمینان کیلئے اپنے کونشنس یعنی قلب سے فتویٰ لیکر کام کرنا چاہیئے۔ یہ قوت اس کو اسی لئے دی گئی ہے کہ وہ اس کی پیروی کرے۔ اور اگر پیروی نہ کریگا تو اس سے بازپرس کی جائے گی۔ راست کردار کو اللہ تعالیٰ ایک نور عنایت کرتا ہے اور اُس نور سے یہ چاہتا ہے کہ وہ ہدایت پائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس نور سے کیونکر ہدایت پائے جب کہ ہر انسان کے لئے اخلاقی فساد موجود ہوں۔ شہوات۔ جذبات طوفان مچا رہے ہوں۔ اسفل قوتیں اعلیٰ قوتوں کو دبا رہی ہوں۔ عقل اور کانشنس کی آواز ایسی معلوم ہوتی ہو جیسی نقارخانے میں طوطی کی آواز۔ تو انسان ان زور آور تحریکوں کو دبا کر کمزور تحریکوں کی کیونکر پیروی کر سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو ایک قوت ارادہ و اختیار کی دی ہے جس سے وہ اپنا کام آزادانہ کر سکتا ہے۔ اپنے ارادے و اختیار

سے اعلیٰ قوتوں کو ساری حکومت اور قوت دے سکتا ہے اور ادنیٰ قوتوں کو ان کا محکوم بنا سکتا ہے۔ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ انسان قوی تحریک کے موافق کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی قوی جذبہ اپنا زور کرے اور عقل و کونشنس سے اپنی طاقت زیادہ دکھائے تو انسان ایسی حالت میں اُس جذبے کے موافق کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ ہمارا ارادہ یا اختیار ہمارے سارے اعمال میں بڑا متصرف ہے۔ ہم خود بھی اور تمام لوگ اپنے ارادے سے کل کام کرتے ہیں۔ جب تک ارادہ نہ کریں کوئی عمل سرزد نہیں ہوتا۔ اس ارادے اور اختیار ہی نے ہم کو اپنے اعمال کا جواب دہ بنایا ہے۔ اور افعال کی بازپرس کا بوجھ سر پر ڈالا ہے۔ ہمارے کسی کام کا فیصلہ بغیر ہمارے ارادے کے نہیں ہوتا۔ غرض کونشنس ہم کو ہمارے فرض کا قانون بتلاتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ اور ارادہ یا اختیار ہم کو اجازت دیتا ہے کہ ہم اُس قانون کی تعمیل کریں۔ پس ہم کو چاہیئے کہ ہم اس کے عادی ہوں کہ کونشنس کے احکام کے موافق ہم کاموں کو اختیار کرنے کا ارادہ کریں۔ ارادہ جس کے مرادف الفاظ نیت۔ قصد ہیں دل کی ایک حالت اور کیفیت ہے جو علم و عمل کے درمیان ہوتی ہے۔ عقل اور کونشنس سے کسی شے کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور ارادہ دل کو عمل کی طرف برانگیختہ کرتا ہے۔

پس جو شخص اپنے ارادے کو اسفل قوا کا تابع بنائے گا وہ انسانیت کا اعلیٰ درجہ نہیں پائے گا۔ جو شخص اپنی عقل کو کام میں نہیں لائے گا اس کی حماقت کے سبب سے حقارت ہوگی۔ جو شخص اپنے کونشنس کے خبردار کرنے والی آواز سے بے خبری اختیار کرے گا وہ بڑا قصوروار اور خطاکار ہوگا۔ اپنے سارے کاموں میں سب سے بڑا ہادی اپنا کونشنس ہے۔

جو شخص کونشنس کا مطیع ہو کر کسی عمل کا ارادہ کرتا ہے اس کے پاس کبھی رنج

اور افسوس نہیں آتے۔ اور کوئی عمل ایسا نہیں کہ جس کے ارادے میں ہم کونشنس کی نافرمانی کریں اور اس میں ہم کو تکلیف نہ پہنچے۔ بُرے اعمال کرنے کے برابر کوئی خرابی اور اچھے اعمال کی نیت کرنے کے برابر کوئی خوبی ہمارے لئے نہیں ہے کونشنس ہی ہمیں یہ قاعدہ بتاتا ہے کہ ہم اپنے خیال اور اقوال اور اعمال کو منتظم کریں۔ اس لئے صاحب کونشنس ہونے سے گویا ساری نیکیاں ہماری ذات میں پیدا ہو جاتی ہیں۔
(مولوی ذکاءاللہ دہلوی۔ از تعلیم الاخلاق)

حق و ناحق

دنیا میں حق و ناحق کرنے پر انسان کا کل اخلاق مبنی ہے۔ اگر کاموں کا حق و ناحق ہونا مفقود ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی حق کام کرے اور ناحق نہ کرے۔ ان کے نہ ہونے سے کل اصول اخلاق باطل ہوئے جاتے ہیں۔ چال چلن کی پھر پروا نہیں رہتی۔ لیاقت مندی و نالائقی۔ برائی بھلائی محض خالی الفاظ ہی رہ جاتے ہیں۔ لیکن کاموں کا حق و ناحق ہونا علی العموم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور ہمارا کونشنس (قلب) ان کو بتلاتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ ایک طرح کے کام کرو اور دوسری طرح کے نہ کرو۔ پس اب سوال یہ ہے کہ کاموں کا حق و ناحق ہونا جو انسان کی زندگی میں بڑی وقعت رکھتا ہے وہ کیا شے ہے؟۔

اس سوال کے جواب محققین مختلف طور سے دیتے ہیں۔ بعض یہ جواب دیتے ہیں کہ جو افعال ہمارے دل کو خوش کریں وہ حق ہیں۔ اور جو دل کو رنج پہنچائیں وہ ناحق ہیں۔ پس اس صورت میں انسان کے دل کا تاثر و انفعال افعال کے حق و ناحق ہونے کا معیار ٹھہرا۔ دوسرے محققین یہ جواب دیتے ہیں کہ جو آدمیوں میں قوانین۔ آئین۔ دستور رسوم ملکی جاری ہوں وہ جن کاموں کے کرنے کا حکم دیں وہ حق ہیں اور جن کو منع کریں وہ ناحق ہیں۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی کام جب تک قوانین مروجہ کے

خلاف نہ ہو وہ ناحق ہی نہیں ہو سکتا۔ پس جہاں کوئی قانون نہیں وہاں کوئی گناہ جرم و خطا ہی نہیں۔ یہ قاعدہ انتظام ملکی کے علم میں صحیح معلوم ہوتا ہے مگر وہ وہاں کب ٹھہر سکتا ہے جہاں انسان کے سارے افعال اعمال خدائے تعالیٰ کے روبرو پیش کئے جائیں۔ نہ خود انسان میں نہ اس کے کسی فیصلہ میں نہ اُس کے کسی قانون و دستور میں استواری و استحکام ہے۔ یہ سب ہمیشہ متغیر رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے خالق اکبر نے جو انسان کی حالت مقرر کی ہے وہ شائبۂ تغیر اور زوال سے معرّا ہے اس میں ثبات وبقا ہے۔

تم جانتے ہو کہ تمہاری اپنے دل کی سرزمین میں ایک نیکی کی جڑ ہے جس کی ہم ہوشیاری سے آبیاری اور شوق و ذوق سے خبر گیری کریں گے تو کلیاں نکلیں گی۔ پھول پھولیں گے پھل پھلیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم کو سوائے اس کے ضرورت نہیں کہ ہم اپنے دل میں ہنرمندی اور سلیقہ سے بڑی عمیق کاوش کریں تو وہاں ایک سرچشمۂ الٰہی ملے گا جو ہماری ہستی کے منبعوں کو سیراب کرے گا اور مٹی نے جو اُن کو اٹا رکھا ہے اُس کو بلبلوں کی طرح دن میں اُڑا دے گا۔ خدا کا شکر بھیجو کہ ایسا نہیں ہے کہ اُس نیکی کی جڑ کے لئے ہمارا عاجز دل سرزمین کا سرانجام نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ایک بڑی زرخیز اور شاداب زمین مہیا ہے اور اس سرچشمے کا منبع بہت بلندی پر ہے۔ وہ خدا ہی سے نکلا ہے۔ اور خدا کی طرف پھر جائے گا۔ وہ ہمارے تنگ ظرفوں سے نہیں پُر ہو گا۔ بلکہ وہ خدائے تعالیٰ کے دریا سے جو کبھی خالی نہیں ہوتا پُر ہو گا جو ہمیشہ رہے گا۔

زمانۂ حال میں ایک فرانسیسی لکھتا ہے کہ انسان کے لئے جو باتیں خدائے تعالیٰ نے فرض اور واجب مقرر کی ہیں اگر آدمی ان کو پورا کرتا ہے تو کارِ حق کرتا ہے۔ اور اگر اُن کو پورا نہیں کرتا تو ناحق کرتا ہے۔

اب ہم تفصیل سے اس امر کو بیان کرتے ہیں کہ تعلقات کے سبب سے کون سے کام کرنے انسان پر فرض ہو جاتے ہیں اور اُن کا ادا کرنا حق ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارا خدائے تعالیٰ

سے ایک خاص طرح کا تعلق ہے۔ وہ ہمارا خالق اور رازق محافظ ہے جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے۔ آیندہ جو کچھ نعمتیں ملیں گی وہ اُسی کے انعام سے ملیں گی۔ پس یہ تعلق ایسا ہے کہ خدا کی بندگی اور اطاعت و محبت کو انسان پر فرض و واجب بناتا ہے۔ یہ کہنا ضرور نہیں ہے کہ جب ان فرائض کو جانتے ہیں تو خدا کے ساتھ تعلقات کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ تعلقات ہی ایسے ہیں کہ وہ بالضرور یہ فرائض پیدا کرتے ہیں خواہ ہم ان کو پہچانیں یا نہ پہچانیں۔ ایسا ہی اپنے ابنائے جنس کے ساتھ تعلقات بعید و قریب اور رشتہ مندیوں کے ہیں کہ سارے انسان ایک خاندان کے ارکان ہیں۔ اس سے اخوت کا تعلق پیدا ہوا ہے اور برادرانہ خیر خواہی مقتضی ہوتی ہے۔ ہم بچے ہوتے ہیں۔ ماں باپ لاڈ پیار کرتے ہیں پالتے پوستے ہیں اس تعلق کے سبب سے ان کے حقوق ہمارے ذمے ادا کرنے واجب ہوتے ہیں۔ ان کی محبت اور اطاعت ہم پر فرض ہوتی ہے۔ پس یہ مختلف تعلقات جو ہمارے اوروں کے درمیان ہیں اُن کے موافق اپنے دل میں تاثر و انفعال پیدا کرنا ہمارے اخلاق کی راستی اور درستی ہے۔

(مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔ از تعلیم الاخلاق)

شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد دہلوی

آپ ۲۳۔ جمادی الاولی یوم سہ شنبہ ۱۲۵۲ھ مطابق ۶۔ دسمبر ۱۸۳۶ء کو مقام ریتھر پرگنہ افضل گنج تحصیل نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ مگر آپ کا قیام اپنے والد کے ساتھ زیادہ تر خاص شہر بجنور میں رہا۔ سن تمیز کو پہنچنے کے بعد سے آپ برابر دہلی میں رہے۔ آپ کے خاندان میں اکثر علما فضلا مفتی مشائخ گذرے ہیں۔ آپ کے والد مولوی سعادت علی صاحب فارسی زبان کے بڑے ماہر تھے۔ عربی سے بھی آگاہ تھے۔

آپ نے فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ہی سے پڑھیں۔ اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی نصر اللہ خاں صاحب سے اس کے بعد مولوی عبد الخالق صاحب سے پڑھیں۔ ۷۔ جنوری ۱۸۴۵ء میں آپ دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ ۸ برس تعلیم پانے کے بعد ۱۸۵۴ء میں فارغ التحصیل ہو کر کالج سے نکلے۔

تعلیم کے ختم ہونے کے بعد آپ گجرات کے ایک اسکول میں للعہ ماہوار پر ملازم ہوئے۔ دو سال کے بعد اجمیر کالج سے سو روپیہ ماہوار کی عربی فارسی کی پروفیسری کی جگہ آئی۔ اور کانپور سے للعہ ماہوار کی ڈپٹی انسپکٹری کی جگہ پیش کی گئی۔ آپ ڈپٹی انسپکٹری قبول فرما کر کانپور آئے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد آپ الٰہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر ہوئے۔ اور عبد اللہ خاں امین عدالت کے مکان پر آپ کا قیام تھا۔ اُنھیں کی تحریک سے آپ نے انگریزی شروع کر دی۔ اور اُس کو بقدر ضرورت خوب حاصل کر لیا کہ اُس زمانے کے بی۔ اے۔ آپ کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ریاست نظام میں پہنچ کر آپ نے تلنگی سیکھی۔ اور پیرانہ سالی میں دہلی میں آپ نے سنسکرت پڑھی۔ گورنمنٹ کے حکم سے آپ نے انکم ٹکس۔ تعزیرات ہند۔ ضابطۂ فوجداری اور قانون شہادت کا ترجمہ کیا۔ تعزیرات ہند کے ترجمے کے صلے میں آپ کو ۱۸۶۱ء میں پہلے کانپور میں قائم مقام تحصیلداری پھر مستقل تحصیلداری ملی۔ ضابطۂ فوجداری اور قانون شہادت کے ترجمے کے صلے میں ۱۸۶۳ء میں کانپور ہی میں ڈپٹی کلکٹری ملی۔ وہاں سے گورکھپور۔ جالون اعظم گڈھ وغیرہ تبدیل ہوتے رہے۔

نواب محسن الملک اور نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی تحریک سے سر سالار جنگ نے ۱۸۷۷ء میں آپ کو حیدرآباد طلب کیا۔ وہاں ایک ہزار تنخواہ اور دو سو چالیس بھتہ پر ایک بڑے عہدے سے سرفراز ہوئے۔ کرنول اور نلگنڈہ کے بندوبست کا کام آپ کے سپرد ہوا۔ اُس کام کو آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیا۔ آخر میں آپ مجلس مالگزاری کے رُکن ہوئے۔ کچھ مدت تک کام کر کے نیک نامی سے علٰحدہ ہوئے۔ دہلی میں آکر خانہ نشیں ہوئے۔ ۲۷۔ اپریل ۱۹۱۲ء کو بعارضۂ فالج علیل ہوئے۔ ۳۔ مئی سنہ مذکور یوم جمعہ ۸ بجے شب کو آپ کا انتقال ہوا۔ **شمس العلماء** کا خطاب آپ کو گورنمنٹ انگلشیہ سے عطا ہوا۔ اور **ایل۔ ایل۔ ڈی** کی ڈگری اڈنبرا یونیورسٹی سے اور **ڈی۔ او۔ ایل** پنجاب یونیورسٹی سے آپ کو ملے۔

آپ نے اردو زبان کو بہت بڑی مدد پہنچائی۔ آخر وقت تک تالیف و تصنیف سے آپکا قلم نہیں رُکا منتخب الحکایات۔ چند پند۔ توبۃ النصوح۔ مرآۃ العروس۔ بنات النعش۔ ابن الوقت۔ محصنات۔ رویائے صادقہ۔ الحقوق والفرائض۔ ترجمۃ القرآن۔ اور بہت سی کتابیں اور آپ کے لکچروں اور

اسپیچوں کا مجموعہ جس میں تقریباً ۶۰ اسپیچیں ہیں۔ اور آپ کے خطوط کا مجموعہ جس کا نام مواعظ حسنہ ہے آپ کی یادگار ہیں۔

مراۃ العروس۔ جو اصغری و اکبری کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے اپنی بڑی کے لئے تصنیف کی تھی۔ اس کے صلے میں سر ولیم میور نے بہ موجودگی ڈیوک آف اڈنبرا بمقام آگرہ آپ کو ایک ہزار روپے بطور انعام کے دئے اور اپنی جیب خاص سے ایک گھڑی عنایت فرمائی۔

چند پند آپ نے اپنے لڑکے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے لئے لکھی تھی۔ اور منتخب الحکایات اپنی چھوٹی بیٹی کے لئے۔ بنات النعش اس کتاب کو مراۃ العروس کے ۳ سال بعد آپ نے لکھا اور گورنمنٹ میں پیش کیا اس پر صلہ آپ کو بطور انعام کے ملے۔

آپ کی تحریر میں سادگی ہے۔ امثال و محاورات کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ اور بہت خوبی سے کرتے ہیں۔ اور چونکہ عربی زبان سے آپ کو ایک خاص الفت ہے اس لئے آپ کی اُردو میں عربی زبان کے الفاظ۔ فقرے۔ اشعار۔ احادیث۔ آیات قرآنی کا استعمال زیادہ ہے۔ آپ کی کتابیں دہلی کی پاکیزہ اور شستہ اردو زبان کا عمدہ نمونہ ہیں۔

صادقہ کا خواب

خدا اور اُس کی وحدانیت اور صفات کا عقلی ثبوت

سوال۔ پہلے مجھ کو اس سے تو مطمئن کیجئے کہ خدا ہے؟

جواب۔ اطمینان کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اطمینان تو آدمی کو اپنی آنکھوں کے دیکھے کا ہوتا ہے۔ ایک اطمینان دوسرے کے کہے کا ہوتا ہے۔ ایک اطمینان عقلی گواہی کا ہوتا ہے۔ کہ دیکھا نہیں۔ سنا نہیں مگر دل ہے کہ آپ ہی آپ تسلیم کر لیتا ہے کہ ہاں یہ بات اسی طرح پر ہے۔ لوگ عید کے چاند میں اختلاف کرتے ہیں کہ ہوا یا نہیں۔ تو اس صورت میں اطمینان کے دو ذریعے ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ مطلع صاف ہو اور ہم اپنی آنکھ سے واضح طور پر چاند دیکھلیں یا ہم آپ نہ دیکھیں تو معتبر آدمی جنھوں نے واضح طور پر چاند دیکھا ہے گواہی دیں۔ یا مثلاً دنیا میں ہزاروں شہر ہیں جن کے دیکھنے کا ہم کو اتفاق نہیں ہوا مگر

تاریخ اور جغرافیے کی کتابوں میں اُن کا بیان نقشوں میں اُن کا نام اور موقع لکھا ہوا موجود ہے۔ اور بہت سے آدمی اُن میں ہو بھی آئے ہیں تو ہم کو اطمینان ہے کہ ہاں یہ شہر اپنی جگہ روے زمین پر ہیں۔ تو اس طرح کا اطمینان خدا کے بارے میں نہ کسی کو ہوا اور نہ کسی کو ہوگا۔ لیکن اطمینان کا تیسرا ذریعہ یعنی عقلی گواہی ابھی باقی ہے اور اکثر صورتوں میں اس سے بھی ویسا ہی اطمینان ہو جاتا ہے اور ہونا چاہیے جیسا آنکھوں دیکھے سے۔ مثلاً ایک گھڑی ہمارے سامنے پیش کی جائے تو اکثر ہم خیال نہیں کرتے لیکن کریں تو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ آپ سے آپ نہیں بن گئی بلکہ کسی کے بنائے سے بنی ہے۔ رہی یہ بات کہ کیوں ہمارے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی؟ اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ خدا نے ہمارے دل ایسے ہی بنائے ہیں جیسے آنکھ رنگ کو ڈول کو نزدیک و دور کو۔ ناک بُو کو۔ زبان مزے کو۔ کان آواز کو۔ جلد بدن سرد و گرم کو سخت و نرم کو پہچانتی ویسے ہی عقل چیز سے بنانے والے کو پہچانتی۔ نہیں ہو سکتا کہ آنکھ صحیح و سلامت ہو اور آدمی چیزوں کا رنگ روپ نہ پہچانے۔ اسی طرح ممکن نہیں کہ انسان معمولی عقل بھی رکھے اور اس کا مقر نہ ہو کہ دنیا کے کارخانے کا کوئی نہ کوئی بنانے والا ہے جس کو خدا کہتے ہیں۔ ہمارے ظاہری حواس ایک حد تک کام دیتے ہیں۔ اور اس حد سے بڑھکر معطل۔ آنکھ سیکڑوں کوس کی چیز نہیں دیکھتی۔ کان سیکڑوں کوس کی آواز نہیں سنتے۔ اسی طرح عقل کے کام دینے کی بھی ایک حد ہے۔ ہم دنیا کے کارخانے کو دیکھ کر عقل کے ذریعے سے اتنا جانتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ اور ایک ہے اور عیب سے پاک نقصان سے منزہ قادر ہے۔ علیم ہے۔ حکیم ہے۔ رحیم ہے۔ یعنی جتنی عمدہ سے عمدہ صفتیں خیال میں آ سکتی ہیں وہ اُن سب سے متصف ہے۔ کیونکہ ان سب باتوں کا پتہ ہم کو اسی دنیا کے کارخانے سے ملتا ہے مثلاً اگر کئی خدا ہوں تو ایسی تو کیا بات ہے کہ ان میں کبھی اختلاف ہو ہی نہیں۔ اور اختلاف ہو تو لڑائی ٹھہری۔ ضرور ہے کہ ایک

ہارے اور ایک جیتے تو جو ہارا وہ بیچارا خدائی سے معزول۔ بندوں کی لڑائی نے دنیا کا کیا حال کر رکھا ہے۔ اگر کئی خدا ہوں اور آپس میں لڑنے لگیں اُن کی ٹکر کو کون سنبھالے غرض دنیا کے کارخانے کا انتظام دلالت کر رہا ہے کہ یہ ایک ارادے کا محکوم ہے اور یہی حال ہے خدا کی کل صفتوں کا۔ پس عقل کے ذریعے سے ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ خدا ہونا چاہیئے اور ایسا ہونا چاہیئے۔ اور وہ ہے اور ایسا ہی ہے۔ اتنی ہی معرفت انسان کو ہے اور اتنی ہی ہو سکتی ہے۔ اور اتنی ہی طلب کی جاتی ہے۔ انسان اس سے آگے قدم رکھنا چاہے تو وہ اس ارادے میں اس سے زیادہ کامیاب نہیں ہوگا جیسے وہ آنکھ سے پسِ دیوار دیکھنا چاہے یا سیکڑوں کوس کی چیز کو بے مدد دوربین دیکھنا چاہے پہلی وہ مکروہ غلطی جو انسان سے ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ یا تو عقل سے بالکل کام لینا نہیں چاہتا یا چاہتا ہے تو اس کی بساط سے بڑھ کر کام لینا چاہتا ہے۔

سوال۔ تو کیا سارے آدمی جو خدا کے قائل ہیں ایک ہی درجے کی معرفت رکھتے ہیں؟

جواب۔ بیشک۔ مگر یقین یقین میں فرق ہے۔ اب دیکھو کہ مثلاً موت ہی ایک چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسری یقینی چیز ہو نہیں سکتی۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ اس تصور کو ذہن میں آنے ہی نہیں دیتے۔ اور آنے دیتے ہوتے تو دنیا کا یہ رنگ نہ ہوتا۔ پس موت کے یقین کے معنی یہ ہیں کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی سب آدمیوں کا حال یکساں نہیں ہے۔ بعض شاید دن رات میں ایک لمحے کیلئے بھی موت کا خیال نہیں کرتے اور بعض کا شاید کوئی منٹ موت کے خیال سے خالی نہ ہو۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حال میں لکھا ہے کہ انھوں نے گھر میں ایک سردابہ کھدوا رکھا تھا۔ سلطنت کے مشاغل سے فارغ ہو کر بالالتزام ہر روز کچھ دیر کیلئے موت کا خیال تازہ رکھنے کی غرض سے سردابے میں جا کر لیٹتے۔ زیارۃ قبور کی بھی اصل غرض یہی ہے کہ قبروں کو دیکھ کر آدمی موت کو یاد کرے اور سمجھے کہ ایک نہ ایک دن میری بھی یہی نوبت ہونی ہے۔ لیکن آدمی ایسا بے حیا ہے کہ عبرت کی

جگہ بزرگوں کے مزاروں پر میلوں کے جمگھٹے ہوتے یا خدائے حی وقیوم کی عوض عاجز مُردوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ قبریں تو قبریں ہم نے تو لوگوں کے جنازے کے ساتھ دیکھا ہے کہ کچھ تو رنج میں ہیں اس واسطے کہ میّت کے مرجانے سے اُن کی کچھ غرضیں فوت ہوئی ہیں کچھ تقسیم ترکہ اور مراسم غمی کے سوچ میں ہیں کچھ اُلاہنا اُتارنے کیلئے ساتھ ہوتے ہیں کہ کل کلاں کو کوئی یہ نہ کہہ بیٹھے کہ اتنا قریب کا رشتہ۔ ایسی محبت۔ ملاقات۔ چار قدم میّت کو کندھا لگاتے یا مٹی دیتے نہ بن پڑا۔ کیا مضائقہ جینا مرنا سبھی کے ساتھ ہے میّت کے ساتھ بھیڑ بھڑکا تو بہتیرا کچھ ہے مگر دلوں کو ٹٹولو تو کسی ایک کو بھی اس کا خیال نہیں کہ یہ ہوا تو کیا ہوا کہ ہم ہی جیسا آدمی سب کچھ تھا یا ایک پھونک نکل گئی تو کچھ نہ تھا۔ اور یہی منزل ہم سب کو درپیش ہے۔ نہیں معلوم کس وقت بلاوا آئے اور یہ سارا ڈھونڈا دھرا کا دھرا رہ جائے۔ بعینہ یہی حال ہے خدا کی معرفت کا کہ اُس سے انکار تو ہو نہیں سکتا کیونکہ انسان کی بناوٹ ہی اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ خدا کو مانے بدون اس کو چارہ ہی نہیں۔ مگر بعض تو ایسا ماننا مانتے ہیں کہ گویا خدا کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور بعض اس حد سے نہیں بڑھتے کہ انکار کرتے نہیں بن پڑتا اور ان دو حدوں کے درمیان بے شمار مدارج ہیں۔ کوئی ہمہ وقت مستغرق۔ کوئی اس سے کم۔ یہاں تک کہ کوئی بالکل بے خبر۔

سوال۔ خدا کے ماننے سے اس کا نہ ماننا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے جب ہم کو ایسا خدا ماننا پڑتا ہے جو آپ سے آپ موجود ہو گیا ہے تو کیوں نہ ہم دنیا ہی کو مان لیں کہ وہ آپ سے آپ موجود ہو گئی ہے؟

جواب۔ یہ اعتراض ہے انسان کے دل کی بناوٹ پر کہ کیوں دنیا کے آپ سے آپ موجود ہو جانے کو قبول نہیں کرتا۔ اور کیوں خدا کے ماننے سے اس کی تسکین ہو جاتی ہے۔

سوال۔ تو معلوم ہوتا ہے کوئی فرد بشر خدا سے منکر نہیں۔ اور منکر ہو نہیں سکتا۔ پھر مشرک اور بُت پرست اور دہرئے یہ کیا ہیں؟

جواب۔ بیشک۔ جس طرح کوئی آدمی جانور نہیں ہو سکتا۔ درخت نہیں ہو سکتا۔ پتھر نہیں ہو سکتا۔ اُسی طرح کوئی آدمی خدا سے منکر بھی نہیں ہو سکتا۔ آدمی ہونا اور خدا کا قائل ہونا لازم و ملزوم ہیں۔ جب تک آدمی آدمی ہے وہ خدا کا بھی ضرور قائل ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ آدمی ہو اور خدا کا قائل نہ ہو۔ تم مشرکوں کو منکر خدا سمجھتے ہو۔ ہم لوگ تو ایک خدا کو مانتے ہیں اور مشرک کئی خدا کے قائل ہیں۔ تو ان کو منکر خدا کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ خدا کا مصداق قرار دینے میں اور اس کی صفات میں غلطیاں کرتے ہیں۔ چاہیے خدا سمجھنا کسی اور کو اور سمجھ لیتے ہیں کسی کو۔ چاہیے سمجھنا کیسا اور سمجھ لیتے ہیں کیسا۔ اور اسی وجہ سے وہ منکر خدا سمجھے جاتے ہیں۔ اور ایک اعتبار سے الزام ہے بھی واجبی

سوال۔ آپ کو معلوم نہیں۔ ہزاروں آدمی ہیں جو سرے سے خدا ہی کے قائل نہیں۔

جواب۔ مجھ کو معلوم نہ ہو مگر جتنے لوگوں کو منکر خدا خیال کیا جاتا ہے اُن میں سَو پیچھے ایک بھی مشکل سے منکر خدا نکلے گا۔ اُن میں بہت سے ایسے لوگوں کو گن لیا جاتا ہے جو سرے سے اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ وہ کھاتے پیتے سو رہتے اور جانوروں کی طرح اپنی زندگی کے دن بسر کر دیتے ہیں۔ اُن میں بہت سے ایسے لوگوں کو گِن لیا جاتا ہے جو اس سبب سے کہ اُنھوں نے اچھی طرح غور نہیں کیا۔ خدا کے بارے میں طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ لوگ خدا کے حلم کی وجہ سے بھی گمراہی اور سرکشی کرتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص معاذ اللہ منکر خدا ہو یا اس کی جناب میں گستاخی کرے یا اس کا حکم نہ مانے تو دنیا میں اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا نہ اس پر بجلی گرتی نہ وہ ہیضہ کرکے مرتا نہ اس کے گھر میں آگ لگتی۔ اس سے اور بھی مغالطہ واقع ہوتا ہے اور کوئی کوئی نالائق خدا کے ساتھ کھیل کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ اُن کا خدع نفس ہے۔ جب اُن پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا کے آگے گڑگڑانے لگتے ہیں اور اصلی فطرت کھل پڑتی ہے۔ فرعون پر کیا گذری تھی کہ وہ دنیاوی خوش حالی کے غرّے میں آکر حضرت موسٰی علیہ السلام

کی ضد سے اپنے تئیں خدا کہتا رہا۔ جب لگا ڈوبنے اور اپنی درماندگی اس پر ثابت ہوئی تو چار و ناچار اُس کو خدا کا اقرار کرنا پڑا۔ اور ایک فرعون پر کیا موقوف ہے ہر ہر شخص بجائے خود فرعون ہے۔ اگر سوچے اور سمجھے۔ سُنتے ہیں کہ جو مجرم بڑے چالاک اور سیانے ہوتے ہیں ان کو شراب پلا دیتے ہیں کہ عقلِ فساد پر سے ان کا اختیار اٹھ جائے۔ اور وہ نشے کی حالت میں سارا کچا حال ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ تو جو شخص خدا سے انکار کرنے کا مجرم ہو اس کی شراب ہے مصیبت۔ کہ جب مصیبت پڑے گی اور اس کو اپنا عجز معلوم ہوگا ممکن نہیں کہ وہ اقرار نہ کرنے لگے۔ اور یہ شراب کسی کو زندگی میں نہ پلائی گئی تو مرتے وقت ضرور پلائی جائے گی۔ تو ایسا انکار کیا سند ہو سکتا ہے۔ مصیبت پڑے اور خدا یاد نہ آئے تو جانیں۔ اور یہی حکمت ہے کہ بزرگانِ دین نے تکلیف اور ایذا اور تنگ حالی میں رہنے کو پسند کیا ہے۔ کہ اس سے بہتر کوئی تازیانۂ غفلت ہو نہیں سکتا۔ آدمی ہو اور خدا سے منکر ہو ایسا ہے جیسے پتھر ہو اور اوپر سے گرایا جائے اور زمین پر نہ گرے۔

سوال۔ اگر آدمی منکرِ خدا ہو نہیں سکتا تو پھر شرک اور بُت پرستی پر اتنا شور و شغب کیوں اور اس قدر غیظ و غضب کس لئے؟

جواب۔ بس یہی بی۔ اے پاس کیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں بُت پرستوں اور مشرکوں کو منکرِ خدا نہیں سمجھتا اس عقیدے کے لوگ خدا کو تو مانتے ہیں مگر خدا کے مصداق کی تعیّن میں غلطی کرتے ہیں۔

سوال۔ اچھا پھر اس میں خدا کا کیا حرج ہے؟

جواب۔ خدا کا تو ذاتی کچھ بھی حرج نہیں۔ اگر ساری دنیا اس سے منحرف ہو بیٹھے اور اس کی خدائی کی قائل نہ ہو تو بھی وہ خدا ہے۔ اور تو بھی وہ دنیا جہاں کا خالق ہے۔ اور تو بھی وہ دنیا جہاں کا پروردگار ہے اور تو بھی وہ علیم ہے۔ اور تو بھی وہ قادر ہے۔ مثلاً روزِ روشن میں آفتاب بڑا چمک رہا ہے اگر ساری دنیا آفتاب سے آنکھیں موندے اور کہے کہ آفتاب نہیں اور یہ روشنی آپ سے آپ ہو رہی ہے۔ یا آفتاب کے سوائے کسی اور

چیز کی ہے تاہم آفتاب آفتاب ہے مگر ہاں ہم جو چیز بناتے ہیں ہر ایک چیز کی کوئی نہ کوئی غرض و غایت ہوتی ہے۔ مکان بناتے ہیں، رہنے کے لئے۔ کپڑا بناتے ہیں ستر عورت اور سردی گرمی سے بچنے کے لئے۔ اسی طرح خدا نے جو ہزاروں لاکھوں قسم کی مخلوقات دنیا میں پیدا کی ہر ایک مخلوق کے پیدا کرنے کی کوئی غرض و غایت ضرور ہے۔ بعض مخلوقات کی بعض اغراض کو انسان سمجھتا بھی ہے اور اکثر کو نہیں سمجھتا۔ شاید آگے کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ اور دنیا جو ترقی کر رہی ہے نئے نئے علوم ایجاد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ نئے نئے فنون نئی نئی کلیں نئی نئی صنعتیں اور اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ آدمی مخلوقات عالم کی اغراض و غایات سے واقفیت پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں خدا کو کس حد تک انسان کا واقف کرنا منظور ہے۔ انسان نے اسٹیم (بھاپ) اور الکٹرسٹی (قوۃ برقی) اور چیزوں کے کیمیائی خواص اور کیا اور کیا معلوم کر کر کے اپنے کتنے کام نکالے ہیں۔ اور کیا سب آدمی ہم مسلمانوں کی طرح جاہل اور بد نصیب ہیں۔ اہل یورپ کو دیکھو کہ ہم کو اُن کے مقابلے میں اپنے تئیں جانور کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کیا کچھ کر گذرے اور کیا کچھ کر رہے ہیں۔ اور کیا کچھ آگے کو نہ کریں گے۔ تو خدا نے جو انسان کو ایک خاص طرح کا مخلوق بنایا ہے اس کو عقل دی۔ اس عقل کی بھی غرض و غایت ہونی ضرور ہے اور وہ نہیں ہے مگر علم۔ یعنی اپنے تئیں جاننا اور اپنے سوائے اور چیزوں کو جاننا۔ کیونکہ اگر وہ جانے گا نہیں دنیا میں اپنے اختیارات کیونکر عمل میں لائے گا۔ دنیا کی چیزوں میں تصرفات کیسے کرے گا۔ اشرف المخلوقات کس طرح بنے گا۔ خلافت الٰہی کا بار کس برتے پر اٹھائے گا۔ پس علم انسان کی ابجد یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں جانے اور اپنے تئیں جانا تو خدا کو جانا۔ تو جس مصلحت سے خدا نے انسان کو پیدا کیا، جس مصلحت سے اس کو عقل دی، اُس مصلحت سے خدا ہی چاہتا ہے کہ انسان اپنے تئیں جانے۔ اور اپنے تئیں جانے گا تو خدا کو جانے گا پر جانے گا اگر انسان کے پیدا کرنے سے خدا کا کچھ ہرج تھا تو انسان کے اپنے تئیں نہ جاننے یعنی خدا کو نہ جاننے سے بھی اس کا ہرج ہو تو اس میں قباحت کیا ہے۔

خدا کا جاننا شرط انسانیت ہے۔ اگر انسان نے اتنی موٹی بات بھی نہ جانی کہ میں اپنے ارادے سے پیدا نہیں ہو گیا۔ اپنے ارادے سے زندہ نہیں ہوں۔ اپنے ارادے سے مروں گا نہیں میرے کئے سے دنیا چل نہیں رہی تو اس نے جانا ہی کیا۔ اور وہ جانے ہی گا کیا۔ یعنی خدا نے اس کو بنایا انسان اور اس نے بننا چاہا جانور۔ اور جانوروں میں گدھا اور گدھے سے بھی بدتر غرض جس طرح خدا نے انسان کو انسان بنایا۔ اس کو آنکھ دی کہ دیکھے۔ کان دئے کہ سنے۔ ناک دی کہ سونگھے۔ زبان دی کہ مزہ لے۔ بولے۔ اسی طرح خدا نے انسان کو عقل دی کہ اس سے کام لے۔ اور عقل کا پہلا کام ہے کہ خدا کو پہچانے۔ پس اگر خدا انسان سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے تو وہ حقیقتہ میں اپنے حکم کی تعمیل چاہتا ہے کہ میں نے اس کو انسان بنایا ہے یہ انسان بنے۔ مسئلہ ہے ذرا نازک۔ بہت غور کرنے سے ذہن نشیں ہوتا ہے۔ تین باتیں ہیں۔ خدا کو نہ ماننا۔ خدا سے غافل ہونا۔ خدا کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرنا۔ میرے نزدیک پہلی قسم بحث سے خارج ہے۔ یعنی ممکن نہیں کہ آدمی خدا کا قائل نہ ہو۔ جیسے ممکن نہیں کہ آنکھ صحیح و سالم ہو اور نہ دیکھے۔ کان صحیح و سالم ہوں اور نہ سنے۔ ہاں دوسری دو قسمیں کثیر الوقوع ہیں۔ یعنی لوگ اکثر خدا سے غافل ہیں۔ اور مصداق خدائی کی تعیین میں غلطی کرتے ہیں۔ بلکہ مصداق خدائی کی تعیین میں غلطی کرنا یہ بھی ایک طرح کی غفلت ہی ہے۔ ذرا بھی تامل کو کام میں لاؤ تو اس غلطی کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور دل بولنے لگتا ہے کہ یہ عناصر، یہ اجرام فلکی، یہ فرشتے، یہ پیغمبر، یہ بزرگان دین، یہ قبریں، یہ بُت، یہ خدا کے سوا جتنی چیزیں ہیں ان میں سے کسی کو خدا بننے کی صلاحیت نہیں۔ اس کو دین کہو تو فطرۃ اللہ کہو تو انسان کی خاص طور کی بناوٹ سمجھو تو بات ایک ہی ہے۔ وہ جو تنکے کی اوجھل پہاڑ سنا ہو بس وہی حال دین کا ہے۔ لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ اگر دو اور دو کا چار ماننا۔ چار تسلیم کرنا چار سمجھنا انسان کیلئے کوئی تعریف کی بات ہے تو بیشک اس کا خدا کو ماننا خدا کو تسلیم کرنا۔ خدا کو پہچاننا بھی تعریف کی بات سمجھی چاہئے۔ خدا کو ماننا تسلیم کرنا پہچاننا

تو تعریف کی بات نہیں۔ ہاں نہ ماننا، نہ تسلیم کرنا، نہ پہچاننا یعنی بداہت کا انکار البتہ الزام کی بات ہے۔ غرض آدمی منکر خدا ہو تو ہو نہیں سکتا مگر وہ دیوانہ اور مسلوب العقل ہو اور دیوانہ اور مسلوب العقل ہو تو وہ بیچارہ معذور مرفوع القلم ہے۔ ہاں انسان سے خدا کے بارے میں غفلت ہو سکتی خدائی کی مصداق کی تعین میں غلطی ہو سکتی اور ہو سکتی کیا کثرۃ سے ہوتی تھی۔ اور وقتاً فوقتاً پیغمبر آتے رہے۔ (مولوی نذیر احمد دہلوی۔ از رویائے صادقہ)

پنڈت رتن ناتھ۔ در سرشار

لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے جب ان کے والد پنڈت بیجناتھ صاحب کا انتقال ہوا اپنے لکھنؤ ہی میں تعلیم پائی۔ عربی۔ فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے ۱۸۷۸ء میں آپ اودھ اخبار کے اڈیٹر ہوئے۔ وہاں سے علیحدگی کے بعد اپنا ایک خاص رسالہ "خمکدہ سرشار" نکالنے لگے ۱۸۹۰ء میں آپ حیدر آباد گئے۔ ہز اکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد اُس زمانے میں وزیر افواج تھے۔ سرشار وہیں رہتے تھے ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد ہی میں آپ راہی ملک بقا ہوئے۔

آپ فسانہ نگاری کے طرز جدید کے موجد ہیں۔ آپ کی تصانیف سے سیر کہسار۔ جام سرشار۔ فسانہ آزاد مشہور ہیں۔ ان سب میں بہتر تصنیف فسانہ آزاد ہے۔ اس میں جس واقعہ۔ منظر۔ مناظر قدرت کو دکھلایا ہے اُس کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ واعظ۔ افیونی۔ بھٹیاری جس کی زبان لکھی ہے پورا خاکہ اُتار لیا ہے۔ مستورات کی زبان کو ایسی صحیح طور سے ادا کیا ہے۔ گویا بیگمات ہی کی زبان ہے فسانہ آزاد لکھنؤ کی اُس وقت کی سوسائٹی کا دلچسپ مرقع ہے۔

پند شود مند

حسن آرا کے انتقال پر ایک مرد معمر کا ماتمیوں کی جماعت کو نصیحت کرنا

ہشیار باش خواجہ کہ از مرگ چارہ نیست　　غافل مشو کہ عمر عزیزت دوبارہ نیست

در زندگی بکوش کہ فرصت ہمیں دم است　　زیرا کہ روز مرگ بہ کس آشکارہ نیست

بھائیو! اس وقت تم جس قدر آدمی یہاں کھڑے ہو سب کا دل بھر آیا ہے۔ اور وجہ یہ کہ ایک نوجوان کی وفات کی خبر نے تم کو انتہا کا مغموم وملول کر دیا ہے۔ یہ حادثہ حسرت انگیز اور سانحہ عبرت خیز ہے کہ جس قدر زیادہ افسوس کریں کم ہے۔ یہ لڑکی جس نے اپنی جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ابھی بہت ہی کم سن تھی۔ صورت اور سیرت میں لاکھوں میں لاجواب کروروں میں انتخاب۔ عفیفہ اس درجہ کہ اس کی پاک دامنی کی قسم کھانی چاہئے مگر جس خدا نے اس کو پیدا کیا تھا اُس نے واپس لے لیا۔ امانت تھی لے لی۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ اگر اس مجمع کثیر میں سے کسی شخص کی اس دختر نیک اختر پر نظر پڑتی تو کہہ اٹھتا کہ خدا کی قدرت کاملہ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس صانع کی صنّاعی کے صدقے۔ جس نے یہ پیاری صورت بنائی ہے۔ اب جا کر دیکھو تو وہی صورت جس کو دیکھ کر کل خدا کی قدرت مجسم نظر آتی تھی بھیانک اور ڈراؤنی معلوم ہو۔ آنکھیں بند ہیں۔ منھ اب حشر تک نہ کھلے گا۔ چاند سے چہرے پر گہن آگیا۔ اور اس طرح کہ قیامت تک نہ چھوٹے گا لب سیاہ ہو گئے اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے سے معذور ہو گئے۔ اللہ بس۔ باقی ہوس۔ اعضا وہی ہیں۔ جسم وہی ہے۔ ہاتھ وہی۔ پانوں وہی، منھ وہی، زبان وہی، مگر سب بیکار۔ آمین اللہ کرے اس کی ماں نے پالا ہو گا۔ امیر کی لڑکی تھی۔ نازو نعم کی پروردہ۔ مگر تھوڑی دیر میں بخوشی عام خاص اسی کے اعزا و اقربا اس کو گورستان لیجائیں گے اور دفنا دیں گے۔ وہ سیم بدن جو دھوپ میں شہ نشیں سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ اب خاک کے سپرد کیجائے گی۔ ع ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد۔

دردیست اجل کہ نیست درماں او را　　بر شاہ و گدا است حکم و فرماں او را

شاہے کہ بحکم دوش کرماں مے خورد　　امروز ہمے خورند کرماں او را

اس سے یہ نتیجہ نکلنا چاہئے کہ انسان کو دو روزہ زندگی کے لئے بغض اور تعصب

سے کنارہ کش ہونا لازم ہے۔ عداوت کس زندگی کے لئے؟ افسوس صد افسوس ایک ایک دیوار کے جھگڑے پر لوگوں نے اپنی جان دی ہے یا پڑوسی کی جان لی ہے۔ مر گئے تو نہ دیوار ساتھ گیا نہ دیوار گئی۔ جانتے سب ہیں کہ موت سے چارہ نہیں مگر جو نتیجہ اس امر کے علم سے مستخرج ہونا چاہئے اس سے ذرا سروکار نہیں حیف صد حیف کیا مشکل معاملہ ہے۔

لوگوں کا قاعدہ ہے کہ کار امروزہ را بفردا مگذار کے مفہوم پر مطلق نظر نہیں ڈالتے سوچتے ہیں کہ رفتہ رفتہ منہیات و معصیات سے اجتناب کریں گے۔ ساٹھ برس کے ہولیں تو توبہ کریں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ غافل ذرا عبرت نہیں حاصل کرتے۔ ذرا نہیں سوچتے کہ آج مرے کل دوسرا دن۔ زندگی کا بھروسہ کیا۔ یہ کس برتے پر کہتے ہیں کہ آج نہیں کل۔ کل نہیں پرسوں۔ جو کام آج ممکن ہے اس میں دریغ نہ کرو۔ کل کی کل سمجھی جائے گی۔

یہ سمجھنا کہ مر گئے تو خاک میں مل جائیں گے۔ پھر عذاب و ثواب کون بھگتے گا بڑی غلطی ہے۔ جسم چاہے جہاں جائے۔ مگر ملک جسم کے شہنشاہ سے اُس کا ضرور مواخذہ کیا جائے گا۔

صد سال اگر سخن زما خواہد رفت　　آخر بہ نفخت فیہ واخواہد رفت
ہر کس گوید بخاک خواہم رفتن　　فکرے نہ کہ اصل من کجا خواہد رفت

اس دوروزہ زندگانی کے لئے حرص اور طمع اور حسد اور بغض اور تعصب اور نفسانیت اور خودی اور نخوت اور فساد اور عناد اور غضب اور غصہ یہ سب انسان کے روزمرہ کے مہمان ہیں بعض آدمی سمجھتے ہیں کہ جب ہم توبہ کریں گے تو بہ مخواے اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ وہ بالکل معصوم ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے۔ مگر ع نکتہ ہا ہست بسے محرم اسرار کجا؟ دیکھو! یہ نوجوان اور حسین لڑکی ابھی ہنس رہی تھی اور اب دم کی دم میں یہ

کیفیت ہو گئی کہ وہ خود دنیا و مافیہا سے بے خبر ہے۔ مگر اس کے اعزہ واقربا ماتم کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بات کی بات میں جان نکل گئی۔ اس بے ثبات زندگی پر حسد اور نفسانیت کے کیا معنی۔ اس دو روزہ زندگانی پر یہ گھمنڈ کہ ہم امیر کبیر ہیں۔ ہم درویش کامل ہیں ہم حاکم۔ ہم نثار۔ ہم شاعر۔ ہم عالم فاضل ہیں۔ ہمچو من دیگرے نیست۔

این جہاں نقشے بر آبے بیش نیست — موجِ آبے یا سرابے بیش نیست
پیش نورِ چشمِ عبرت بین ما — اوجِ گردوں بر حبابے بیش نیست
این ہمہ جوش و خروشِ ہر دو کون — جز خیالاتے و خوابے بیش نیست

اللہ بس۔ باقی ہوس۔ مقبول بندے خدا کے وہی ہیں جو دنیا سے نفرت کرتے ہیں

(پنڈت رتن ناتھ سرشار از فسانۂ آزاد جلد ۲)

کہسار رشک بہار اور آبشار طرب بار

یوں تو سفر نینی تال میں ہر مقام عشرت منزل اور طرب کاشانہ تھا۔ مگر بر بھٹی سے جو نواب صاحب کی سواری مثل باد بہاری چلی تو تھوڑی دور پر ایک ایسا دلکش سماں دیکھا کہ روح بلا مبالغہ وجد کرنے لگی۔ اس دلاویز دلربا سماں نے روح کے ساتھ وہ کیا جو چاندنی چکورا اور گھٹا مور کے ساتھ کرتی ہے۔ مشہور ہے کہ ایک زمانے میں ہندوستان میں ہنس موتی چگتے تھے۔ لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ وہ کوہی مقام ہے جہاں پہاڑ موتی اگلتے ہیں۔ اگر اس پہاڑ کی شان میں ابو الفیض فیضی کے یہ شعر لکھیں تو می زیبد۔

عہد تو بہ عشرت دل آویز — رو دیست ز حسن و عشق لبریز
رنگین چمنے است روزگارت — گلہاست شگفتہ در بہارت

ایک ایک پھول نور کا بکّا تھا۔ سبزے کا وہ روپ کہ زمرد دیکھ پائے تو ہیرا کھائے اور پھر آبشار صفا بار کا جلوہ نظر آیا تو گویا خدا کی قدرت کو مجسم روبرو پایا۔ پہاڑی ندیوں کا پانی بڑی دور سے پہاڑوں سے ٹکراتا ہوا اس مقام پر کئی جگہ زور سے ٹکر کھا کر بہ آواز بلند

گرتا تھا۔ اور پہاڑ اس قدر اثیر و رفیع تھے کہ اگر چوٹی پر نظر ڈ لیئے تو ٹوپی ایڑی پر آ رہتی۔ اس بلندی اور رفعت سے زلال پانی کا ادھر اُدھر ٹکرا کر گرنا عجب کیفیت بخشتا تھا۔ پانی کیا آبِ حیات ہے۔ بلکہ آبِ حیات بھی اس کے مقابل میں گرد اور مات ہے۔ ان کالے کالے پہاڑوں میں روح نے دم پایا۔ ع آنچہ در ظلمت سکندر آرزو کرد و نیافت۔

دُرِّ ثمیں اگر صفائی کا دعوی کرے تو بے آبرو ہو جائے۔ زُہّادِ خشک کے دل کی طرح صاف ہے۔ جس سے سلسبیل و کوثر پر روضۂ رضواں کو ناز ہے اُس سے کہیں شفاف ہے معلوم ہوتا تھا کہ صبح عید کو کھرل میں حور و غلماں نے اپنے گورے گورے ہاتھوں سے لوٹے لالا سُرمہ سا کر کے اس پانی میں ملائے ہیں۔ نورِ دیدۂ حور بھی گرد ہے۔ آفتاب کی ضو بھی آب و تاب سے خجل ہے۔ چاندنی چاہے کیسی ہی شفاف ہو اس کے سامنے میلی ہی معلوم ہوگی۔ عجب دلکش مقام ہے۔

ہر سمت ہوائے روح افزا	دم جس کا بھرے دمِ مسیحا
جنبش دہِ دست و پائے تصویر	تن پرور و جاں فزائے تصویر
اور اس پہ وفورِ ابرِ باراں	ہنگامۂ عید بادہ خواراں
ابر و گل و سبزہ سب طرب ریز	افلاک و زمیں سرور انگیز
رخسارِ زمیں پہ سبزہ ہر سو	ریحاں خطِ عذارِ گلرو
از بس کہ ہے سبزہ جلوہ آرا	ہے خاک طلسم چرخ خضرا
یوں سبزہ گیاہ جاں فزا ہے	گویا خط یار دلربا ہے
خودرو گل کوہ کیسے کیسے	شاید کہ بہشت میں ہوں ایسے
ہر رنگ کے گل جو ہیں نمودار	صحرا کی زمیں ہے صحن گلزار
ہے سرخ تو رشک لالہ و گل	ہم رنگ سرشک خون بلبل
ہے کوئی اگر سیاہی مائل	سُرمہ دیدۂ اہل حسن کا تل

ہے زرد تو نور چشم گلزار | یا جلوۂ حسن عاشق زار
اور ہے جو سپید تو وہ دلخواہ | جیسے شب ہجر کی سحرگاہ
ان پھولوں سے ہے زمیں جو رنگین | ہے کوہ نگار خانۂ چیں
شرما کے ہے بید سے نگوں سر | فوارۂ آب حوض کوثر
گر کوہ نہیں ہے غیرت باغ | ہے لالہ کے دل میں کس لئے داغ
سنبل کو یہ پیچ و تاب کیوں ہے | احوال چمن خراب کیوں ہے
اس وقت عجیب اک سماں تھا | ان سب پہ سپہر مہرباں تھا

قافلے کا قافلہ اس بہار روح پرور پر لوٹ ہو گیا۔ اور حکم ہوا کہ یہاں ذرا ٹھہر جائیں گے ٹھہرنے کے بعد نواب صاحب اور اہل قافلہ اور میاں آزاد نے کوہ طرب افزا کے چاروں طرف دیکھا تو قدرت خدا کی بہار پر عش عش کرنے لگے۔ چاروں سمت جلوۂ کوہ فلک شکوہ۔ اور جوف کوہ میں ایک چھوٹی سی ندی کا چکر کھاتے ہوئے جانا۔ زلال پانی کی تہ سے سنگریزوں کا صاف نظر آنا۔ ہر طرف سبزۂ بیگانہ و خودرو کا لہرانا۔ روح کے ساتھ وہ کرتا تھا جو شب ماہ تدرو مست خرام اور ابر گہربار طاؤس مرصع دُم کے ساتھ کرتا ہے۔ خصوصاً جب کوہ فلک تمکین کی آبشار کے صاف و شفاف پانی پر نظر پڑی تو روح کو واقعی بالیدگی ہونے لگی۔ کئی میل سے پانی پہاڑوں سے ٹکر کھاتا اور چکر کھاتا ہوا اس زور سے گرتا تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ اور ایسا صاف و شفاف اور بگلے کے پر سے کہیں زیادہ سفید پانی تو اس چھوٹے سے قافلے میں کسی نے کبھی بیشتر نہیں دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حوران جنت اور راجہ اندر کے اکھاڑے کی پریوں نے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے آب گوہر گراں بہا کو جوئے شیر میں غوطہ دے کر حل کیا ہے۔ اور ہمالچل پربت کی ان دو ندیوں میں ملا دیا ہے جن کے قریب جا کے پہاڑوں کی کھوہوں میں ہنود کی روایات مذہبی کے مطابق رشی اور منی اور خدا شناس

آئے گا کہ زمین شق ہو جائے گی۔ اور ہلنے لگے گی۔ اور اس مقام سے شعلہ نکل پڑے گا۔
اسی طرح زمین میں گندھک اور شورے کے بخارات بھی باعث اشتعال وجنبش ارض ہو جاتے ہیں۔ شاید بعض لوگوں کو استعجاب ہو گا کہ زمین کے اندر آگ کہاں سے آئی مگر یہ اصلا مقام حیرت نہیں۔ علمائے یگانہ وحکمائے فرزانہ نے بہ دلائل عقلیہ اس کو ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ زمین کے درمیان حضرت خالق اشیاء نے ایسی چیزیں بہ کثرت مخلوق کی ہیں جو بوجہ من الوجوہ مشتعل ہو جائیں۔ اور اشتعال کا سبب وہ حرکت شدیدہ ہے جو بخارات میں طلب خروج کے لئے حادث ہوتی ہے۔ جس قدر سبب اشتعال خفیف ہوتا ہے اُسی قدر انسان کو حرکت زلزلہ خفیف محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کی جنبش قریب قریب ویسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے جہاز یا آگبوٹ کے بیٹھنے والوں کو جہاز اور آگبوٹ کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔ اکثر اوقات زلزلہ ایک طرفۃ العین میں موقوف ہو جاتا ہے۔ کبھی علی الاتصال کئی دن تک رہتا ہے۔ اس کے صدمے سے مکانات شق ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر جڑ سے گر پڑتے ہیں۔ اور اشیاء مرتبہ تہ وبالا ہو جاتی ہیں
فرانسیسی۔ کوئی اور وجہ بھی بتائیے۔
آزاد۔ ہاں۔ پہاڑ اور بڑے بڑے پتھر خود بخود زمین کے غار میں گر پڑتے ہیں اور اس زور سے باہم ٹکر کھاتے ہیں کہ زمین ہل جاتی ہے۔ جب شورے اور گندھک وغیرہ کے اجزا کو کسی وجہ سے زمین کے اندر غلیان پیدا ہوتا ہے تو شعلے ہر چہار طرف سے مستعد بہ خروج ہوتے ہیں۔ اگر اس کے زور سے زمین منشق کسی قدر مرتفع ہو جائے گی اور شعلہ کوہ آتش فشاں کے دہانہ سے نکل جائے گا۔ اگر مقدار اجزا بہ کثرت نہ ہوئی تو فقط زمین ہی متحرک ہوگی۔ کوہ آتش فشاں کے ذریعے سے شعلہ نکلے گا۔ بلکہ حرارت کی وجہ سے اجزاے رقیق ہو کر کسی منفذ سے خارج ہو جائیں گے۔ دیکھئے میں کچھ اور حال پڑھ کر سناؤں۔
مسٹر ہوائٹ برسٹ اور لارڈ ڈوالامیو کا مقولہ ہے کہ اسباب زلزلہ میں آگ اور پانی

جزو اعظم ہیں۔ یعنی ان کے بغیر حدوث زلزلہ غیر ممکن ہے۔ کیونکہ رطوبت میں جب تک حرارت نہ اثر کرے گی تب تک تولید بخارات نہ ہوگی۔

فرانسیسی۔ آپ نے کہاں تعلیم پائی؟۔

آزاد۔ خاص ہندوستان میں۔

کتاب میں ہم نے پڑھا اور آپ نے بھی سُنا ہوگا کہ گینو کی ایک زلزلہ لزبن ۱۷۵۵ء میں شہر لزبن دار السلطنت پرتگال میں ایسا سخت اور مہلک زلزلہ آیا تھا کہ اس کے صدمے سے زمین کا کلیجہ پھٹ گیا۔ اور شور حشر و ہنگامۂ قیامت قائم ہو گیا تھا جس کے سُننے سے آج تک انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس کی کیفیت بالتفصیل و التوضیح معرض بیان میں لاتے ہیں۔

ناظرین باتمکین کو معلوم ہو کہ پہلے لزبن کے باشندوں کو قبل از آمد زلزلہ معلوم ہوا کہ بگّی کی گھڑگھڑاہٹ کی سی آواز زمین کے اندر سے آرہی ہے۔ حیرت میں تھے کہ یا للعجب یہ کیا بلا ہے جو زمین کے اندر عجب طرح سے غنغنا رہی ہے؟ رفتہ رفتہ وہ آواز بڑے زور شور سے آنے لگی۔ اور لوگوں کے دل پر دہشت و ہیبت چھانے لگی۔ یکایک معلوم ہوا کہ سیکڑوں الواپ اژدر دہاں زمیں لرزاں سر ہو رہی ہیں۔ دفعتہً زلزلہ آ گیا۔ لوگ بدحواس ہو گئے کہ یہ کیا آفت ناگہانی و حیرت خیز ہے اور کیسا واقعہ نادیدنی و عبرت انگیز ہے۔ سب بہ گریہ و زاری دست بہ دعا تھے کہ بار خدایا خیر کیجیو۔ اور شرّ آفات سے بچائیو۔

فرانسیسی۔ یہ کہاں پڑھا؟۔

آزاد۔ شمس الضحےٰ ایک کتاب ہے اُس میں دیکھا کہ آخر کار ایوان خسروی جو صناعان کامل فن اور معماران اعجاز پیشہ کی دستکاری سے بہ صرف زر خطیر طیار ہوئے تھے۔ بہ چشم زدن مٹی میں مل گئے۔ قس علی ہذا۔ اُمرائے ذوی الاحترام و رؤسائے عالی مقام کی عمارات، عالی شان اور غریبوں کے جھونپڑے اور مکان تہ و بالا ہو گئے۔ جس دن یہ زلزلہ

آیا اُس دن اتفاق سے گرجاؤں اور معبدوں میں آدمیوں کا ایسا ازدحام عام تھا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ جس وقت یہ معبد بحکم معبود سر بہ سجود ہوئے ہزارہا بندگان خدا عدیم الوجود اور فائز بہ منزل مقصود ہوئے۔ گرجا گھر گر جانے سے اس وقت رو کش گورستان بن گئے تھے۔ شہر میں کوئی بیچارہ سسکتا تھا۔ کوئی درخت کے نیچے دبا ہوا نکلتا تھا۔ عورتیں اپنے پیارے بچوں کو چھاتی سے چمٹائے کلیجے سے لگائے دیوانہ وار ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی تھیں۔ سراسیمگی میں قدم قدم پر گرتی تھیں ذکور و اُناث جوان و اطفال اور پیرانِ کہن سال سب تباہ و خستہ حال جان بچاتے پھرتے تھے۔ زندگی کے لالے پڑے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ کافر زلزلہ چند منٹ بعد موقوف ہوا جو لوگ جیتے بچے تھے وہ ہنوز سسک رہے تھے۔ اور خدا کے شکر میں گرم گفتار تھے کہ اس بلائے بے درماں سے ان کو محفوظ و مصئون رکھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد۔

ہردم زمانہ داغ دگر بر جگر نہد   یک داغ نیک ناشدہ داغِ دگر دہد

کا معاملہ ہوا۔ یعنی سمندر لہریں مارتا ہوا شہر میں داخل ہوا۔ جو محلے کسی قدر پستی میں واقع تھے وہ فوراً غرق آب ہو گئے۔ یہ حال عبرت مآل مشاہدہ کر کے تین ہزار آدمیوں نے ایک بڑی عالی شان عمارت میں جا کر پناہ لی جو اُس وقت بہ اعتبار استحکام متحمل صدمات امواج آب سمجھی گئی تھی اور سمجھ بیٹھے کہ جس طرح طوفان نوح میں صرف وہی لوگ بچے جو کشتیِ نوح پر سوار تھے۔ اسی طرح اس پختہ مکان میں صرف ہم ہی لوگ محفوظ رہیں گے۔ باقی تمام شہر غرق ہو جائے گا۔ لیکن پختہ مکان کا بھروسہ خیال خام تھا اور اس عمارت کا استحکام برائے نام تھا۔ قضیہ اس کے برعکس پایا گیا۔ طوفان نے ستم ڈھایا کہ اس قصر بلند کو دم کے دم میں ڈھایا۔ زلزلے نے اس پختہ مکان کی بنیاد کو ہلا ہلا کر ایسا کمزور کر دیا تھا کہ پانی نے آناً فاناً گرا دیا۔ اور اُن تین ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی جان بر نہ ہوا۔ یہ سانحہ ہوش رُبا اور واقعہ حیرت انتما لو دن میں گذرے

اب رات کا اندھیر سنئے۔

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے　　اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

ادھر آفتاب غروب ہوا اُدھر دوسرا گُل کھلا۔ ایک اور شعلہ نمودار ہوا۔ جس قدر مکان گر گئے تھے۔ ان سب میں از خود آگ لگ گئی۔ زلزلے اور طوفان سے جو بچا تھا اُس کو آگ نے جلا دیا۔ آنچہ از دزد باقی ماند رمال برد۔ طوفان سے جو بچا تھا وہ آگ کے نذر ہوا۔ ع پارۂ را سوخت آتش پارۂ را آب برد ۔ آگ کے شعلے نٹو مقام پر نمودار ہوئے اور چھ دن تک برابر جلا کئے۔ آخر کار جب حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان آفات ارضی و سماوی سے ساٹھ ہزار آدمی خاک میں مل گئے۔ دور دور کے شہر ہل گئے۔ اور کئی پہاڑ تڑق گئے۔ گویا۔ مصرع زمیں ہل گئی کانپ اٹھا آسماں ۔ اس سانحے کی شان میں کہا گیا۔

بالغ خردان ذی ہنر اور حکمائے فیض گستر نے اس بات کا دریافت کر لینا نہایت آسان کر دیا ہے کہ زلزلہ کس وقت آئے گا۔ آدھ گھنٹہ پیشتر یہ امر بہ آسانی تمام دریافت ہو سکتا ہے اور صورت اُس کی یہ ہے کہ یہ امر قوانین قدرت سے ہے کہ زلزلہ آنے سے کچھ دیر پہلے مقناطیس کی قوت جاذبہ بالکل زائل ہو جاتی ہے پس اگر ہم مقناطیس کو دیوار میں کسی طرح لگائیں۔ اور اس کے قریب ایک آہنی ٹکڑا رکھ دیں تو مقناطیس اپنی قوت جاذبہ سے فوراً اس کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔ جس جگہ یہ مقناطیس کا لوہا لگا ہو۔ اس کے نیچے ایک پیتل کا برتن رکھ دیں۔ زلزلہ آنے سے کچھ دیر پہلے مقناطیس کی قوت جاذبہ زائل ہو کر لوہا اس پیتل کے برتن پر گر پڑے گا اور اس کھٹاکے کی آواز ہو گی کہ مکان گونج جائے گا۔ اس آواز سے مکان والے سمجھ جائیں گے کہ آدھ گھنٹے میں زلزلہ آنیوالا ہے۔ واقع میں کیا خوب ترکیب ہے۔ جس کے ذریعے سے لوگ خبردار ہو کر تا امکان تدابیر حفاظت میں جد و جہد کر سکتے ہیں۔ (پنڈت رتن ناتھ سرشار از فسانۂ آزاد جلد ۳)

مسٹر اینڈرسن کے لیکچر کی تائید میں آزاد کی تقریر

رسوم مذموم کا چھوڑ دینا یا بُری باتوں کے عوض میں نئی اور عمدہ باتوں کا سیکھنا نہ غیر ممکن ہے نہ بے ادبی۔ یہ تو بدیہی اور ضروری ہے کہ حکمائے متقدمین نے علم حکمت کو دو حصوں پر منقسم کیا ہے۔ اولاً حکمت نظری۔ ثانیاً حکمت عملی۔ حکمت نظری میں علم مابعد الطبیعۃ کا تذکرہ ہے۔ اور حکمت عملی کی تین قسمیں ہیں۔ تہذیب[۱] اخلاق۔ تدبیر[۲] منازل۔ سیاست[۳] مدن۔ اور سب باتوں سے قطع نظر کر کے ہم اخلاق کی رو سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان نیک سے بد اور بد سے نیک ہو سکتا ہے۔ خُلق کی دو قسمیں ہیں۔ خلق طبعی اور خلق کسبی۔ خلق طبعی اس کو کہتے ہیں جو طبیعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے ہنسنا۔ اور خلق کسبی وہ ہے جو عادت سے متعلق ہو۔ مثلاً تڑکے اُٹھنا۔ خلق طبعی غیر ممکن الزّوال ہے۔ اور خلق کسبی کوئی سریع الزّوال ہے۔ معلم اول یعنی ارسطاطالیس کا مقولہ ہے کہ خلق کوئی طبعی نہیں ہے۔ اور شاید معلم ثانی ابونصر فارابی کا قول ہے کہ انسان اصل میں مجسّم شر ہے۔ لیکن تعلیم و تلقین سے اس کی طبیعت اخلاق کو قبول کر لیتی ہے۔ جالینوس اور بطلیموس کی یہ رائے ہے کہ بعض انسان بالطبع اہل خیر ہیں اور بعض بالطبع اہل شر ہیں۔ حکمائے متاخرین میں سے حضرت محقق طوسی نے یوں تحقیق کیا ہے کہ ہر ایک خلق قابل تغیر ہے۔ اور جو شے قابل تغیر ہے وہ طبعی نہیں۔ پس کوئی خلق طبعی نہیں ہے۔ محقق دوانی نے لکھا ہے کہ اگر خلق قابل زوال نہ ہوتا تو خدا قوت متخیلہ اور قوت تمیز نہ پیدا کرتا۔ غرض کہ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ اخلاق قابل زوال ہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ رسم کو اخلاق طبعی سے تعلق ہے یا کسبی سے۔ ہمارے علم و یقین میں رسم کو طبیعت سے مطلق مناسبت نہیں۔ مگر دعوے بے دلیل کے مہمل ہوتا ہے۔ پس ہم شکل بدیہی الانتاج قائم کر کے چٹکیوں میں ثابت کئے دیتے ہیں کہ رسم کا اجرا خلق کسبی میں داخل ہے۔ صغریٰ رسم ممکن الزوال ہے۔ کبریٰ جو ممکن الزوال ہے طبعی نہیں۔

نتیجہ۔ پس رسم طبعی نہیں۔

دوسرا ثبوت طبیعت جوہر ہے اور رسم عرض ہے۔ جوہر بالذّات اور عرض بالصّفات۔ پس رسوم جو متعلق عادت ہیں بالصفات ہیں بالذّات نہیں۔ اب اگر کوئی صاحب فرمائیں کہ جب رسوم کا تغیر ممکن ہے اور اکثر اصحاب کوشش بلیغ کر رہے ہیں تو پھر مراسم شایستہ کا اجرا اور افعال ناشایستہ کا ترک کیوں عمل میں نہیں آتا۔ اس کا جواب بصد عجز یہ ہے۔

اوّلاً۔ العادۃ کالطبیعۃ الثانیہ۔ علماء کا قول فیصل ہے۔ بعض رسوم ایسی ہیں کہ وہ ہماری طبیعت کے ساتھ خمیر ہو گئی ہیں اور شکر و شیر کی طرح مل گئی ہیں اُن کا دفعیہ غیر ممکن ہے۔

ثانیاً۔ اگر ایک خالی گھڑے کو اوندھا کر کے پانی میں دبا دیں تو وہ پانی سے بھر نہ جائے گا کیونکہ ہوا اس میں موجود ہے۔ اسی طرح جب تک ہم لوگوں کے دل سے پرانی باتوں کا ذہن نشیں ہونا علم طبعیات کے مسئلہ امتناع تداخل سے غیر ممکن الوقوع ہے۔

ثالثاً۔ جرّ اثقال سے ثابت ہے کہ اگر دو مساوی قوتیں ایک جسم پر ایک ہی سمت میں عمل کریں تو اس قسم کی رفتار دوچند ہو جائے گی۔ اور اگر دو مساوی قوتیں سمت مقابل میں عمل کریں تو جسم مذکور ساکت رہے گا۔ اور جو غیر مساوی قوتیں کسی جسم پر سمت مقابل سے عمل کریں تو جو قوت زیادہ ہو گی اُس کا عمل ظہور ہو گا۔ فرض کیجئے کہ قوم ایک جسم ہے جس پر دو قوتوں نے اپنا عمل جاری کیا اس طور پر ایک قوت چاہتی ہے کہ جسم مذکور ملکات فاضلہ کی طرف لے جائے اور اسی وقت دوسری قوت اس کو ملکات ردیہ کی طرف بھیجتی ہے تو جو قوت زیادہ ہو گی اس کا عمل بقدر زیادہ ظہور میں آئے گا۔

رابعاً۔ بڑے بڑے تجربہ کار آدمیوں کا قول ہے کہ جس چیز کو ہم عرصہ دراز سے کرتے آئے ہیں وہ چاہے کیسی ہی خراب ہو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ آئرلینڈ کے مشہور اور لائق نثار اور شاعر نے لکھا ہے کہ فرانس کے بادشاہ نے ایک مرتبہ ایک قیدی کو رہا کر دیا جو ساٹھ برس تک قید خانے میں رہا تھا۔ وہ جا کر بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اور دعا دے کر التماس کیا

کہ میں ساٹھ برس سے قید خانے میں رہنے کا عادی ہوں مجھے وہی پسند ہے۔ اور چاہتا ہوں کہ پھر قید خانے میں جاؤں۔ اسی طرح پرانی رسموں کا بھی حال ہے کہ چاہے اصل میں کیسی ہی خراب ہوں مگر بھلی معلوم ہوتی ہیں باقی رہا یہ امر کہ جو لوگ اور قصبوں میں ہیں وہ اپنے لڑکوں کو کیونکر تعلیم دیں؟ اس کی نسبت ہماری رائے یہ ہے کہ اگر دال روٹی سے خوش ہوں تو ممکن ہے اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ۔ ایک مشہور و معروف عربی جملہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر علم چین میں ہو تو وہاں جاکے سیکھو۔ شاید کوئی صاحب چیں بہ جبیں ہوں کہ تحصیل علم کچھ چین ہی پر منحصر نہیں۔ جہاں علم ہو وہاں سیکھنا چاہئے۔ پھر چین کی کیوں خصوصیت کی اس میں کیا سُرخاب کا پر ہے؟۔

حضرت یہ ایک نکتہ ہے۔ ذرا کان دھر کے سنئے۔ چین براعظم ایشیا کے شہروں میں ہے اور عرب عرب میں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر بعد المشرقین ہو تو بھی قصرِ ہمت نہ کرو۔

طلب کردنِ علم شد بر تو فرض　　دگر واجب است از پیش قطع ارض

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ تحصیل علم کے لئے قطع ارض کرتے ہیں یا نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ گھر سے اسکول تک جانے کو ہم لوگ عموماً بڑی منزل طے کرنا سمجھتے ہیں مگر بعض علم دوست ایسے بھی ہیں جو اپنے لڑکوں کی تعلیم میں سرگرم رہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی بعض اتفاقات کے سبب سے ان کی آرزو بر نہیں آتی۔ اکثر لوگ زبان انگریزی سے ناواقف ہیں۔ اور اگرچہ لڑکوں کو اسکول بھیجتے ہیں مگر اُن کی تسلی نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں برسر روزگار ہیں۔ وہاں اچھا مدرسہ مفقود ہے۔ پس لڑکے مفت میں تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ ہم ایک نسخہ بتائے دیتے ہیں۔ یہ نسخہ لاکھ روپے کا ہے۔ اگر کوئی اس پر عمل کریں تو ہم پر احسان نہیں۔ عنایت نہیں۔ نہ عمل کریں تو حاشا ہم کو شکایت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اپنے صاحبزادوں کو کسی ایسے رشتہ دار کے پاس بھیجیں جس کی لیاقت اور متانت پر ان کو پورا بھروسا ہو اور جو طرز تعلیم میں کماحقہٗ تجربہ رکھتا ہو۔ عام اس سے کہ وہ کسی شہر دور دراز

فاصلے پر ہو۔ جو لوگ درس سے شوق اور تدریس سے ذوق رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ طرز تعلیم ایسا سہل نہیں ہے جیسا لوگ سمجھ بیٹھے ہیں۔ یوں تو ہر فرد بشر کو اپنی جگہ پر زعم ہوتا ہے کہ میں طرز تعلیم سے خوب واقف ہوں۔ ارسطو کو اپنے سامنے طفل مکتب سمجھتا ہے۔ مگر جو لوگ بغیر تجربے کے اس مشکل کام کے جاننے کا دم بھرتے ہیں ان پر یہ مثل صادق آتی ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

بہر حال اپنے لڑکوں کو اپنے اعزا و اقربا میں سے انھیں لوگوں کے سپرد کریں جو انگریزی مدرسوں اور مکتبوں دونوں کے طرز تعلیم سے واقف ہوں اور خود بھی کبھی ماسٹر رہ چکے ہوں تو نور علیٰ نور۔ بہر حال اگر والدین اپنے لڑکوں کی تعلیم کو دل وجان سے پسند کرتے ہوں تو اس نسخے سے شکایت مندرجۂ بالا رفع ہو سکتی ہے۔

مائیں اکثر محبت کی وجہ سے اپنے پاس سے لڑکوں کا دم بھر جدا ہونا پسند نہیں کرتیں مگر مردوں کو چاہئے کہ ان کو دلائل عقلی سے معقول کرکے اس طرف توجہ دلائیں اور تعلیم کے لئے اپنے لائق اور تجربہ کار رشتہ داروں کے پاس لڑکوں کو بھیجنے میں دریغ نہ فرماویں۔

(پنڈت رتن ناتھ سرشار از فسانۂ آزاد جلد ۴)

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

آپ پانی پت ضلع کرنال کے ایک معزز خاندان سے ہیں۔ آپ کے بزرگ ہرات سے آئے۔ پانی پت اور اس کے ملحقات مدد معاش کے طور پر شاہی انعام میں آپ کو ملے۔ ۱۸۳۷ء کے قریب آپ وہیں پیدا ہوئے۔ میر ممنون دہلوی کے بھتیجے سید جعفر علی سے آپ نے فارسی پڑھی۔ جو اس زمانے کے قابل فارسی دانوں میں تھے اور حاجی محمد ابراہیم حسین انصاری سے عربی کی تعلیم پائی۔ ۱۷ سال کی عمر سے آپ اکثر دہلی میں رہے۔ منطق، فلسفہ وغیرہ کی وہیں تکمیل کی۔ عنفوان شباب ہی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کی تعلیم آپ کے سپرد ہوئی۔ اُس زمانے میں جو کچھ کہا نواب صاحب سے اُس میں اصلاح لی۔ اس تعلق سے آپ کو آزردہ نیر درخشاں، غالب وغیرہ شعرا کی خدمات میں باریابی کے اکثر موقعے ملتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ غالب مرحوم کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ غالب نے آپ کی طبیعت کا اندازہ کرکے کہا کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو ظلم کرو گے۔ مرزا

غالب کی وفات پر آپ نے اور مرزا قربان علی بیگ سالک نے اور میر مہدی حسن مجروح نے مرثیے لکھے مگر جو مقبولیت آپ کے مرثیے کو حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

ابتدا میں آپکی شاعری کا بھی وہی ایشیائی رنگ تھا ۱۸۷۵ء کے بعد جب آپ کو پنجاب بک ڈپو لاہور میں کتابوں کی عبارت زمانۂ حال کے مطابق درست کرنے کی خدمت ملی اس وقت مغربی لٹریچر پر غور کرنے کا آپ کو بہت اچھا موقع ملا۔ اسی وقت سے اس راستے کو یک قلم ترک کر کے طرز جدید اختیار کیا کرنل ہالرائڈ صاحب نے لاہور میں آزاد کی تحریک سے ایک مجلس مشاعرہ قائم کی تھی اُس میں بجائے مصرح طرح کے خاص خاص عنوان پر شعرا کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا مولانا نے بھی اس گلشن میں جدت طرازی کے نغمے سنائے چنانچہ نشاط امید۔ مناظرۂ رحم و انصاف۔ حُبِ وطن۔ برکھارت وغیرہ مثنویاں اسی بزم کی یادگار ہیں بک ڈپو سے تعلق کے ۴ سال بعد آپ انگلو عربک اسکول دہلی کے مدرس ہوئے۔ اُسی زمانے میں سر آسماں جاہ کالج دیکھنے کیلئے علیگڈھ آئے۔ مولانا بھی وہیں موجود تھے۔ ان کی باریابی ہوئی۔ اُسی زمانے میں ۷۵ ماہوار علمی وظیفہ مقرر ہوگیا۔ ۱۸۹۰ء میں جب آپ علیگڈھ ڈپوٹیشن کے ساتھ حیدرآباد گئے اس وقت نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام تھے۔ وہاں آپ نے کئی نظمیں پڑھیں۔ اُس وقت وظیفے میں اضافہ ہوکر سَو روپیہ ماہوار ملنے لگے۔ اس کے بعد ہی بار ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

مولانا اپنے طرز کے موجد اور نیچرل اور قومی شاعری کے مجدد۔ اور ہندوستان کے معجز بیان سعدی ہیں۔ آپ کا کلام صاف۔ دل آویز۔ قومی اصلاح سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ آپکی نثر کی خصوصیات یہ کہ الفاظ اور معنی کی خوبیوں کا برابر لحاظ رکھا ہے۔ کلام میں کہیں اہمال یا اشکال نہیں۔ لفظ البتہ بعض جگہ مشکل نظر آتے ہیں۔ سلاست سر سید کے کلام میں بہت زیادہ ہے۔ بامحاورہ اور دلچسپ عبارت لکھنے میں پروفیسر آزاد یقینی بالا ہیں۔ مگر فلسفیانہ اور مورخانہ نظر اور لٹریچر کے رموز پر جس قدر واقفیت مولانا حالی کو تھی سر سید مرحوم وہاں تک نہیں پہنچے۔

نثر میں حیات سعدی۔ یادگار غالب۔ حیات جاوید۔ مقدمۂ شعر و شاعری۔ اور نظم میں مسدس مد و جزر اسلام۔ دیوان حالی۔ شکوۂ ہند۔ تعصب و انصاف۔ اور بہت سی مثنویاں آپکی یادگار ہیں۔

۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ عالیہ نے مولانا کو شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا۔
جو ان کی علمی خدمات کے اعتبار سے ہر طرح زیبا و مناسب تھا۔ ۳۱۔دسمبر ۱۹۱۴ء کو داعیٔ اجل کو
لبیک کہکر اس دارفانی سے چل بسے۔ قومی اور نیچرل شاعری کا آفتاب غروب ہو گیا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی اُردو شاعری اور دیوان ریختہ پر ریویو

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا، بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اس لئے نہیں کرتے کہ اس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، بلکہ اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں۔ اس کو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔ لطف علی خاں آذر آتشکدے میں نوری صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ "اس کے دیوان مختصر ہونا ہی اس کے کلام کی اور حُسن کلام کی کافی دلیل ہے"۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا۔ ورنہ فردوسی و نظامی دونوں مثنوی ہیں، اور انوری و خاقانی دونوں قصیدے ہیں، مسلم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے۔ کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی اور عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رُکن رکین مانے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ جُدا جُدا کلام جُدا جُدا معیاروں سے جلیچے جائیں۔ مرزا کے اُردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا غزل کے سوا کوئی صنعت شمار کے قابل نہیں۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔ اور جس قدر بلند اور عالی خیالات

مرزا کے ریختے میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لئے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا۔ جس کو امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کریں گے۔ میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اوّلاً فارسی اور اس کے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تعبیر اسالیب بیان عامۂ اہل زبان کی معمولی چال اور روزمرہ میں ادا کئے جائیں۔ چنانچہ میر سے لے کر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرے ہیں ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ اُن کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لیجائے۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کی غزلوں میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جلتے ہیں جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مَس نہیں کیا۔ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے، اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ اور جس چال سے کہ اگلوں نے راہ طے کی تھی اسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اوّل شاہراہ کا رُخ چھوڑ کر دوسرے رخ چلنا اختیار کیا، اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اُسی رخ پر چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اس کے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لئے نکالی۔ اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے

اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے، اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں! یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اوّل ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے ان کے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے۔

"بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاط۔ کے معنی امنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی امنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے، اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے۔ کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے یہ انسان کی ایک طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انکاری زیادہ کرتا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے؛ اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرعے کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعے کے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہئے کہ میں کیا چیز ہوتا

مطلب یہ کہ خدا ہوتا، کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتا ہے اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے اگر اس کی ہمت جب کہ وہ دریا میں تھا موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہو گا تو اس خوبی و لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہو گا۔ مطلب یہ کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی، اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس سے کہ اُس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اسی کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور نُدرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اس شعر میں اُس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوسے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا" شاعر کہتا ہے کہ برقِ تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہ طور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے، پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع

اس تمثیل کے جو اس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔

حریف مطلبِ مشکل نہیں فسون نیاز　　　دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لئے پہلا مصرع اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الہیٰ خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد　　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے۔ جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، اور در پردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دئے ہیں، اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، ان کی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اس کو خاطرخواہ نہ کر سکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور　　　رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا اس لئے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا، لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہ ہو وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی

پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے۔ جس کو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الورا ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے، اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو ۔۔۔ یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اس کے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج ۔۔۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے، اور نرا خیال ہی نہیں فیکٹ ہے، اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تصوّر میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد حقیقی یعنی اُن کے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حُسن مبالغے کی معراج ہے۔ جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے ۔۔۔ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اس مضموں کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ، اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا۔ تو کچھ دقّت نہ تھی، کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ

جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں۔ اور اس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے　　مَرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانے میں کاٹ دے، اور وہیں مَر رہے، تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبے میں دفن کیا جائے، کیونکہ اس نے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا، اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی، پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حُسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

جام جم پر جام سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گذرا۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے　　بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گذرا ہو مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے۔ اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا تو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ

جاننا چاہئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہے کہ اُس میں اہل ہمت معدوم ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

ناامیدی کی غایت اس سے بڑھ کر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی اُن کی داد بھی ملنی چاہئے۔

علاوہ جدّت مضامین اور طرفگی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اولاً عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے ان تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے، بلکہ خیالات کی جدّت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے ابتدائی ریختے میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے، بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغز سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقد وصال سے، اُستخواں کو خشت اور بدن کو قالب خشت سے، اور اس قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختے میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اسی قدر تشبیہوں میں باوجود ندرت اور طرفگی کے سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہر گردوں ہے چراغ رہگذار باد یاں

یہاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم

آمادۂ زوال وفنا ہیں۔ چراغ رہگذار باد سے تشبیہہ دی ہے۔ جو بالکل نئی تشبیہہ ہے دوسری جگہ سوز کو اس لحاظ سے کہ حُسن معشوق کے مقابلے میں اُس کو ناقص الخلقۃ قرار دیا ہے ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہہ دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چھوڑا نہ نخشب کی طرح دست قضا نے خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اُس کو غم سے نجات نہیں ہوتی شمع سے تشبیہہ دی ہے۔ کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے جیسا کہ کہتے ہیں

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس قسم کی بدیع اور نادر تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان اُردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں۔ قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے ابتذال سے بہت بچتے تھے۔ متبازل مضامین، مبتذل تشبیہیں۔ مبتذل محاورے مبتذل ترکیبیں، جس قدر ان کے کلام میں کم ملیں گی ظاہرا کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں۔ مثلاً صلّ علیٰ کا لفظ جو بجائے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے اُس کو وہ کبھی جائز نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے۔ اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص ان کو کبھی نہیں بولتے تا بہ مقدور وہ ان کو استعمال نہیں کرتے تھے اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئے وہ فوت ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں ان کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، اور جس کی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختے میں بھی نسبتہً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال کیا ہے لیکن استعارے کے قصد سے نہیں بلکہ محاورہ

بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کی جاتی ہیں۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ۔۔۔ بات کرتے کہ میں تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اس مطلب کو کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ اس طرح ادا کیا ہے۔ "بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا"

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔۔۔ پھر ترا وقت سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں۔ جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔ جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔

دام ہر موج ہے حلقۂ صد کام نہنگ ۔۔۔ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ۔۔۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں ۔۔۔ جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی۔

ان اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں، مگر استعارے اور

تمثیل نے ان میں نُدرت اور طرفگی پیدا کر دی ہے۔

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں، اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں، اور کیا نثر میں، باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے۔ جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گذرے ہیں، ایک سودا۔ دوسرے انشا، مگر دونوں کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی بخلاف مرزا غالب کے اُنھوں نے ہجو، فحش و ہزل سے کبھی زبان قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

چوتھی خصوصیت مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے، اور جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں ما بہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلودار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جس سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں لطف نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے۔ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں مئے مرد افگن عشق کا ساقی۔ یعنی معشوق۔ بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بُلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا؛ اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت

ہوئی ہے۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے۔ اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔ کہ پہلا مصرع یہی ساقی کی صلاکے الفاظ ہیں، اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق" یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق" یعنی کوئی نہیں ہوتا" اس میں لہجے اور طرز ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے۔ اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کرو گے فوراً یہ معنی ذہن نشیں ہو جائیں گے

کیونکہ اس بُت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا، اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بُت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے۔ پھر اس سے جان کیوں کر عزیز رکھی جاسکتی ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخئ فرشتہ ہماری جناب میں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارا نہ ہوتی۔ اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اس قصّے کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے، کہ جب خدائے تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا "کیا تو دنیا میں اس شخص۔ یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے؟ وہاں سے ارشاد ہوا کہ "تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔" اور پھر آدم سے ان کو زک دلوائی اور حکم ہو کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں۔ کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروقامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے؟ اس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا   ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس شعر میں "ترے سر کی قسم ہے ہم کو" اس جملے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اُڑائیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ ہم کو ترے سر کی قسم ہے۔ یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائیں گے۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے۔ یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ   جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنے مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے   دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

"کون اُٹھاتا ہے مجھے" اس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں وہاں سے کون اٹھاتا ہے؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اس میں بادپیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیئے بادپیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض بادپیمائی ہے۔ یعنی فضول کام ہے۔

اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا۔ اور بادپیمائی خبر دوسرے معنی یہ ہیں کہ بادپیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے۔ اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح بادپیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ جو مرزا اور ان کے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے۔ جو جذبات اور خیالات اہل ایران نے غزل کے پیرائے میں ظاہر کئے ہیں ریختہ گویوں نے زیادہ تر بلکہ بالکل انھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا ضرور تھا کہ وہی انقلاب اُردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہو۔ قدمائے اہل ایران جن کا دور مولنا جامی پر ختم ہوتا ہے ان کی غزل میں جو جذبات و خیالات بیان ہوئے ہیں وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے، اور گو اسالیب بیان میں تلاحق افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہو گئی لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے بعد جتنے سیدھے سادے عمدہ اور لطیف اسلوب تھے وہ سب ریز ہ گئے۔ اور متاخرین کے لئے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناتے تو ان کے لئے میدان غیر متناہی موجود تھا۔ مگر انھوں نے اس محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا۔ اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے انھوں نے تو اسی چچوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی۔ مگر جن کی فطرت میں اُپجنیلٹی اور اپج کا مادہ تھا وہ انھیں قدیم خیالات و جذبات میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ نظیری۔ ظہوری۔ عرفی۔ طالب۔ اسیر۔ اور ان کے اقران و امثال

کی غزل میں بمقابلۂ سعدی ۔ حافظ ۔ خسرو ۔ وغیرہم کی غزل کے ہم اسی قسم کا تفاوت پاتے ہیں ۔ مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیونکہ نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہل فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں لیکن ریختے میں یہ انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہو گیا ہے ۔ کیونکہ متاخرین اہل ایران کا نمونہ موجود تھا اس لئے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی متاخرین نکال چکے تھے اسی کو ریختے میں ڈھالنا تھا ۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی ! کیونکہ جس طرح کیمسٹری کے مُدوّن ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اس کے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلکی سی نظر آ جاتی ہے ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اوّل مرزا نے اور انھیں کی تقلید سے مومن ۔ شیفتہ ۔ تسکین ۔ سالک ۔ عارف ۔ داغ ۔ وغیرہم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا ۔ خصوصاً مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں ۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے ۔ جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اس خاص گروہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور لفظی و معنوی تصرفات کر کے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے ۔ مثلاً میر تقی کا شعر ہے

میرے تغیّر رنگ پہ مت جا　　　اتفاقات ہیں زمانے کے

اسی تغیر رنگ کو مومن خاں نے اس طرح باندھا ہے ۔

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ　　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رُخ روشن کو شمع پر اس طرح ترجیح دی ہے ۔

رات مجلس میں ترے حُسن کے شعلے کے حضور　　　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

نواب مرزا خاں داغ نے اسی مضمون میں نئی طرح نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں غالب۔ مومن اور اُن کے تبعین کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے اس لئے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اسی قبیل کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

۱ رنگ ہو کر اُڑگیا جو خون کہ دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں

۲ نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کس کا ہے

۳ آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے
کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں

۴ بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے
ضد کی ہے اور بات مگر خُو بری نہیں

۵ میں اُسے دیکھوں۔ بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

۶ مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
اس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں

۷ کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے
نقش پر اُس کے مصوّر کو بھی کیا کیا ناز ہیں

۸ یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

۹ لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم

۱۰ موت آتی ہے پر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو پہ مرنے کی

پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اُڑ جانا۔ دوسرے میں عاشق کے جذبے اور معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا۔ تیسرے میں نکہتِ گُل سے حیا آنی۔ چوتھے میں بھولے سے سیکڑوں وعدے وفا کرنے۔ پانچویں میں آپ اپنے رشک پر آنا۔ چھٹے میں دلِ رنجور کا نقشِ مدعائے غیر کی طرح بیٹھا جانا۔ ساتویں میں کھینچنے سے نقش کا مصوّر سے کھنچنا۔ آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا۔ نویں میں آپ اپنی ہمتِ عالی کے ہاتھ بِک جانا۔ دسویں میں باوجود موت آنے کے موت نہ آنی۔ یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں۔ جو دلی سے لیکر میر۔ سودا

اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں۔ اور اگر تھیں تو صرف اُسی قدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانۂ حال کے شعر ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں۔ یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گراں مائگی میں کچھ فرق نہیں آتا جن کو نئی طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل تھا۔

بہرحال جو نسبت ظہوری۔ نظیری۔ عرفی۔ طالب۔ اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی۔ خسرو۔ حافظ اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر۔ سودا درد کے ریختے سے سمجھنی چاہئے۔ قدما اردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے۔ برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمال شاعری سمجھتے تھے۔ اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصود شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں کہ "بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے"

اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پر بحث کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ گنجایش ہے لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس لئے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوان ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دئے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جا چکے ہیں اُن کو اب مکرر نہ لکھیں اور جہاں ضرورت ہوگی شعر کے معنی بھی بتائیں گے۔ اور کہیں کہیں محاسن شعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائے گا۔

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا ۔۔۔ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

طاق نسیاں وہ طاق جس میں کچھ رکھ کر بھول جائیں۔ طاق نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ جس کو طاق میں رکھ کر بھول جائیں۔ بیخودوں کے بہشت کو گلدستۂ طاق نسیاں سے تشبیہہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہہ ہے جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے۔ ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے۔ اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی۔ اور اس لئے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سن کر کہا "بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے" مرزا نے کہا "حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔"

نہ مارا جان کر بے جرم۔ قاتل تیری گردن پر　　رہا مانندِ خونِ بے گنہ حقِ آشنائی کا

کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے۔ مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بے گنہ کے حقِ آشنائی کا رہے گا۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا　　مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اُس سے مجھ کو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

خندۂ گل کو خندۂ بیجا اس لئے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھ کر یا ازراہِ تعجب نہیں ہنستا پس گویا اُس کا خندہ بے محل ہے۔

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یعنی اُس نے زبردستی کیوں نہ پلائی؟

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یعنی ہمارے جرم کے ثبوت کے لئے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے۔ صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا۔ تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی۔ یہ بعینہ ویسی ہی بات ہے جیسے مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سُن کر ان کی تعریف کرتے وقت کہا تھا کہ واس میں مرزا کا کیا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے" غرض کہ ایک

ہمعصر دوسرے ہمعصر کی تعریف بھی کرتا ہے تو اس میں ایک نہ ایک بات ضرور ایسی شامل کر دیتا ہے جس سے یا اس کی تنقیص لازم آئے یا اپنی تعریف اس سے بھی زیادہ نکلے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی لے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازوے قاتل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا ؟

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حسن کے تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشیں تھا وہی سن کر میرا رقیب بن گیا۔ کیونکہ اوّل تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیاں کی زبان سے پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی "اور پھر بیاں اپنا"، سارے شعر کی جان ہے۔ جس کی خوبی بغیر ذوق سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جان پہچان نکلا۔ اب ہمارے سلئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں۔ اور اپنی دانائی اور ہنرمندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے۔

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

یعنی اگر نالے کی اجازت نہ ہو گی تو ہم اس کو ضبط کریں گے اور اس کا اثر تجھ تک پہنچے گا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی۔ اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے　　شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

حریف جوششِ دریا نہیں خود داریٔ ساحل　　جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہے وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محوّل ہو سکتا ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گذر جائے گا تو مر جائیں گے یعنی فنا ہو جائیں گے۔ گویا قطرہ دریا میں کھپ جائیگا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس درد کا حد سے گذر جانا ہی اس کا دوا ہو جانا ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفلِ ابجد　　تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دم سرد ہوا　　باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال　　ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا　　روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غم فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔

یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت　　مُند گئیں کھولتے کھولتے آنکھیں غالب

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن　　جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات　　سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ　　ہم کو حریص لذت دیدار دیکھ کر

بک جلتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ　　لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں　　جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا　　یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یا رب وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اس میں در پردہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے ہیں۔

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے۔ یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اس وقت تک راہ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگ گراں سدِ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبک دستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے　　رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نالے یعنی ندی نالے نہ آہ و نالے۔ مثال کس قدر ممثّل لہٗ کے مطابق ہے۔ اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رُکتی ہے اسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت مؤثر اور دردانگیز ہوتا ہے۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　　متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاع بُردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں۔ اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا۔ اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز ہے　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے۔ خواہ زن و فرزند

کی محبت ہو۔ خواہ مال و دولت کی۔ خواہ ملک و ملت کی۔ خواہ کسی اور چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ غربت میں ہو قدر　　　بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے۔ اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے۔ کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت　　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ　　　کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں۔ مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اس لئے نہیں کھا سکتا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا　　　پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی　　　روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

یہاں ہم زباں کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی۔ اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں۔

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں　　　ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

چکر۔ پھرنے کی دھت۔ کہتے ہیں اس کے پاؤں میں چکر ہے۔ یعنی اس کو پھرنے کی دھت ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی۔ پس زنجیر جو اس غرض سے

میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے اُسے زنجیر نہ سمجھو۔ بلکہ جگر سمجھو۔

حسرت لذت پرواز رہی جاتی ہے　　جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں

جادہ۔ یعنی بیٹا کو دم شمشیر سے تشبیہہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے حق تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں۔ مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اس لئے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذت آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی　　سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن

مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود　　قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلے پر قبلہ نما کا اطلاق ظاہرا مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

راز معشوق نہ رُسوا ہو جائے　　ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں۔ خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہو تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ　　ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

یہ شعر سہل و ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں　　یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

یعنی آج اس خوف سے شراب نہ دینی کہ کل نہ ملے گی۔ ساقی کوثر کی فیاضی پر سوءِ ظن کرنا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر　　آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے۔ یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے۔ اس لئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام　　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے" اس حذف نے شعر کا رتبہ بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کئے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے۔ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف۔ اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے۔ کہ کیونکر ایسے دو ہم پلّہ مصرع بہم پہنچ گئے جن میں حسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کیلئے بہت بڑی چیز ہے۔ مگر اس کا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دلاویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دوبالا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا غصے میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے　　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سواری کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے قابو سے باہر ہو جانا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا۔ اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حُسن تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدت وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ "یہاں کیا دھرا ہے" منتہائے بلاغت ہے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست ۔۔۔ مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ۔۔۔ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ ۔۔۔ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اُس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے۔ وَھَلُمَّ جرًّا۔ اور وجہ اس تذبذب اور تنزّل کی یہی تو ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ۔۔۔ ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالب ۔۔۔ تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا ۔۔۔ یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار ہے۔ یعنی میں دونوں جہان لے کر خاموش ہو رہا اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہو گیا۔ بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی۔ اس لئے خاموشی اختیار کی۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے ۔۔۔ تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف وہ ظریف جس کی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھ کر کہا تھا کہ آپ کی محفل غیر سے خالی ہونی چاہئے۔ اس نے یہ سُن کر مجھے بزم سے اُٹھوا دیا۔ یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر　　عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا　　تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے　　کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرع میں اس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے۔ کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا۔!!

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں　　کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام　　دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے　　لوحِ جہاں میں حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے　　آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر　　لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

یعقوبؑ کی آنکھوں کو روزن دیوار زنداں قرار دیا ہے۔ کیونکہ جس طرح روزن زنداں ہر وقت یوسفؑ پر کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں شب و روز یوسفؑ کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اُسکی ہیں　　جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار　　جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم وحیا کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں۔ بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب　　یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو درباں کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ کیونکہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جب کہ دعائیں سب ختم ہو چکیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بنجاتی ہیں۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا　　دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیمروز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منھ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسد سے دل اگر آزردہ ہے گرم تماشا ہو　　کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

یہ مضمون محض خیالی مضمون نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور۔ دنیا کے حالات سے ناواقف۔ اور لوگوں کی ترقی تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے۔ لوگوں کی

خوش حالی محض اتفاقی نہیں ہے۔ جس پر حسد و رشک کیا جائے۔ بلکہ ان کی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اور اسی لئے انصاف و فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے میں متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ "چشم تنگ شاید کثرت نظّارہ سے وا ہو" جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے۔ اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ۔ کیا کہیں — بھولا ہوں حقِ صحبت اہلِ کنشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم صواب سے — ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو
آئی اگر بلا تو جگہ سے ٹلے نہیں — ایرا ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں — کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو۔ مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں از راہ تہذیب اس کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مے کدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسے و خانقاہ میں مل جائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص از راہ شوخی کے کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی مے کدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے۔ اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اس شعر کو حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کر سکتے ہیں۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتا ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو! ہم دل میں نہیں ہیں: پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

اس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف۔ تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یعنی جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے۔ اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اس کے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے۔ غرض کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔

ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بہ آسانی کزلک وغیرہ سے اُڑا سکے۔ اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے جس پر سے حرف غلط خود بخود اُڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ۔ یعنی ہر مخلوق۔ عذر خواہ۔ معافی چاہنے والا۔ یا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرّات عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔ ان کی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

پنیس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے | کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے | کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف | آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے | بے نیازی تری عادت ہی سہی
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالب | ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے | بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے | گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملے کا ہے۔ جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گذرتا ہے۔ اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی۔ اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے۔ پھر اس کے کیا معنی؟ کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور گر حیا بھی اس کو آتی ہے۔ یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا ہے۔ اور شرما جاتا ہے۔ یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے۔

ہے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا | رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ | ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس ہجوم ناامیدی۔ خاک میں مل جائے گی | یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے
فرد ادوی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا | تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

کہتا ہے کہ تمہارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی۔ اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانۂ حال ہو جائیں گے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی۔ قیامت گذر جانے کے دونوں معنی ہیں۔ نہایت سختی کا زمانہ گذرنا۔ اور خود

قیامت کا آجانا۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

دے کے خط منھ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اُن سے ناواقف ہے۔ اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

بادۂ دوشینہ۔ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی۔ محض ازراہ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں۔ تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال و جواب کئے چلے جائیں۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی — سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آئے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے
حُسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے — اُس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے۔ معشوق کو مہ خورشید جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اُس کو ماہ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اس شعر کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے

دیکھئے پاتے ہیں عُشّاق بتوں سے کیا فیض — اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔ یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں۔ نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا۔ یا وبا نہیں آنے کی۔ یا لڑائیاں نہیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش کرنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہرے ہدف ناوک بیداد کہ ہم — آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف — آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دئے ہوتے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو ہیں عاشق تمہارے نام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزۂ و گل کے دیکھنے کے لئے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گذرے۔ یعنی ہوں تو گران قدر مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں۔ پس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے۔

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچ مدانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

لفظ تو نے جو دوسرے مصرع میں ہے یہ معنی پیدا کر دئے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا۔ اس لئے دوست کے سر انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت

سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یہاں سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کریں گے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

چاک مت کر جیب بے ایام گل کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

پھول کے کھلنے کو چاک گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیئے۔ پس جب تک پھول اپنا گریباں چاک نہ کرے تو بھی گریباں چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے

کیوں ردّ قدح کرے ہے زاہد مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے

مگس کی قَے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد کے پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اس کو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

ہلئے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے۔ بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اس کی کیا تلافی ہو سکتی ہے نیکی نہیں کر سکتا۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قویٰ جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتدائے عشق میں انھیں کو صدمہ پہنچا ہے۔ پس اب نہ ترک ہو سکتا ہے نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا بے شرم و بے باک ہونا۔ پاک۔ آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے راز عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم اور بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ "رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے" بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہدِ حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے

معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد اور معبود کے درمیان گفتگو ہونا) دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عُرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ شاہدِ حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیئے۔ یعنی جب تک دل تیغِ عشق سے مجروح نہ ہو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو وعدۂ صبر آزما کے پورے ہونے کے انتظار میں گذر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب — کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پر دم نکلنا۔ اس کے پورے ہونے کے لئے جلدی کرنا چنانچہ کہتے ہیں کیوں دَم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو۔ (یعنی کیوں جلدی کرتے ہو۔ پہلے مصرع میں بہ مقتضائے مقام یہ الفاظ کہ "دل میں باقی ہیں" مقدر ماننے چاہئیں باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ

بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متہم بہ وجود ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں۔ اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلّی ہم پر لمعہ افگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے۔ اور ہم فنافی الشمس ہو جاویں۔ کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔

اک خوں چکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے۔ مگر نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی سہی کلام میں۔ لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اس شعر سے مرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اُس زمانے میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لئے منت مانتے ہیں۔ مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا۔ اُدھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور اِدھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری۔

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام۔ بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھ کو
ہے یوں کہ۔ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے کافی ہے مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع بہ ہیچ نہ سمجھے اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اُس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا۔ ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلئے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کیلئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہو سکتی۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسباں نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پاسباں سے چاہتا کیا تھا۔ سو یہ دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گئیں۔ صرف کنائے میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

(از یادگار غالب۔ حالی)

شیخ سعدی شیرازی کے عام حالات اور اُن کی شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھے۔ ان کے قوی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے دس بارہ حج پاپیادہ کئے تھے۔ اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا۔ اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی۔

انھوں نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کئے بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہل سلوک نفس شکنی کے لئے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال ادنیٰ درجے کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں۔ اُس نے بھی بیت المقدس اور اس کے گردونواح میں ایک مدت تک سقّائی کی تھی۔

ان کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے۔ ان کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بیشک وہ صوفی بھی تھے۔ اور واعظ بھی تھے۔ مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلف۔ کھُلے ڈھلے یار باش۔ ہنسوڑ ظریف۔ ریا اور نمائش سے دور سیدھے سادے مسلمان تھے۔ ان کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔

وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھے۔ انھوں نے مثل ظہیر۔ رشید۔ خاقانی۔ اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مدّاحی اور امیروں کی بھٹئی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ بایں ہمہ وہ امرا اور سلاطین سے ملتے بھی تھے۔ اور ان کی مدح میں قصیدے بھی لکھتے تھے۔ اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے ان کی کچھ نذر کرتا تھا وہ لے بھی لیتے تھے۔ ان کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ قصیدے کس غرض سے لکھتے تھے۔ زیادہ تر ان کے قصیدے ایسے ہیں

جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔
امیروں سے وہ اس لئے بھی زیادہ ترمیل جول رکھتے تھے کہ اکثر ان کی سفارش سے جیسا کہ گلستاں کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے۔

خودداری اور غیرت اُن میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ جیسا کہ اسکندریہ کے قحط میں ان سے ظہور میں آیا۔
خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدائے تعالیٰ نے ان کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ ان کے نصائح اور مواعظ ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے اگر انسانی ہمدردی کا جوش ان کے دل میں نہ ہوتا۔ انھوں نے اپنی زبان و قلم کو پند و نصیحت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتے تھے۔

کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں۔ ایک جوہر فطری۔ دوسرے زمانے کے ایسے اتفاقات جو اس کے جلا کے باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اسی کے موافق ان کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا جہاں ہونہار بچوں کو خودبخود کسب کمال کی ترغیب ہونی چاہئے۔ یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بے کسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رشد کا باعث ہوئی ہیں۔ جس مدرسے میں حُسن اتفاق سے تحصیل علم کے لئے پہنچے وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سر برآوردہ تھا اور جس دارالخلافت میں وہ مدرسہ واقع تھا وہاں کی سوسائٹی اس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مہذب تھی۔

انھوں نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا بلکہ زمانے نے بھی اُن کی تادیب خاطر خواہ کی تھی۔ ان کی عمر کا ایک بہت بڑا مفید حصہ نہایت

کٹھن اور دور و دراز سفر کرنے اور دنیا کے عجائبات قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوتا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات۔ ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اُن کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی۔ بیسیوں خاندان ان کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے۔

ایک بار جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے شام میں ان کے روبرو ایسا انقلاب ہوا کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور روستائی زادے وزارت کے درجے کو پہنچ گئے۔ ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ انھوں نے اکیانوے برس بسر کئے تھے عجیب و غریب تماشے ان کی نظر سے گزر گئے۔ سلاطین کُردیہ کا خاندان جن کی سطوت و جلالت ایشیا۔ افریقہ اور یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی۔ اسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجقہ۔ قونیہ۔ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دو سلسلوں کو مضمحل کر دیا اسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرۂ خزر اور جھیل یورال سے دریائے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی اسی صدی میں تاتاریوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اسی صدی میں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہوئی۔ اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں ہے اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب وصّاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی۔ اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا اسی صدی میں واقع ہوئی۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا۔ دارالملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا اسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا۔ فرقہ اسمعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور شور کے ساتھ حکمراں رہا ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کردوں نے شام میں ہمیشہ کے لئے اسی صدی میں کیا۔

یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے۔ جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو انھوں نے عربی میں لکھا ہے اس میں کہتے ہیں کہ خدا حمایت کرے اس شخص کی جو خلافت عبّاسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا۔ کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لئے تازیانہ ہے
یورپ کے مشہور مصنف ہگ ملر صاحب کا قول ہے کہ میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دل سوز اُستاد تھے۔
اس کے سوا جیسی عمدہ صحبتیں شیخ کو میسّر آئی تھیں ویسی بہت کم آدمیوں کو میسّر آتی ہیں۔ شیخ کی عادت جیسا کہ ایک رسالے میں اس کے فحوائے بیان سے معلوم ہوتا ہے یہ تھی کہ عالم سفر میں وہ جہاں جاتے تھے وہاں کے علما، صلحا، مشائخ اور کاملین سے ضرور ملتے تھے۔ صاحب نفحات الاُنس نے لکھا ہے کہ شیخ نے کثرت سے دانشمندوں اور عالموں کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بوستاں میں کہتے ہیں۔

"تمتع ز ہر گوشۂ یافتم ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم"

اگرچہ ساتویں صدی ہجری میں جس میں کہ شیخ کی جوانی اور بڑھاپا گزرا تھا مسلمانوں کی علمی ترقیات اور فضائل و کمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی بلاد اسلام میں ایک جم غفیر اعلیٰ درجے کے مشائخ اور علما و حکما کا نظر آتا تھا خصوصاً جن ملکوں میں شیخ کی زیادہ آمد و رفت رہی ہے۔ جیسے ایران۔ روم۔ شام۔ عراق۔ عرب اور مصر وغیرہ۔ وہ اب بھی دینی اور دُنیوی علوم کے مرکز تھے۔ ہمارے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات پائی ہے اور جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا ان میں کم سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقق ایسے موجود تھے جو تمام بلاد اسلام میں مانے گئے ہیں۔ اور جن کی تصنیفات

اب تک مسلمانوں میں نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں۔ جیسے شیخ محی الدین بن العربی خواجہ نصیر الدین طوسی۔ شیخ صدر الدین قونوی۔ مولانا جلال الدین رومی۔ ابن تیمیہ حرانی امام یافعی۔ شیخ ابوالحسن شاذلی۔ شیخ تاج الدین قسطلانی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی شیخ بن فارض۔ شیخ اوحدالدین کرمانی۔ قاضی ابن خلکان۔ شیخ الاسلام تقی الدین ابن الصلاح خواجہ علاء الدولہ سمنانی۔ خواجہ بہاء الدین نقشبند۔ علامہ قطب الدین شیرازی۔ امام محی الدین نووی۔ قاضی ناصر الدین بیضاوی۔ ابن عساکر فقیہ شافعی۔ وغیرہ وغیرہ ایسے ایسے سیکڑوں جلیل القدر علماء اور مشائخ شیخ کی نظر سے گزرے تھے۔

اور ان کے علاوہ جیسا کہ گلستاں اور بوستاں سے ثابت ہوتا ہے وہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتے اور ان کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتے تھے جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتے تھے اسی طرح اُمرا کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی وہ ابرار اور احرار کی صحبت سے مستفیض ہوتے تھے اور کبھی اُوباش والواط کے جلسوں کے تماشائی تھے۔ نہ ان کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا نہ بتخانے میں رہنے سے ننگ تھا۔ انہی نے جامع بعلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا۔ اور وہی بتخانۂ سومنات میں ایک مدت تک پوجاری رہے۔ کبھی وہ بصرہ کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ کھجوریں توڑتے نظر آتے تھے اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتے پھرتے تھے۔

غرض کہ ان کی تمام عمر خصائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعے میں بسر ہوئی تھی۔ اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے ان کو گریٹ مورلسٹ کہا ہے۔ اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ انھوں نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھنچ سکی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعرائے ایران میں جس قدر عمر شیخ نے پائی ہے ظاہرا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک

ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے انھوں نے ۱۲۰ برس اس قفس عنصری میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ ہر علم و فن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ عمر پانی ضرور ہے۔ مگر شاعر کے لئے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے۔ شاعر جس قدر بڈھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ شیخوخت کے مرتبے کو پہنچ کر شاعر کے فکر میں بلند پردازی نہیں رہتی لیکن بلاغت جو شاعری کا رکن اعظم ہے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے گو کہ ان کی قابلیت و استعداد اعلیٰ درجے کی تھی مگر ان کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا۔ جیسا کہ عرفی شیرازی کی نسبت شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ "غنچہ استعدادش ناشگفتہ ماند" ایک نوجوان شاعر جس کی طبیعت میں کمال جودت اور بلند پردازی ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شوخ چالاک اور اکھڑ بچھیڑا جس کی بھاگ دوڑ اور جست و خیز اکثر بے اصول اور خلاف قاعدہ ہوتی ہے۔ اور ایک معمر سن رسیدہ شاعر گو اس کی فکر کیسی ہی پست اور محدود ہو اس شایستہ اور شدھ منے گھوڑے کے مانند ہے جو کبھی بے اصول قدم نہیں اٹھاتا۔

الغرض شاعری کے لئے جتنی ضروری شرائط درکار ہیں وہ سب خدائے تعالیٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں

شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت واقعیہ پر نہ کہ محض اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالا پن اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کئے جائیں۔ کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرۂ شاعری سے خارج ہوگا۔ چوتھے شاعر کے دل میں جب کہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے کم و بیش اس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود

ہو جانا چاہئے ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا۔ یہ چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پوری پوری پائی جاتی ہیں ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیں گی۔ اگرچہ بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیتیں موجود ہیں لیکن ان کا کلام چونکہ نہایت محدود اور ایک خاص صنف میں منحصر ہے جیسے خواجہ حافظ شیراز کی غزل۔ اس لئے ہم ان کو شیخ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔

شیخ کو اور شعرا پر اس سبب سے بھی بڑی فوقیت ہے کہ اُس کے نظم و نثر دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلم الثبوت شعرا گزرے ہیں اس میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے پسند کیا ہو۔ اگرچہ ہندوستان میں نورالدین ظہوری کو بھی نثر و نظم کا جامع مانتے ہیں لیکن اہل ایران اس کی نظم و نثر دونوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ بیشک اس کی سہ نثر کے اکثر فقرے بادی النظر میں نہایت دل فریب ہیں۔ لیکن ان میں الفاظ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ بخلاف اس کے شیخ نے گلستاں میں اس سے بہت زیادہ دلاویز دلکش الفاظ میں حقائق واقعیہ کو بیان کیا ہے۔ یہ بات گلستاں کے سوا کسی فارسی نثر میں آج تک نہیں دیکھی گئی۔

نظم و نثر کے جامع فارسی زبان ہی میں نادرالوجود نہیں ہیں، بلکہ ہر زبان میں یہی حال ہے۔ انگریزی میں باوجودیکہ لٹریچر کی ترقی انتہا درجے کو پہنچ گئی ہے۔ صرف گنتی کے آدمی ایسے ہیں جن کو نظم اور نثر دونوں میں تمام اہل فن کے نزدیک قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ بعضے ملٹن کو اور بعضے اسکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدھ آدمی کو نظم و نثر کا جامع خیال کرتے ہیں۔ پس شیخ کے لئے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ ایران میں صرف اسی کی نظم و نثر دونوں ایسی ہیں جن کو تمام اہل زبان نے تسلیم کیا ہے۔

شیخ نے بھی تغزل یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعرائے ایران کی طرح اَمردوں اور سادہ رخوں کے عشق ہی پر رکھی ہے۔ لیکن یہ بات جیسی کہ بادی النظر میں مذموم اور

قبیح معلوم ہوتی ہے حقیقت میں ایسی نہیں ہے۔ اور صرف اس بنا پر شیخ یا ایران کے اور
شعرا پر امرد پرستی کا الزام لگانا بیجا ہے۔ فارسی زبان میں اور اس کی پیروی سے اُردو
زبان میں بھی ہمیشہ شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت۔ رند ہو یا صوفی۔
خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا۔ مرد کا عاشق ہو یا عورت کا۔ بلکہ سرے سے عاشق ہو یا نہ
ہو۔ ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور
وہ اور اس کا معشوق دونوں مرد ہیں۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت۔
دنیا دار ہو یا تارک الدنیا۔ عشق حقیقی رکھتا ہو یا عشق مجازی۔ مرد کا عاشق ہو یا
عورت کا۔ ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے ثابت ہو کہ شاعر
عورت ہے اور اس کا معشوق مرد ہے۔ اسی طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں
مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں
میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد
اور معشوق کو عورت۔ اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد۔ اور کہیں آپ اور
معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑے گا۔

حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی غزلوں سے صاف یہ پایا جاتا ہے کہ وہ کسی
سادہ رُخ لڑکے پر مفتوں ہیں۔ اور ان کے ہندی دوہروں سے صاف ظاہر ہے
کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے اور
عربی قصائد کی تشبیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں
مضطر و بے قرار ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں۔ جن کو
حقیقت واقعی سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر جنھوں نے
نہ کبھی شراب کا مزا چکھا نہ اس کی صورت دیکھی نہ اس کی بو سونگھی صدہا شعر شراب و کباب

کے مضمون کے لکھتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں پاک باز اور صاحب عفت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں۔ البتہ اس سے مشرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے جس کے اصول اور فروع سب تصنع اور بناوٹ اور ادّعائے محض پر مبنی ہیں۔ لیکن شیخ سعدی اور مولانائے روم اور امیر خسرو اور خواجہ حافظ اور تمام شعرائے متصوفین اس سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اکثر عشق مجازی کے پیرائے میں اپنے واردات اور حالات اور حقائق واقعیہ بیان کرتے ہیں۔

بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے کلام کو جس میں بظاہر تمام خال و خط اور شراب و شاہد کے مضامین درج ہیں حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اس سے شاہد حقیقی کے شیون وصفات مراد لینی صرف ایک مُلاّیانہ گڑھنت ہے جس سے سراسر تکلف اور بناوٹ پائی جاتی ہے۔ مگر ایسا خیال وہی لوگ کرسکتے ہیں جو کوچۂ شاعری سے نابلد ہیں۔ کنایہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ اور دوست کا ذکر ہمیشہ اغیار سے چھپایا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا روم مثنوی میں صاف صاف فرماتے ہیں۔

"خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں — گفتہ آید در حدیث دیگراں"

شعرائے متصوفین کے اشعار اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کئے جائیں تو ان میں وہ کرشمہ جس نے ایک عالم کے دل کو تسخیر کیا ہے باقی نہیں رہتا۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ مولانا محمد شیریں جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوان غزلیات متصوفانہ اشعار میں مشہور ہے۔ ان کے سامنے کسی نے ان کے معاصر شیخ کمال اسمٰعیل خجندی کا یہ مطلع پڑھا۔

"چشم اگر این ست و ابرو این و ناز و عشوہ این — الوداع اے زہد و تقویٰ الفراق اے عقل و دیں"

مولانا نے سن کر کہا ایسا شعر کہنا کیا ضرور ہے جو معنی مجازی کے سوا کوئی اور محمل نہ رکھتا ہو۔ شیخ نے بھی یہ بات سنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھیڑ کر کہا کہ چشم

اور عین مترادف لفظ ہیں۔ پس عین سے ذات الٰہی مراد لی جاسکتی ہے۔ اور ابرو حاجب کا مرادف ہے پس ممکن ہے کہ حاجب سے صفات الٰہی جو کہ حاجب ذات ہیں مراد لیجائیں مولٰنا نے اس توجیہ کو تسلیم کیا۔ اور شیخ کے بیان کی داد دی۔ خواجہ حافظ کی نسبت اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "یہ شخص لسان الغیب اور ترجمان الاسرار تھا۔ اس نے اکثر اسرار غیبی اور معانی حقیقی مجاز کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کئے ہیں کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہو سکا" پھر اکابر صوفیہ میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو ک[illegible] فیہ کے حق میں دیوان حافظ کو تمام دیوانوں سے بہتر بتاتے تھے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تغزل کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی شرازی کے تتبع سے حاصل کیا ہے۔

البتہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے تغزل کی بنیاد امرد پرستی پر کیوں رکھی ہے۔ عرب کی شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت۔ اور ہندی میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہیں۔ اور یہ دونوں طریقے نیچر کے مطابق ہیں۔ مگر مرد کا مرد پر عاشق و فریفتہ ہونا اور اس سے وصل کا طالب اور کام جو ہونا اگرچہ محض زبانی جمع خرچ کیوں نہ ہو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے فطرت انسانی بالکل اِبا کرتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کا تفرقہ نہیں ہے۔ اس میں ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں لائی جاتی ہیں۔ پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعرا اپنے تئیں عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں لیکن اس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضمائر یا افعال وغیرہ سے یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت۔ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ فارسی میں عاشق اور معشوق دونوں مرد فرض کئے جاتے ہیں۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے دیکھا جائے تو ایک یہ ایسی توجیہ ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ

تھوڑا ہی سا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔

اس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ جب مسلمان عرب سے نکل کر اطراف و جوانب میں پھیلے تو بسبب اس کے کہ ان کے ہاں عورتوں کا مردوں سے چھپانا مذہبی فرائض میں سے تھا۔ غیر قوموں کے میل جول سے عورتوں کے باب میں ان کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً مسلمان بادشاہوں میں اس غیرت کا ظہور سب طبقوں سے زیادہ تھا۔ ڈاکٹر برنیر فرانسیسی جو ہندوستان میں پندرہ سولہ برس عالمگیر کے ساتھ رہا ہے اپنے وقائع سفر میں لکھتا ہے "ہندوستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو بیگمات کی سواری کے نزدیک کوئی متنفس اگرچہ کیسا ہی ذی مرتبہ اور صاحب اعتبار ہو نہیں جانے پاتا تھا۔ ورنہ بالضرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ہاتھ نہایت بے رحمی کے ساتھ پٹتا تھا۔ اور اور ایران میں سنا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیگمات کی سواری سے آدھے فرسنگ کے فاصلے پر نظر پڑ جاتا تھا تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی۔ اور جس شہر گاؤں میں بیگمات کی سواری نکلتی تھی وہاں کے تمام مرد اور عورت اپنے اپنے مقام اور مسکن چھوڑ کر چلے جاتے تھے" شاید اس بیان میں کچھ مبالغہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاہوں کی غیرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ چونکہ شعرا اکثر بادشاہوں کے مدّاح اور مصاحب ہوتے تھے اس لئے وہ کوئی بات سلاطین کے مقتضائے مزاج کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے۔ پس نہایت قوی گمان ہے کہ شعرائے غزل اور تشبیب میں عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر کرنا اور جو جو معاملات عشق کے زمانے میں عاشق و معشوق کے درمیان واقع ہوتے ہیں ان کو صاف صاف بیان کرنا سلاطین کی غیرت اور حمیت کے برخلاف سمجھا ہو اور اس لئے تمام عشقیہ مضامین امردوں اور سادہ رُخوں پر ڈھالے گئے ہوں۔ سلاطین مغلیہ میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گزرا ہے وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر جہانگیر کے روبرو قوال امیر خسرو کی غزل گا رہا تھا۔ اور بادشاہ اس کو سن کر

بہت محظوظ ہو رہا تھا جب قوال نے یہ شعر گایا۔

"تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب   کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد"

بادشاہ دفعتہً بگڑ گیا۔ اور قوال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا۔ اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم و خواص خوف سے لرزنے لگے۔ اور فوراً ملا نقشی مُہر کَن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا بلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیما کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا حضور خیر باشد بادشاہ نے کہا دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے غیرتی کا مضمون شعر میں باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ ملا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اسی وقت بادشاہ کا غصہ فرد کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشو و نما پایا تھا۔ اس لئے وہ اکثر ہندوستان کے اصول کے موافق شعر کہتے تھے۔ یہ شعر بھی انھوں نے اسی طریقے پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشے کا یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بجانا ہونے لگا۔

اگرچہ شیخ یا اور شعرائے ایران کے عاشقانہ اشعار سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ان کی امرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ گلستان کے پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبت اس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ کسی وقت میں سادہ رخوں اور امردوں کی طرف ان کو میلان خاطر رہا ہے۔ مگر اس بات کو میں کسی بُرے معنوں پر محمول نہیں کرتا۔ صوفیہ کے حالات جو نفحات الانس وغیرہ میں لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو سالک کے لئے ایک بہت بڑا

ذریعہ ترقی باطنی کا ہے۔ اور اکثر بڑے بڑے مشائخ اور عُرفا میں یہ خصلت پاک دامنی اور عفت کے ساتھ دیکھی گئی ہے شیخ نے جس طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا جا بجا اقرار کیا ہے اسی طرح ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس سے بیسیوں جگہ اپنی برات بھی کی ہے چنانچہ ایک جگہ غزل میں کہتے ہیں۔

"گر نظر صدق را نام گنہ مے نہند حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن"

(مولٰنا حالی از حیات سعدی)

شمس العلماء مولٰنا شبلی نعمانی

آپ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک مشہور خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے منطق۔ فلسفہ۔ ادب۔ مشہور ادیب مولوی فاروق صاحب چریا کوٹی سے حاصل کیا۔ اور علم حدیث مولوی حافظ احمد علی صاحب سہارنپوری محدث سے۔ اور فقہ مولوی ارشاد حسین صاحب سے۔ اور تفسیر اور کچھ علم ادب مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے اخذ کیا۔ ۱۷ سال کی عمر میں آپ نے درس نظامیہ سے بالکل فراغت حاصل کر لی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد چند روز آپ امین عدالت دیوانی رہے۔ یہ ملازمت پسند نہ آئی چھوڑ کر علی گڈھ چلے گئے۔ وہاں سمیع اللہ خاں صاحب کی سفارش سے سر سید نے ان کو کالج کی پروفیسری عنایت کی۔ ۱۶ برس تک کالج سے یہ تعلق آپ کو رہا۔ اسی زمانے میں پروفیسر آرنالڈ نے آپ کو علوم جدیدہ سے آگاہ کیا۔ اور فرنچ زبان سکھلائی۔ اور خود اُن سے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ کالج کے تعلق ہی کے زمانے میں آپ نے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ الفاروق کے لئے تاریخی مواد فراہم کریں۔ کچھ عرصے کے بعد سیر کشمیر کو گئے۔ وہاں کے ملیریا نے سخت نقصان پہنچایا۔ صحت نے اسی وقت سے جواب دے دیا۔ ۱۸۹۴ء میں ۳۷ سال کی عمر میں آپ کو شمس العلما کا خطاب گورنمنٹ کی جانب سے عطا ہوا۔ مدت تک الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو رہے۔

سر سید کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں آپ کالج سے علٰحدہ ہو کر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں سلسلۂ آصفیہ میں دو سَو روپیہ ماہوار وظیفہ تصنیف آپ کو مقرر ہوا۔ کچھ عرصے بعد تین سَو روپیہ ہو گیا۔ عرصے تک وہیں مقیم رہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ حیدر آباد سے واپس آ کر لکھنؤ میں قیام کیا۔ اور ندوۃ العلماء کے کام میں مشغول ہوئے۔ آخر میں تمام تعلقات کو ترک کر کے سیرۃ نبوی کی تالیف و تصنیف

میں مشغول ہوئے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو ۱۵ دن اسہال کے عارضے میں علیل رہ کر اپنے وطن مالوف اعظم گڑھ میں انتقال کیا۔

آپ فطرتاً ذہین اور سلیم الطبع تھے۔ تاریخ اور فلسفہ سے آپ کو ابتدا سے دلچسپی تھی۔ علوم مشرقیہ میں خاص استعداد تھی۔ طرز بیان آپ کا سادہ مگر زوردار اور مدلل تھا۔ تحریر فلسفیانہ اور محققانہ تھی۔ جس میں سچے تاریخی واقعات ہوتے تھے۔ رنگ آمیزی کو دخل نہ تھا۔

عربی نظم و نثر لکھنے پر اچھی قدرت تھی۔ فارسی نظم کسی طرح کاملین اہل زبان سے الگ نہیں ہوسکتی اردو میں ان کا حُسن بیان ایسا تھا کہ سرسید فرماتے تھے کہ "اہل دہلی اس پر رشک کرتے ہیں تصنیفات آپ کی بہت ہیں۔ حسب ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

سفرنامہ مصر و روم و شام۔ الفاروق۔ الغزالی۔ النعمان۔ المامون۔ الکلام۔ الجزیہ۔ تاریخ اسلام سوانح عمری مولانائے روم۔ اورنگ زیب۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ مقالات شبلی۔ مجموعہ رسائل شبلی۔ شعر العجم ۵ جلدوں میں۔ آپ کی آخری تصنیف سیرۃ النبی ہے۔ ۷ جلدوں میں۔ جس کو ناتمام چھوڑا۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے شاگرد رشید مولوی محمد سلیمان صاحب ندوی نے آپ کی ہدایت کے مطابق اس کی تکمیل کی۔ جو زیر طبع ہے۔ ۶ جلدیں شائع ہوچکیں۔

شاعری کی حقیقت

شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اس کی جامع اور مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک کے فرائض و تعلقات الگ ہیں۔ ان میں سے دو قوتیں تمام افعال و ارادات کا سرچشمہ ہیں ادراک اور احساس۔ ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا۔ اور استدلال اور انبساط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کی ایجادات، تحقیقات، انکشافات، اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائج عمل ہیں احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا۔ یا کسی مسئلے کا حل کرنا۔ یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ

متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے۔ خوشی میں سرور ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو احساس۔ انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے۔ یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر گونجتا ہے۔ مور چنگھاڑتے ہیں۔ کوئل کوکتی ہے۔ طاؤس ناچتا ہے۔ سانپ لہراتے ہیں انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق گویائی۔ اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں۔ اسی کا نام شعر ہے۔

اب منطقی پیرائے میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعے سے ادا ہوں وہ شعر ہیں۔ اور چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں۔ یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوا ہے۔ اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور اُن کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔

ایک یورپین مصنف لکھتا ہے "کہ ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے" اس بنا پر فلک نیلگوں۔ نجم درخشاں نسیم سحر۔ گلگونۂ شفق۔ تبسم گل۔ خرام صبا۔ نالۂ بلبل۔ ویرانی دشت۔ شادابی چمن۔ غرض تمام عالم شعر ہے۔ یہ آج کل کا خیال ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے آج سے چھ سو برس پہلے کہا تھا ع بس جہاں شاعر بود چوں دیگراں۔

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی۔ مصوری۔ صنعتگری۔ وغیرہ لیکن شاعری کے اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ

کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے۔ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ۔ ذائقہ۔ شامہ۔ لامسہ۔ سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ فرض کرو۔ شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اُس سے حظ نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک مؤثر منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لے لیا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر اُن صفات کو ایک ایک کرکے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیزیں اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہوتی گئی ہے۔

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے۔ یعنی اس کو سن کر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت شاعری کو سائینس اور علوم وفنون سے ممتاز کر دیتی ہے۔ شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے۔ اور سائینس کا یقین سے۔ سائینس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔ سائینس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے لیکن شاعری احساسات کو دلکش مناظر دکھاتی ہے۔ لیکن یہ خاصیت موسیقی۔ تصویر۔ بلکہ مناظر قدرت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگانی چاہئے کہ یہ چیزیں بھی اس دائرے سے نکل جائیں تاہم خطبہ، لکچر، تاریخ، افسانہ اور ڈراما شاعری کی حد میں داخل رہیں گی۔ ان میں اور شعر میں حدّ فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔ زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے کہ اکثر اعلیٰ نظمیں افسانے کی شکل میں ہوتی ہیں۔ اور افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے۔ اس لئے دونوں جب باہم مل جاتی ہیں تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ

اسی حد تک افسانہ ہے جہاں تک اس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے۔ جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں وہاں شاعری کی سرحد آ جاتی ہے۔ افسانہ نگار بیرونی اشیاء کا استقصا کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

تاریخ اور شعر کا فرق ایک مثال کے ذریعے سے اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے ایک شخص جنگل میں جا رہا ہے کسی گوشے سے ایک مہیب شیر ڈکارتا ہوا نکلا اس کی پُر رعب گونج۔ بھیانک چہرہ۔ خشمگیں آنکھوں نے اس شخص کے دل کو لرزا دیا۔ یہ شخص کسی کے سامنے شیر کا حلیہ اور شکل و صورت جن مؤثر لفظوں میں بیان کرے گا وہ شعر ہے۔ علم الحیوانات کا ایک عالم کسی عجائب خانے میں جاتا ہے وہاں ایک شیر کٹہرے میں بند ہے یہ عالم شیر کے ایک ایک عضو کو علمی حیثیت سے دیکھتا ہے اور علمی طریقے سے کسی مجمع کے سامنے شیر پر لکچر دیتا ہے یہ سائینس یا تاریخ یا واقعہ نگاری ہے شاعری کی اقسام میں ایک قسم واقعہ نگاری ہے۔ یعنی شاعر خارجی واقعات کی تصویر کھینچتا ہے۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ فی نفسہ وہ کیا ہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے جذبات پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔ شاعر ان اشیا کی سادہ خط و خال کی تصویر نہیں کھینچتا بلکہ ان میں قوت تخئیل کا رنگ بھرتا ہے تاکہ مؤثر بن جائے۔

اس تقریر سے شاعری اور واقعہ نگاری کا فرق واضح ہو جاتا ہے لیکن خطابت اور شاعری کی حدّ فاصل اب بھی نہیں قائم ہوئی۔ خطابت میں بھی شاعری کی طرح جذبات اور احساسات کا برانگیختہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں شاعری اور خطابت جدا جدا چیزیں ہیں خطابت کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔ اسپیکر حاضرین کے مذاق۔ معتقدات۔ اور میلان طبع کی جستجو کرتا ہے۔ تاکہ اس کے لحاظ سے

تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے اُن کے جذبات کو برانگیختہ کر سکے اور اپنے کام میں لائے۔ بخلاف اس کے شاعر کو دوسروں سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کوئی اس کے سامنے ہے بھی یا نہیں۔ اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ بے شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو ان کے دل پر اثر کریں گے لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر نہیں رکھا تھا جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اس کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سنائے لیکن اگر کوئی شخص سن لے تو ضرور تڑپ جائے گا۔

اصلی شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو۔ لیکن جو لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام سے یہ مطلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اس کے سامنے موجود ہیں۔ لیکن اگر ایکٹ کی حالت میں وہ اس علم کا اظہار کر دے تو سارا پاٹ غارت ہو جائے گا۔ شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے۔ بخلاف اس کے خطابت لوگوں سے ملنے جُلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے۔ اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے لیکن خطیب کے لئے ضرور ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نباض ہو۔

شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں

ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وزن ہوتا ہے محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے خیال بندی ہوتی ہے الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں بندش صاف ہوتی ہے

طرز ادا میں جدت ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزا ہیں۔ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہ ہوتا۔ اگر ایسا نہیں ہے۔ اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص ان چیزوں کو متعین کر دینا چاہئے جن کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے۔ اسی لئے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں۔ لیکن محققین کی یہ رائے نہیں۔ وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں۔ تاہم ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوری ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا۔ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے۔ اور باوجود اس کے وہ عمدہ اشعار خیال کئے جاتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخئیل اس کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی اس لئے تخئیل بھی محاکات ہے۔ لیکن یہ زبردستی ہے۔ آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخئیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ محاکات اور تخئیل ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ باقی اور اوصاف یعنی سلاست۔ صفائی۔ حسن بندش۔ وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزاے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔

محاکات کی تعریف محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس سے شعر کا تصور آنکھوں میں پھر جائے تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی اشیاء کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اعلیٰ درجے کے مصوّر انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرے سے جذبات انسانی مثلاً رنج۔ خوشی۔ تفکر۔ حیرت۔ استعجاب۔ پریشانی اور بیتابی ظاہر ہو۔ تاہم تصویر ہر جگہ محاکات

کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ سیکڑوں گوناگوں واقعات۔ حالات اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں۔ مثلاً اس شعر میں۔

نسب نامۂ دولتِ کے قباد　　ورق بر ورق ہر سوئے بُرد باد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برد باد ہو گیا۔ یہ خیال تصویر کے ذریعے سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال و خط دکھا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہو گی۔ بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں۔ شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے۔ باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے۔ فرض کرو ایک پھول کی تصویر کھینچی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے لیکن شاعر کے لئے یہ ضرور نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کر دے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔

ایک اور بڑا فرق مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جزء نمایاں کر کے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا　　تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو۔ اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہو گیا

تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے۔ لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر ۲ دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے۔ یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی۔ نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے۔ ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی۔ اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حُسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے۔ لیکن قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اس کا حُسن پورا پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

تخئیل کی حقیقت | **تخئیل** کی تعریف ہنری لوئیس نے یہ کی ہے " وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیا کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں ہمارے نظر کے سامنے کر دے" لیکن یہ تعریف پوری جامع اور مانع نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کی منطقی جامع اور مانع تعریف ہو بھی نہیں سکتی۔

تخئیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق یا فلسفہ کا موجد صاحب تخئیل نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اگر خود کسی فلسفہ دان کو اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اس کو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں تو قوت تخئیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخئیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور انکشاف مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔ چونکہ اکثر سائینس دان شاعری کا مذاق نہیں رکھتے اور شعرا فلسفہ اور سائینس سے نامالوس ہوتے ہیں اس لئے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ قوت تخئیل کو فلسفہ اور سائینس سے تعلق نہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ بے شبہ عام سائینس یا فلسفہ جاننے والے جن میں قوت ایجاد نہیں قوت تخئیل سے کون انکار کر سکتا ہے۔ نیوٹن اور ارسطو میں اسی قدر

زبردست قوت تخئیل تھی جس قدر ہومر اور فردوسی میں۔ البتہ دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اور دونوں کی قوت تخئیل کے استعمال کا طریقہ الگ الگ ہے۔
فلسفہ اور سائینس میں قوت تخئیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ حل کر دیا جائے۔ لیکن شاعری میں تخئیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تحریک ہو۔ فلسفی کو صرف ان موجودات سے غرض ہے جو واقع ہیں موجود ہیں۔ بخلاف اس کے شاعر ان موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں۔ فلسفہ کے دربار میں ہما۔ سیمرغ۔ گاؤ زمیں۔ تخت سلیماں کی مطلق قدر نہیں۔ لیکن یہی چیزیں ایوان شاعری کے نقش و نگار ہیں۔ فلسفی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہو گا۔ لیکن شاعر اس قسم کی فرضی مخلوقات سے اپنا عالم خیال آباد کرتا ہے۔ اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا۔ کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلے کی تعلیم کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے۔ اور بے شبہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک پھول کو دیکھ کر سائینس داں تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے۔ اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے۔ اس کی غذا زمین کے کن اجزا سے ہے۔ اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں یا صرف ایک کے۔ لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں۔ پھول دیکھ کر بے اختیار اس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے ع اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری۔
چاند کی نسبت ایک ہیئت داں کو ان مسائل سے غرض ہے کہ وہ کن عناصر سے بنا ہے۔ آباد ہے یا ویران۔ روشن ہے یا تاریک۔ سمندر کے مد و جزر سے اس کو کیا تعلق ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شاعر کو چاند سے صرف یہ غرض ہے کہ وہ معشوق کا روئے روشن ہے۔
شاعر کے سامنے (قوت تخئیل کی بدولت) تمام بے حس اشیا جاندار چیزیں بن جاتی ہیں

اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں۔ زمین آسمان ستارے بلکہ ذرہ ذرہ اس سے باتیں کرتا ہے۔

قوت تخییل کے ذریعے سے اکثر شاعر نیا دعویٰ کرتا ہے اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ ایک منطقی اس کی دلیل نہ تسلیم کرے۔ لیکن جن لوگوں کو وہ قوت تخییل کے ذریعے سے معمول کر لیتا ہے وہ اس کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں کر سکتے۔

محاکات کی تکمیل کن کن چیزوں سے ہوتی ہے

۱۔ محاکات جب موزوں کلام کے ذریعے سے کی جائے تو سب سے پہلے وزن کا تناسب شرط ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ درد۔ غم۔ رنج۔ جوش۔ غیظ۔ غضب ہر ایک کے اظہار کا لہجہ اور آواز مختلف ہے۔ اس لئے جس جذبہ کی محاکات مقصود ہو تو شعر کا وزن بھی اسی کے مناسب ہونا چاہئے تاکہ اس جذبے کی پوری حالت ادا ہو سکے۔ مثلاً فارسی میں بحر تقارب جس میں شاہنامہ ہے رزمیہ خیالات کے لئے موزوں ہے۔ چنانچہ فارسی میں جس قدر رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں سب اسی بحر میں لکھی گئیں۔ اسی طرح غزل اور عشق و عاشقی کے خیالات کے لئے خاص خاص بحریں ہیں۔ ان خیالات کو قصیدے کی بحروں میں ادا کیا جائے تو تاثیر گھٹ جاتی ہے۔

۲۔ محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو۔ یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آجائے۔ شاعری کا اصلی مقصد طبیعت کا انبساط ہے۔ کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے۔ (وہ شے اچھی یا بری ہے اس سے بحث نہیں) مثلاً چھپکلی ایک بدصورت جانور ہے جس کو دیکھکر نفرت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک استاد مصور چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو تو اس کے دیکھنے سے خواہ مخواہ لطف آئے گا۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ نقل کا اصل سے مطابق ہونا خود ایک مؤثر چیز ہے۔ اب اگر وہ چیزیں جن کی محاکات کا مقصود ہے خود بھی دلآویز لطف انگیز ہوں تو محاکات کا اثر بہت بڑھ جائے گا۔

اصل کی مطابقت مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔
(۱) جس شے کا بیان کرنا ہے اس کے جزئیات کا اس طرح استقصا کیا جائے کہ پوری شے کی تصویر نظر کے سامنے آجائے۔ مثلاً اگر احباب کی مفارقت کا واقعہ لکھنا ہے تو ان تمام جزئی حالات اور کیفیات کا استقصار کرنا چاہیئے جو اس وقت پیش آتی ہیں۔ یعنی اس حالت میں ایک دوسرے کی طرف کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کس طرح گلے مل کر روتا ہے۔ کس قسم کی دردانگیز باتیں کرتا ہے۔ کن باتوں سے دل کو تسلی دیتا ہے۔ رخصت کے وقت کیا بے اختیار حرکات صادر ہوتے ہیں۔ آغاز میں جو کیفیت تھی کس طرح بہ تدریج بڑھتی جاتی ہے۔ حاضرین پر اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ ان باتوں میں سے ایک بھی رہ گئی تو مطابقت میں کمی رہ گئی۔
(۲) اکثر چیزیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مختلف انواع ہوتے ہیں۔ اور ہر نوع میں الگ خصوصیت ہوتی ہے۔ مثلاً آواز ایک عام چیز ہے۔ اس کی مختلف نوعیں ہیں۔ پست۔ بلند۔ شیریں۔ کرخت۔ سریلی وغیرہ وغیرہ۔ ذوقی چیزوں میں یہ فرق اور نازک ہو جاتا ہے۔ مثلاً معشوق کی ادا ایک عام چیز ہے لیکن الگ الگ خصوصیتوں کی بنا پر ان کے جدا جدا نام ہیں۔ یعنی ناز۔ عشوہ۔ غمزہ۔ شوخی۔ دنیا کی جو زبانیں وسیع اور لطیف ہیں ان میں ان دقیق فرقوں کی بنا پر ہر چیز کیلئے الگ الگ الفاظ پیدا ہو جاتے ہیں اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو ان خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں۔ ساودی نے ایک نظم لکھی تھی جس کا شان نزول یہ ہے کہ اس سے اس کے کم سن بچے نے پوچھا کہ "سیلاب کیونکر آتا ہے" ساودی نے اس کے جواب میں یہ نظم لکھی اور دکھایا کہ سیلاب کس طرح آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے۔ اور کس طرح بڑھتا جاتا ہے۔ اس نظم میں تمام الفاظ اس قسم کے آئے ہیں کہ پانی کے بہنے۔ گرنے۔ پھیلنے۔ بڑھنے (وغیرہ وغیرہ) کے وقت جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

الفاظ کے لہجے سے ان کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص خوش ادائی سے اس نظم کو پڑھے تو سننے والے کو معلوم ہوگا کہ زور شور سے سیلاب بڑھتا ہوا چلا آتا ہے۔

۳ جب کسی ملک۔ یا کسی مرد۔ یا عورت۔ یا بچّے کی حالت بیان کی جائے تو ضرور ہے کہ ان کی تمام خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے۔ مثلاً اگر کسی بچّے کی کسی بات کی نقل کرنی مقصود ہو تو بچّوں کی زبان کا۔ طرز ادا کا۔ خیالات کا لہجے کا۔ لحاظ رکھنا چاہیے۔ یعنی ان تمام باتوں کو بعینہ ادا کرنا چاہیے۔ مثلاً۔

چلاتی ہے سکینہ کہ "اچھے مرے چچا"   محمل میں گھٹ گئی" مجھے گودی میں لو ذرا"
بابا سے کہہ دو اب کہیں خیمہ کریں بپا   ٹھنڈی ہوا میں لیکے چلو تم پہ میں فدا

سایہ کسی جگہ ہے۔ نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

یہ وہ موقع ہے کہ اہلبیت نہایت سخت گرمیوں میں کربلا کو روانہ ہوئے ہیں۔ اور سکینہ (حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی) اپنے چچا یعنی حضرت عباس سے گرمی کی شکایت کرتی ہیں۔ اس بند میں بچّوں کی طرز گفتار اور خیالات کی تمام خصوصیات کو ملحوظ رکھا ہے۔ "اچھے چچا" خاص بچوں کی زبان ہے۔ گودی میں بچوں کو خاص لطف آتا ہے۔ اس لئے گودی میں لینے کی فرمائش سے طفلانہ خواہش کا اظہار ہوتا ہے بچّے اپنے مقصد حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ طعنہ دینا سمجھتے ہیں۔ اس لئے حضرت عباس کو طعنہ دیا ہے کہ آپ تو مزے سے ہوا میں ہیں آپ کو میری کیا فکر ہے۔ آپ کے بجائے تم کہنا انتہا درجے کا پیارا اور طفلانہ تفوق اور حکومت ہے۔ ان خصوصیات کے اجتماع نے محاکات کو کمال کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ اور واقعے کی پوری تصویر اُتر آئی۔

محاکات کے کمال کے لئے عالم کائنات کی ہر قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے

شاعر کبھی لڑائیوں اور معرکوں کا حال لکھتا ہے۔ کبھی قوموں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچتا ہے۔ کبھی جذبات انسانی کا عالم دکھاتا ہے۔ کبھی شاہی درباروں کا جاہ وحشم بیان کرتا ہے۔ کبھی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کی سیر کراتا ہے۔ اس حالت میں اگر اس نے عالم کائنات کا مشاہدہ نہ کیا ہو اور ایک ایک چیز کی خصوصیات اور قابل انتخاب باتوں کو وقت آفرینی سے نہ دیکھا ہو تو وہ ان مرحلوں کو کیونکر طے کر سکتا ہے شیکسپیر تمام دنیا کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر درجے اور ہر طبقے کے لوگوں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچی ہے اور اس طرح کھینچی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔

محاکات میں نہایت فرق مراتب ہے۔ اسی فرق مراتب کی بنا پر شاعری کے مدارج میں نہایت تفاوت ہے۔ اس کو پہلے محسوسات کے ذریعے سے ذہن نشیں کرو۔ اگر سوتے ہوئے شخص کی تصویر کھینچی جائے تو ایک معمولی مصور تصویر میں صرف اس قدر دکھائے گا کہ آنکھیں بند ہیں جس سے ظاہر ہو کہ وہ شخص سو رہا ہے۔ لیکن ایک دقیقہ رس مصور ان خصوصیتوں کا بھی لحاظ رکھے گا کہ کس قسم کی نیند ہے۔ گہری ہے یا معمولی یا نیم خوابی۔ اس سے بڑھ کر اس بات کو بھی ملحوظ رکھے گا کہ سونے کی حالت میں اعضا کی جو حالت ہوتی ہے وہ بھی نمایاں کی جائے۔ بے خبری میں لباس اور اعضا کی ہیئت میں جو بے ڈھنگا پن پیدا ہو جاتا ہے وہ بھی ظاہر ہو۔ بچوں جوانوں۔ عورتوں اور مردوں کی نیند میں جو فرق ہے اس کی خصوصیات نظر آئیں۔ اسی طرح جس قدر زیادہ فن تصویر میں کمال ہوگا اسی قدر تصویر میں باریکیاں پیدا ہوتی جائیں گی۔

یونان میں ایک دفعہ ایک مصوّر نے ایک آدمی کی جس کے ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے تصویر بنا کر موقع عام پر آویزاں کی تصویر اس قدر اصل کے مطابق تھی کہ پرند انگور کو اصلی انگور سمجھ کر اس پر گرتے تھے اور چونچ مارتے تھے۔ تمام نمایش گاہ میں غل پڑ گیا اور لوگ ہر طرف سے آ آ کر مصوّر کو مبارکباد دینے لگے۔ لیکن مصور روتا تھا کہ تصویر میں نقص

رہ گیا۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کمال ہو سکتا تھا! مصور نے کہا بے شبہ انگور کی تصویر اچھی بنی ہے۔ لیکن جس آدمی کے ہاتھ میں انگور ہے اس کی تصویر اچھی نہیں۔ ورنہ پرند انگور پر ٹوٹنے کی جرأت نہ کرتے۔

اسی قسم کے دقائق اور باریکیاں محاکات میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہی نکتے ہیں جن کی بنا پر شعرا میں فرق مراتب ہوتا ہے۔ محاکات کے یہ دقائق ہر چیز کی محاکات میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی خواہ کسی واقعہ کا بیان کیا جائے یا کسی منظر کا یا جذبات انسانی کا یا کسی حالت یا کیفیت کا۔ ہم ہر قسم کی مثالیں ذیل میں لکھتے ہیں۔

دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند — دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند — ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند

تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

یہ موقع ہے کہ کربلا میں حضرت عباس اہل بیت کے لئے پانی لینے گئے ہیں اور نہر کے کنارے پہنچے ہیں۔ لیکن نہ خود پانی پیتے ہیں نہ گھوڑے کو پلاتے ہیں صرف مشک بھر لی ہے کہ اہلبیت کو لاکر پلائیں گے۔ گھوڑا حضرت عباس کے اس ارادے سے واقف ہے کہ وہ اس کو پانی پلانا نہیں چاہتے۔ اب خیال کرو کہ ایک جانور کئی دن کا پیاسا پانی کے پاس پہنچ جائے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ ایک طرف پیاس اس کو بے اختیار کرتی ہے دوسری طرف آقا مانع ہے۔ اس دوطرفہ کشمکش میں بار بار کانپنا اور بند بند کا سمٹنا اصلی نیچرل اور فطرتی حالت ہے۔

لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے — زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے

یہ وہ موقع ہے کہ اہلبیت۔ کربلا کے میدان میں اُترے ہیں اور نوجوان اور بچے ساتھ ساتھ چہل قدمی کر رہے ہیں۔ کوئی معمولی شاعر اس منظر کو دکھاتا۔ تو بچوں کا

کھیلتے کودتے چلنا بیان کر دیتا۔ لیکن نکتہ سنج شاعر کی نگاہ اس پر پڑتی ہے کہ بچے تنہا نہیں ہیں بلکہ اپنے سے بڑی عمر والوں کے ساتھ ہیں۔ اس لئے کھل کھیل نہیں سکتے۔ تاہم بچے ہیں۔ اور بچوں کی خصوصیت نہ دکھائی جائے تو واقعے کی اصلی تصویر نہیں کھنچتی۔ اس لئے کہتا ہے کہ بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے۔

لیکن ہر جگہ کسی شے یا واقعہ کے تمام اجزا کی محاکات ضروری نہیں۔ فن تصویر کے ماہر جانتے ہیں کہ اکثر صاحب کمال مصور تصویر کے بعض حصے خالی چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن اور اعضا یا اجزا کی تصویر اس خوبی کے ساتھ کھینچتا ہے کہ دیکھنے والے کی نظر چھوڑے ہوئے حصے کو خود پورا کر لیتی ہے۔ اس کو مثال میں یوں سمجھو کہ کاغذ پر جو تصویر ہوتی ہے اس میں عمق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کاغذ میں خود عمق نہیں۔ باوجود اس کے کاغذ پر نہایت موٹے آدمی کی تصویر بنا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ چونکہ تصویر میں عرض و طول موجود ہوتا ہے اس لئے اس کی مناسبت سے قوت متخیلہ خود دبازت اور موٹاپن پیدا کر لیتی ہے اور ہم کو تصویر میں اسی طرح موٹاپا محسوس ہوتا ہے جس طرح عرض و طول محسوس ہوتے ہیں۔ شاعر اکثر کوئی واقعہ یا کوئی سماں باندھتا ہے اور تمام حالات کا استقصا نہیں کرتا لیکن چند ایسے نمایاں خصوصیات ادا کر دیتا ہے کہ پورا واقعہ یا پورا سماں آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اس شعر میں اس حالت کی تصویر کھینچی ہے کہ عاشق عشق میں سرشار ہے لوگ اس کے پاس جا کر اس کو سمجھاتے ہیں کہ معشوق بے وفا ہے۔ اس سے دل لگانا بے فائدہ ہے۔ عاشق جھنجھلا کر کہتا ہے اچھا ہے تو ہے۔ جس کو اپنی جان عزیز ہے وہ اس سے دل ہی کیوں لگاتا ہے۔ یعنی میں نے اپنی جان پر کھیل کر اس سے دل لگایا ہے۔ میرا عشق اس کی وفا پر منحصر نہیں۔ اس شعر میں یہ الفاظ کہ لوگ عاشق کو سمجھاتے ہیں کہ "عشق

معشوق کی وفا کا پابند نہیں" بالکل متروک ہیں۔ لیکن اور واقعات اس طرح اور اس انداز سے ادا کئے ہیں کہ متروک جملے خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور تصویر کا یہ چھوٹا ہوا حصہ خود نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

تنبیہ۔ یہاں یہ نکتہ نہایت توجہ کے ساتھ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ان موقعوں پر غلطی کا سخت احتمال ہے۔ اکثر اشعار جو پیچیدہ اور ناقابل فہم ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ شاعر مضمون کا بعض حصہ چھوڑ جاتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ گرد و پیش کا مصالحہ اس خلو کو بھر دے گا۔ حالانکہ وہ اس کو نہیں بھر سکا۔ اس قسم کے اشعار بعض جگہ مہمل بن جاتے ہیں۔

محاکات کی تکمیل بعض اوقات مخالف پہلو دکھانے سے ہوتی ہے۔ ایک سفید چیز کے سامنے سیاہ چیز رکھ دی جائے تو سفیدی اور زیادہ نمایاں ہو جائے گی۔ اسی طرح اکثر کسی حالت کے زیادہ نمایاں کرنے میں یہ طریقہ کام آتا ہے کہ اس کا مخالف پہلو دکھایا جائے

محاکات کا ایک بڑا آلہ تشبیہ ہے۔ اکثر اوقات ایک چیز کی اصلی تصویر جس طرح تشبیہ سے دکھائی جا سکتی ہے دوسرے طریقے سے ادا نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں محاکات کا کمال یہی ہے کہ اس چیز کی پوری تصویر کھینچی جائے جس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام جزئیات کا استقصا کیا جائے یا بعض جزئیات کو نمایاں کر کے دکھایا جائے۔ لیکن بعض جگہ محاکات کے مؤثر ہونے کے لئے یہ ضرور ہے کہ تصویر ایسی دھندلی کھینچی جائے کہ اکثر حصے اچھی طرح نظر آئیں۔

عالم ارواح یا ملائکہ کی جو فرضی تصویر کھینچی جاتی ہے اس میں صورتوں کو اور لباس کو نمایاں نہیں کرتے۔ کیونکہ انسان پر ایک شے کی عظمت کا اثر اس وقت زیادہ پڑتا ہے جب وہ اچھی طرح نظر نہ آئے۔ ذخّار سمندر کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ موجیں اور آسمان کی فضا دھندلی نظر آئے۔ اندھیری راتوں میں دور سے جنگل میں کوئی

ڈھندلا سا عکس نظر آتا ہے تو انسان ہیبت زدہ ہو جاتا ہے کہ معلوم نہیں کس درجے کی مہیب چیز ہے۔

اسی طرح بعض اوقات جب کسی چیز کی عظمت کی تصویر کھینچنی مقصود ہوتی ہے تو تصویر کے حصے نمایاں نہیں کئے جاتے۔ اور واقعے کے تمام اجزا کا ذکر نہیں کرتے۔ برک نے لکھا ہے کہ ملٹن کی پیریڈائز لاسٹ (گم شدہ فردوس) میں سب سے زیادہ شاعری اس موقع پر صرف کی گئی ہے جہاں شیطان کی تعریف ہے۔ اور وہاں اسی طریقے سے کام لیا گیا ہے۔

تخئیل کی تفصیلی بحث

اگرچہ محاکات اور تخئیل دونوں شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہے۔ محاکات میں جو جان آتی ہے تخئیل ہی سے آتی ہے ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں۔ قوت محاکات کا یہ کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سُنے اس کو الفاظ کے ذریعہ سے بعینہٖ ادا کر دے۔ لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا۔ تناسب اور توافق کو کام میں لانا۔ ان پر آب و رنگ چڑھانا قوت تخئیل کا کام ہے۔ قوت تخئیل مختلف صورتوں میں عمل کرتی ہے۔

۱۔ شاعر کی نظر میں عالم کائنات قوت تخئیل سے ایک اور عالم بن جاتا ہے۔ ہم کائنات کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ حسّاس اور غیر حسّاس لیکن شاعری کے عالم تخئیل کا ذرّہ ذرّہ جاندار اور ہوش و عقل و جذبات سے لبریز ہے۔ آفتاب۔ ماہتاب ستارے۔ صبح۔ شام۔ شفق۔ باغ۔ پھول۔ پتّے۔ سب اس سے ہم زبانی کرتے ہیں۔ سب اس کے رازدار ہیں۔ سب سے اس کے تعلقات ہیں۔ وہ شبِ وصل اور صبح وصل سے یوں خطاب کرتا ہے۔

اے شب اگرت ہزار کارست مُرَوْ	اے رات تجھ کو آج ہزاروں کام سہی لیکن نہ جا
وے صبح گرت ہزار شادیست مخند	اے صبح! تجھ کو ہزاروں خوشیاں سہی لیکن نہ ہنس

شبِ وصل میں وہ آسمان سے کہتا ہے۔

نہ گویم اے فلک کز کجروی ہابت تو برگردی — اے آسمان! میں تجھ سے یوں تو نہیں کہتا کہ تو اپنی کجروی سے باز۔
شبِ وصل است خواہم ایں قدر آہستہ تر گردی — لیکن اتنا کہ آج شبِ وصل ہے ذرا آہستہ چل کہ جلدی صبح نہ ہو۔

عالم فطرت شاعر کے اثر میں ہے وہ سب پر حکومت کرتا ہے اور ان سے کام لیتا ہے۔ افراد کائنات اس سے عجیب عجیب راز رکھتے ہیں۔ اس عالم میں شاعری کی تاریخ زندگی عجب دلچسپیوں سے بھری ہوتی ہے۔ بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے۔ پروانے اس کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں۔ شمع سے رات رات بھر وہ سوز دل کہتا رہا ہے۔ نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہے۔ بارہا اس نے غنچے کی عین اس وقت پردہ دری کی ہے جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا۔

شاعر کا احساس نہایت لطیف۔ تیز اور مشتعل ہوتا ہے۔ عام لوگوں کے جذبات بھی خاص خاص حالتوں میں مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت وہ بھی مظاہر قدرت سے اسی طرح خطاب کرنے لگتے ہیں۔ خیال کرو ایک عورت جس کا جوان بیٹا مر گیا ہے کس طرح موت کو۔ آسمان کو۔ زمین کو کوسنے دیتی ہے۔ کس طرح ان سے خطاب کرتی ہے۔ اس کو صاف نظر آتا ہے کہ یہ سب اس کے دشمن ہیں۔ انھی نے اس کے پیارے بیٹے کو اس سے چھین لیا ہے۔ انھوں نے دانستہ اس پر ظلم کیا ہے۔

لیکن شاعر کے تمام احساسات اور جذبات سریع الانفعال۔ سریع الحس اور زود اشتعال ہوتے ہیں۔ وہ معشوق کی گلی میں جاتا ہے تو اس کو علانیہ در و دیوار سے ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس کو وہ خاص ایک علامت قرار دیتا ہے کہ معشوق گھر میں موجود ہے۔ کیونکہ جب کبھی معشوق گھر میں نہیں ہوتا تو اس کو یہ لذت نہیں محسوس ہوتی۔ واقعات عام پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ایک ایک ذرہ ناصح بن کر اس کو اخلاق اور موعظت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس عالم میں وہ گور غریباں میں جا نکلتا ہے تو بوسیدہ ہڈیاں

علانیہ اس سے خطاب کرتی ہیں۔ عالم شوق میں وہ پھول ہاتھ میں اُٹھا لیتا ہے تو اس کو صاف معشوق کی خوشبو آتی ہے۔

یہ باتیں کسی اور کی زبان سے ادا ہوں تو ہم اُس کو مجنوں سمجھیں گے۔ لیکن شاعر اس انداز سے کہتا ہے کہ سننے والوں پر اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ کہتا ہے اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اور ایک حقیقی حالت کی تصویر ہوتا ہے۔

۲۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہئے کہ تخیّل صرف خیالی اور سیمیاوی صورتوں کا نام ہے جو جذبات کے طاری ہونے کے وقت نظر آتے ہیں۔ تخیّل نے اکثر وہ راز کھولے ہیں جو نہ صرف عوام بلکہ خواص کی نظر سے بھی مخفی تھے۔ وقت آفرینی اور حقیقت سنجی جو فلسفہ کی بنیاد ہے تخیّل ہی کا کام ہے۔ اسی بنا پر شاعری اور فلسفہ دو برابر درجے کی چیزیں تسلیم کی گئی ہیں۔ کیونکہ دونوں میں تخیّل یکساں کام کرتی ہے۔ ہومر یونان کا مشہور شاعر اس زمانے میں تھا جب یونان میں فلسفہ کا وجود بھی نہ تھا۔ اور اس وجہ سے وہ فلسفہ وغیرہ سے ناآشنا تھا۔ تاہم ارسطو نے اپنی کتاب المنطق میں شاعری کے جو علمی اصول منضبط کئے اسی کے کلام سے کئے ہیں۔ چنانچہ ہر جگہ اس کے حوالے دیتا ہے۔ گیزو جو فرانس کا مشہور مصنف ہے لکھتا ہے۔

> ہومر کے شعر میں جو یہ باتیں نظر آتی ہیں کہ وہ خیر، و شر، ضعف اور قوت، فکر اور جذبات کو ساتھ ساتھ دکھاتا ہے اور خیالات اور اقوال کا تنوع اور فطرت کے حالات کو اس وسعت اور رنگ برنگ طریقوں سے لکھتا ہے کہ شاعرانہ جذبات کو اشتعال ہوتا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کلام میں ہر اصل کی اصل اور انسان اور عالم کائنات کی حقیقت مندرج ہے۔

ارسطو نے علم الاخلاق پر جو کتاب لکھی ہے اور جو محقق طوسی اور جلال الدین دوانی کے ذریعے سے فارسی زبان میں آگئی ہے ہمارے سامنے ہے۔ لیکن شاعری نے فلسفۂ اخلاق کے جو نکتے ادا کئے ارسطو کی کتاب میں نہیں ملتے۔ نہ صرف اخلاق بلکہ واردات

قلبی۔ فطرت انسانی۔ عام معاشرت کے متعلق بقراط نے جو فلسفیانہ نکتے پیدا کئے فلسفہ کی کتابیں ان سے خالی ہیں۔

شاعر قوت تخیئل تمام اشیا کو نہایت دقیق نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر چیز کی ایک ایک خاصیت ایک ایک وصف پر نظر ڈالتا ہے۔ پھر اور اور چیزوں سے ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ ان کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالتا ہے۔ ان کے مشترک اوصاف کو ڈھونڈھ کر ان سب کو ایک سلسلے میں مربوط کرتا ہے۔ کبھی اس کے برخلاف جو چیزیں یکساں اور متحد خیال کی جاتی ہیں ان کو زیادہ نکتہ سنجی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں فرق اور امتیاز پیدا کرتا ہے۔

تخیئل کے لئے مواد

اکثر لوگوں کا خیال ہے تخیئل کے لئے معلومات و مشاہدات کی ضرورت نہیں۔ یا ہے تو بہت کم۔ کیونکہ تخیئل کا عمل واقعی موجودات پر موقوف نہیں۔ وہ خیالی باتوں سے ہر قسم کا کام لے سکتی ہے۔ اس کی عمارت کے لئے محالات کا مصالحہ اسی طرح کام میں آسکتا ہے جس طرح ممکنات کا۔ وہ ایک چھوٹی سی چیز سے سیکڑوں ہزاروں خیالات پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان شعرا نے جنھوں نے واقعات یا مشاہدات کو ہاتھ تک نہیں لگایا خیالات کا گوناگوں عالم پیدا کر دیا۔ جلال اسیر۔ زلالی۔ شوکت بخاری۔ بیدل۔ ناصر علی۔ وغیرہ نے صرف گل و بلبل سے دیوان طیار کر دئے۔ اور شاعری کا چمنستان خیال بنا دیا۔

لیکن یہ خیال نہایت غلط ہے۔ اور اسی غلطی نے متاخرین کی شاعری کو تباہ کر دیا۔ اولاً تو کوئی خیال مشاہدات اور واقعات کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ جن چیزوں کو ناممکن کہتے ہیں ان کا خیال بھی درحقیقت ممکن ہی کے مشاہدے سے پیدا ہوا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک چیز ایک ہی وقت میں موجود بھی ہو اور معدوم بھی ہو۔ موجود اور معدوم الگ الگ ممکن ہیں۔ ان دونوں کو ترکیب دے کر موجود معدوم ایک فرضی مفہوم بنا یا تو محال ہو گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس مرکب کے دونوں اجزا

الگ الگ ممکن ہیں۔

شاعری میں اکثر ناممکنات یا غیر موجود چیزوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً گھوڑے کی تیزروی کی تعریف کرتے ہیں تو دریاے آتش کہتے ہیں۔ شراب کو یاقوت سیال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ سب چیزیں فرضی ہیں۔ لیکن ان کا خیال واقعی ہی چیزوں سے پیدا ہوا ہے۔ مثلاً آگ اور دریا الگ الگ واقعی اور خارجی چیزیں ہیں۔ انھیں دونوں کو ملاکر دریاے آتش ایک خیالی مفہوم پیدا کر لیا۔ اور اس سے تیز گھوڑے کو تشبیہ دیگئی اس سے ثابت ہوگا کہ کوئی خیال مشاہدات کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تخیئل کی وسعت کے لئے واقعات کا کثرت سے ملاحظہ کرنا خواہ مخواہ لازمی ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ایک معمولی سے معمولی چیز پر قوت تخیئل مدتوں صرف کی جاسکتی ہے۔ اور سیکڑوں مضامین پیدا کئے جا سکتے ہیں جس کی محسوس مثال شعرائے متاخرین کی نکتہ آفرینیاں ہیں۔ لیکن اس کی مثال سرکس کے گھوڑے کی ہے جو ایک خیمے کے اندر طرح طرح کے تماشے دکھا سکتا ہے۔ لیکن سطے منازل میں۔ میدان جنگ میں۔ گھوڑ دوڑ میں کام نہیں آسکتا۔ اسی طرح تخیئل کا عمل بھی ایک محدود دائرے میں جاری رہ سکتا ہے۔ لیکن اس کی وسعت کیا ہوگی۔ اور ایسی شاعری کس کام آئے گی۔ وہ شاعری جو ہر قسم کے جذبات کا آئینہ بن سکتی ہو۔ جو فطرت انسانی کا راز کھول سکتی ہو اس کے لئے ایسا محدود تخیئل کیا کام آسکتا ہے۔ تخیئل جس قدر قوی باریک۔ متنوع اور کثیر العمل ہوگی اُسی قدر اس کے لئے مشاہدات کی ضرورت ہوگی۔ جس قدر بلند پرواز طائر ہوگا اسی قدر اس کے لئے فضا کی وسعت زیادہ درکار ہوگی

تخیئل کی بے اعتدالی

شعرا کی اس سے زیادہ کوئی بدقسمتی نہیں کہ تخیئل کا بیجا استعمال کیا جاے۔ طبیعیات کے متعلق جس طرح یونانی حکما کی قوتیں بیکار گئیں اور آج تک ان کے پیرو ہیولی اور صورت کی فضول بحثوں میں اُلجھ کر کائنات کا ایک عقدہ بھی

حل نہ کر سکے۔ بعینہ ہمارے متاخرین شعرا کا یہی حال ہوا۔ ان کی قوت تخیل قدما سے زیادہ ہے۔ لیکن افسوس بالکل رایگاں صرف کی گئی۔

۱۔ قوت تخیل کو سب سے زیادہ بے اعتدالی کا موقع مبالغہ میں ملتا ہے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مبالغے کے لئے اصلیت اور واقعیت کی ضرورت نہیں۔ اس بنا پر قوت تخیل جی کھول کر بلند پردازی دکھاتی ہے۔ اور کج روی اور بے راہ روی کی اس کو پروا نہیں ہوتی۔ قوت تخیل کی خوبی یہ ہے کہ محال بات اس انداز سے ادا کی جائے کہ بظاہر ممکن بن جائے مثلاً میر انیس اس موقع پر جہاں حضرت عباس کا نہر کے پاس پہنچنا لکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم	ابھریں درود پڑھتی ہوئیں مچھلیاں بہم
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے	دریا میں روشنی ہوئی جسم حضور سے

مچھلیوں کا درود پڑھ کر ابھرنا۔ حباب کا بولنا۔ پنجۂ مرجاں کا بلائیں لینا۔ سب ناممکنات سے ہیں۔ لیکن تخیل کی طلسم سازی نے ایک واقعی تصویر پیش نظر کر دی ہے۔ شاعر نے اوّل تو ان واقعات کو اس شخص کے متعلق لکھا ہے جس کے معجزے کی بدولت (اس کے نزدیک) سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دوسرے واقعے کے بعض اجزا صحیح یا صحیح کے مشابہ ہیں۔ مچھلیاں پانی میں اُبھرتی ہیں۔ حباب آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ مرجاں کی شکل پنجے کی ہوتی ہے۔ ان باتوں کی مجموعی حالت اور اس پر شاعر کی لطافت بیانی کی وجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حالت کی تصویر ہے۔

۲۔ وہ تخیل اکثر بیکار اور بے اثر ہوتی ہے جس میں تمام عمارت کی بنیاد صرف کسی لفظی تناسب یا ایہام پر ہوتی ہے۔ متاخرین کی اکثر نکتہ آفرینیاں اسی قسم کی ہیں۔ مثلاً مرزا دبیر تلوار کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

جل بھن کے آب تیغوں کی رن میں دھواں ہوئی	تلواروں پہ وہ سیف جو شعلہ فشاں ہوئی

تلوار کی آب کو پہلے پانی فرض کیا۔ پھر اس کا جلنا بھننا اور دھواں ہو جانا جو کچھ چاہا ثابت کرتے چلے گئے۔

۳۔ تخییل کی بے اعتدالی کا بڑا موقع استعارات اور تشبیہات ہیں۔ استعارے اور تشبیہیں جب تک لطیف اور قریب الماخذ اور اصلیت سے ملتے جلتے ہوتے ہیں شاعری میں حُسن پیدا کرتے ہیں۔ لیکن جب تخئیل کو بے اعتدالی کا موقع ملتا ہے تو وہ دور از کار اور فرضی استعارات اور تشبیہیں پیدا کرتی ہے۔ اور پھر اس پر اور بنیادیں قائم کرتی جاتی ہے۔

۴۔ تخییل کی ایک بے اعتدالی یہ ہے کہ کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دیتے ہیں۔ پھر اس شے کے جس قدر اوصاف اور لوازم ہیں سب اُس میں ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن سے کسی قسم کی مناسبت نہیں ہوتی۔ مثلاً کمر کو بال سے تشبیہ دیتے ہیں اب اس کے بعد بال کے جتنے اوصاف ہیں کمر میں ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً ناسخ کہتے ہیں۔

ابھی ہر چند وہ بُت نوجواں ہے　　　سفید اس کا مگر موئے میاں ہے

یعنی بال بڑھاپے میں سفید ہوتے ہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ معشوق کی کمر کا بال جوانی ہی میں سفید ہو گیا ہے۔ سیم بدن ہونے کے لحاظ سے کمر کو سفید کہا ہے۔

یا مثلاً ایک شاعر نے ناف کی نسبت لکھا ہے کہ " موئے کمر میں گرہ پڑ گئی" یا مثلاً ابرو کو تلوار باندھا تو تلوار کے تمام لوازم آب و تاب۔ دم۔ خم۔ جوہر۔ تاب۔ ڈاب۔ قبضہ۔ میاں۔ سب کچھ اس کے لئے ثابت کرتے جاتے ہیں۔

۵۔ تخییل کی ایک بڑی جولاں گاہ حُسن تعلیل ہے۔ یعنی شاعر قوت تخئیل سے ایک چیز کو ایک چیز کی علت قرار دیتا ہے حالانکہ دراصل وہ اس کی علت نہیں ہوتی۔ مثلاً شاعر کہتا ہے۔

کسی کے آگے کوئی ہاتھ پسارے کیا دخل　　　مُٹھی باندھے ہوئے پاتا ہے تو لڑکو وک

بچے جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں تو ان کی مٹھی بندھی ہوتی ہے۔ اب شاعر اس کی یہ وجہ قرار دیتا ہے کہ ممدوح نے تمام لوگوں کو اس قدر مالا مال کر دیا ہے کہ کسی کو کسی چیز کی حاجت نہیں رہی۔ اس لئے بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی مٹھیاں بندھی ہوتی ہیں اکثر شاعرانہ مضامین اسی حُسن تعلیل پر مبنی ہیں لیکن جب قوت تخئیل سے اعتدال کے ساتھ کام نہیں لیا جاتا تو اس میں اکثر بے اعتدالیاں ہو جاتی ہیں۔

تخئیل اور **محاکات** اگرچہ دونوں شاعری کے عنصر ہیں لیکن بہ لحاظ اکثر دونوں کے استعمال کے موقع الگ الگ ہیں۔ یہ سخت غلطی ہے کہ ایک کے بجائے دوسرے کا استعمال کیا جائے۔ مثلاً مناظر قدرت کا بیان محاکات میں داخل ہے۔ یعنی مثلاً اگر بہار، خزاں۔ باغ۔ سبزہ۔ مرغزار۔ آب رواں کا بیان کیا جائے تو محاکات سے کام لینا چاہیے۔ یعنی اس طرح بیان کرنا چاہیے۔ کہ ان چیزوں کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ متاخرین کی سخت غلطی جس سے ان کی شاعری بالکل برباد ہو گئی۔ یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخئیل سے کام لیتے ہیں۔

مدحیہ شاعری محاکات میں داخل ہے۔ یعنی کسی شخص کی مدح کی جائے تو اس کے واقعی اوصاف بیان کرنے چاہئیں جس سے اس شخص کی عزت اور عظمت دلوں میں پیدا ہو۔ لیکن اکثر شعرا مدح میں تخئیل سے کام لیتے ہیں اور اس قسم کے خیالی مضامین پیدا کرتے ہیں جن کو محاکات اور اصلیت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔

تشبیہ اور استعارہ

تشبیہ اور استعارہ۔ یہ چیزیں شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط و خال ہیں۔ جن کے بغیر انشاپردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک عالی سے عالی مرتبہ شخص بھی جب جوش یا غیظ و غضب میں لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے استعارات کا قالب بدل کر نکلتا ہے۔ غم اور رنج کی حالت میں انشاپردازی اور تکلف کا کس کو خیال ہو سکتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی بے اختیار استعارات زبان سے

ادا ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کا عزیز مر جاتا ہے تو کہتا ہے "سینہ پھٹ گیا"، "دل میں چھید پڑ گئے"، "آسمان ٹوٹ پڑا"، "تجھ کو کس کی نظر کھا گئی" یہ سب استعارے ہیں۔ اس سے ظاہر ہو گا کہ استعارہ دراصل فطری طرز ادا ہے۔ لوگوں نے بے اعتدالی سے تکلف کی حد تک پہنچا دیا۔ اس بنا پر ہم تشبیہ اور استعارے کی بحث تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہو کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ کہاں اور کیونکر کام کرتے ہیں۔ ان میں ندرت اور لطافت کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ کس طرح ایک بڑے سے بڑا وسیع خیال ان کے ذریعے سے ایک لفظ میں ادا ہو جاتا ہے۔

اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص نہایت شجاع و بہادر ہے تو اگر انھیں لفظوں میں اس مضمون کو ادا کریں تو یہ معمولی طریقۂ ادا ہے۔ اسی بات کو اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر کے مثل ہے" تو یہ تشبیہ ہو گی۔ اور معمولی طریقے کی بہ نسبت کچھ زیادہ زور پیدا ہو جائے گا۔ اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر ہے" تو زور اور بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر اس شخص کا مطلق ذکر نہ کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ میں نے ایک شیر دیکھا اور اس سے مراد وہی شخص ہو تو استعارہ ہے۔ اس مطلب کے ادا کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ شیر کا نام بھی نہ لیا جائے بلکہ شیر کے جو خصائص ہیں اس شخص کی نسبت استعمال کئے جائیں۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پڑ گئی۔ (ڈکارنا خاص شیر کی آواز کو کہتے ہیں) یہ بھی استعارہ ہے۔ اور پہلے طریقے کے بہ نسبت زیادہ لطیف ہے۔

۱۔ اکثر موقعوں پر تشبیہ یا استعارے سے کام میں جو وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے وہ اور کسی طریقے سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ مثلاً اگر اس مضمون کو کہ فلاں موقع پر نہایت کثرت سے آدمی تھے۔ یوں کہا جائے کہ "وہاں آدمیوں کا جنگل تھا"، تو کلام کا زور بڑھ جائے گا۔ یہاں کلام کا اصلی مقصد آدمیوں کی کثرت کا بیان کرنا ہے۔

جنگل کی تشبیہ کی وجہ سے کثرت کا خیال متعدد وجہوں سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ جنگل کی زمین میں قوت نامیہ بہت ہوتی ہے اس لئے اس میں گھانس، پودے، اور درخت کثرت سے پاس پاس اُگتے ہیں۔ اس کے ساتھ نُمو کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز جہاں کثرت سے پیدا ہوتی ہے بے قدر ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر جنگل میں درخت اور گھانس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ مثال مذکورہ میں تشبیہ نے یہ تمام باتیں پیش نظر کر دیں۔ یعنی آدمی اس کثرت سے تھے جس طرح جنگل میں گھانس ہوتی ہے۔ آدمیوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا بلکہ بھیڑ بڑھتی جاتی تھی۔ ایک جاتا تھا تو دس آ جاتے تھے۔ کثرت کی وجہ سے آدمیوں کی کچھ قدر نہ تھی۔ یہ تمام باتیں جن کی وجہ سے کثرت کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی۔ ایک جنگل کے لفظ میں مضمر ہیں۔ اور چونکہ یہ تمام باتیں صرف ایک لفظ نے ادا کر دیں اس لئے خود بخود کلام میں زور آ گیا۔

۲۔ بعض موقعوں پر جب شاعر کوئی غیر معمولی دعویٰ کرتا ہے تو اس کے ممکن الوقوع ثابت کرنے کے لئے تشبیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

مثالیہ شاعری جس نے متاخرین کے زمانے میں نہایت وسعت اختیار کی تشبیہ و تمثیل ہی پر مبنی ہے۔

۳۔ جب کسی نہایت نازک اور لطیف چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو الفاظ اور عبارت کام نہیں دیتی۔ اور یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نے اگر ان کو چھوا تو ان کو صدمہ پہنچ جائے گا جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر کو تشبیہ سے کام لینا پڑتا ہے وہ اسی قسم کی لطیف اور نازک صورت کو ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے اور پیش نظر کر دیتا ہے تشبیہ ایک ایسی عام چیز ہے کہ ہر شخص اس سے کام لیتا ہے۔ اس لئے جب تک تشبیہ میں کوئی ندرت اور خاص خوبی نہ ہو وہ کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ تشبیہ میں جن جن اسباب سے خوبیاں پیدا ہوتی ہیں اگرچہ ان کا احصا نہیں ہو سکتا تاہم چند صورتیں مثال

کے طور پر ہم لکھتے ہیں۔ جن سے ایک عام خیال قائم ہو سکے گا۔

۱۔ ہر تشبیہ ابتدا میں نادر اور پُر لطف ہوتی ہے۔ لیکن بار بار کے استعمال سے اس کی تازگی اور ندرت جاتی رہتی اور بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس لئے شاعر کا فرض یہ ہے کہ نادر اور جدید تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈ کر پیدا کرے۔ بڑے بڑے شعرا کا معیار کمال یہی ہے کہ ان کے کلام میں اچھوتی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے پائے جاتے ہیں۔

۲۔ تشبیہ مرکب۔ عموماً زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ مرکب سے یہ مراد ہے کہ کئی چیزوں کے ملنے سے جو مجموعی حالت پیدا ہوتی ہے وہ تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کی جائے۔ مثلاً۔

باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد	ہوا نے لالے کا پیالہ اٹھا کر زمین پر ٹپک دیا
گل بہ خندہ گفت آرے ایں چنیں باید ہمی	پھول نے ہنس کر کہا خوب یہی کرنا چاہئے

ہوا جب تیز چلتی ہے تو نازک ٹہنیاں اور پھول زمین پر گر پڑتے ہیں اس حالت کو یوں ادا کیا ہے کہ گویا ہوا نے لالے کا پیالہ اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔

جدت و لطف ادا

شاعری کے لئے یہ سب سے مقدم چیز ہے۔ بلکہ بعض اہل فن کے نزدیک **جدت ادا** ہی کا نام شاعری ہے۔ ایک بات سیدھی طرح سے کہی جائے تو ایک معمولی بات ہے۔ اسی کو اگر جدید انداز اور نئے اسلوب سے ادا کر دیا جائے تو یہ شاعری ہے۔

ایک دفعہ حجاج نے ایک بدو سے پوچھا کہ تم سے کوئی راز کی بات کہی جائے تو تم اس کو چھپا سکتے ہو یا نہیں۔ اس نے کہا کہ "میرا سینہ راز کا مدفن ہے" یعنی راز سینے میں مر کر رہ جاتا ہے۔ سینے سے نکل کیونکر سکتا ہے۔ اس بات کو وہ اگر یوں ادا کرتا کہ "میں راز کو کسی حالت میں کبھی ظاہر نہیں کرتا"، تو معمولی بات ہوتی۔ لیکن طرز ادا کے بدل دینے نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا۔ اور اب وہی بات شعر بن گئی۔ شاعری

انشاپردازی۔ بلاغت۔ ان تمام چیزوں کی جادوگری اسی جدّت ادا پر موقوف ہے۔
جدت ادا کی منطقی تعریف اور اس کے اصول اور قواعد کا انضباط سخت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ وہ ایک ذوقی چیز ہے جس کا صحیح ادراک صرف ذوق صحیح سے ہو سکتا ہے۔ اس کا پیرایہ ہر جگہ الگ ہے اور اس قدر غیر محصور ہے کہ نہ ان سب کا شمار ہو سکتا ہے نہ ان میں کوئی خاص قدر مشترک پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے جدت ادا کے مفہوم کے ذہن نشین کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ متعدد مثالیں پیش کر کے بتایا جائے کہ اصل خیال کیا تھا۔ اس کو کس جدید انداز سے ادا کیا گیا۔ اور جدت نے کیا اثر پیدا کیا۔ مثلاً۔

زخم ہا برداشتیم و فتح ہا کردیم لیک	ہم نے بہت زخم کھائے اور فتحیں کیں لیکن
ہرگز از خونِ کسے رنگیں نشد دامانِ ما	کسی کے خون سے ہمارا دامن رنگین نہ ہوا

اصل خیال یہ تھا کہ "ہم کو حریفان فن سے مقابلے کا اکثر اتفاق ہوا۔ لوگوں نے ہم کو بُرا بھلا کہا۔ بد زبانیاں کیں۔ لیکن ہم نے صبر و سکوت سے کام لیا۔ رفتہ رفتہ ہمارے علم و فضل کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھتا گیا۔ یہاں تک کہ حریف بھی قائل ہو گئے۔ اور سب نے ہماری عظمت تسلیم کر لی" اس خیال کو یوں ادا کیا ہے کہ میدان جنگ میں ہم نے زخم اٹھا کر فتحیں حاصل کیں۔ لیکن ہمارا دامن کسی کے خون سے رنگین نہیں ہوا۔ اس طرز ادا میں علاوہ اس کے کہ تشبیہ میں ندرت ہے یہ تعجب انگیز بات ثابت کی ہے کہ میدانِ جنگ میں کوئی زخمی نہیں ہوا۔ اور معرکہ فتح ہو گیا۔

حُسنِ الفاظ یہ ایک نہایت ضروری بحث ہے۔ اس لئے ہم اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔ کتاب العمدۃ میں باب فی اللفظ والمعنیٰ ایک خاص عنوان قائم کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے۔ دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط۔ کہ وہ کمزور

ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگی۔ پس اگر معنیٰ میں نقص نہ ہو اور لفظ میں ہو تو شعر میں عیب سمجھا جائے گا
جس طرح لنگڑے یا لنجے میں روح موجود ہوتی ہے لیکن بدن میں عیب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر لفظ
اچھے ہوں لیکن مضمون اچھا نہ ہو تب بھی شعر خراب ہوگا۔ اور مضمون کی خرابی الفاظ پر اثر کرے گی۔
اگر مضمون بالکل لغو ہو الفاظ اچھے ہوں تو الفاظ بھی بیکار ہوں گے۔ جس طرح مردے کا جسم
کہ یوں دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح مضمون گو اچھا ہو
لیکن الفاظ اگر بُرے ہیں تب بھی شعر بیکار ہوگا۔ کیونکہ روح بغیر جسم کے پائی نہیں جا سکتی۔

اہلِ فن کے دو گروہ بن گئے ہیں۔ ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی تمام تر کوشش الفاظ کے حُسن و خوبی پر مبذول ہوتی ہے۔ عرب کا اصلی انداز یہی ہے۔ بعض لوگ مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اور الفاظ کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن زیادہ تر اہلِ فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن شاعر کا معیارِ کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اور بندش کیسی ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے۔ گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں۔ لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے۔ انھیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا ظہوری کا ساقی نامہ نازک خیالی۔ موشگافی۔ مضمون بندی کا طلسم ہے۔ لیکن سکندر نامہ کا ایک شعر پورے ساقی نامے پر بھاری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ساقی نامے میں الفاظ کی وہ متانت اور شان و شوکت اور بندش کی وہ پختگی نہیں جو سکندر نامے کا عام جوہر ہے۔ ذیل کے دونوں مصرعوں میں مضمون بلکہ بعض الفاظ تک مشترک ہیں۔ پھر بھی زمین و آسمان کا فرق ہے

ع تھا بلبلِ خوش گو کہ چہکتا ہے چمن میں
ع بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہیے اور

معنی سے بالکل بے پرواہ ہو جانا چاہئے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر نہ پیدا ہو سکے گی۔ اس لئے شاعر کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ جو مضمون اس کے خیال میں آیا ہے اُسی درجے کے الفاظ اس کو میسر آسکیں گے یا نہیں۔ اگر نہ آسکیں تو اس کو بلند مضامین چھوڑ کر انھیں سادہ اور معمولی مضامین پر قناعت کرنی چاہئے جو اس کے بس کے ہیں۔ اور جن کو وہ عمدہ پیرائے اور عمدہ الفاظ میں ادا کر سکتا ہے۔

الفاظ کے انواع اور ان کے مختلف اثر

اس امر کے ثابت کرنے کے بعد کہ شاعری کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے۔ ہم کو کسی قدر تفصیل سے بتانا چاہئے کہ الفاظ کے کیا انواع ہیں۔ اور ہر نوع کا کیا خاص اثر ہے۔ اور کون الفاظ کہاں کام آتے ہیں۔

الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض نازک۔ لطیف۔ شستہ صاف۔ رواں اور شیریں۔ اور بعض پُرشوکت۔ متین۔ بلند۔ پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین کے ادا کرنے کے لئے موزوں ہیں۔ عشق و محبت انسان کے لطیف اور نازک جذبات ہیں۔ اس لئے ان کے ادا کرنے کے لئے لفظ بھی اسی قسم کے ہونے چاہئیں۔ یہی بات ہے کہ قدما کی بہ نسبت متاخرین کی غزل اچھی ہوتی ہے۔

بلند اور پُرشوکت الفاظ رزمیہ مضامین اور قصائد وغیرہ کے لئے موزوں ہیں۔ قدما کے زمانے تک فوجی تمدن باقی تھا اس لئے اس کا اثر تمام چیزوں میں پایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ الفاظ بھی بلند متین۔ پُرزور ہوتے تھے۔ متاخرین کی نسبت یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قصیدہ اچھا نہیں کہتے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان کے زمانے میں تمدن اور معاشرت میں نہایت نزاکت پرستی آگئی تھی۔ اور عشقیہ جذبات عام ہو گئے تھے۔ اس کا اثر زبان پر بھی پڑا۔ یعنی زبان زیادہ نازک اور لطیف ہو گئی جو غزل گوئی کیلئے موزوں تھی۔ قصائد کی دھوم دھام اور شان و شوکت کے قابل نہ تھی۔

قصیدہ کے علاوہ مثنوی میں بھی اس قسم کی زبان پسندیدہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ متاخرین مثنوی اچھی نہیں لکھ سکتے۔ ان کی زبان بالکل غزل کی زبان بن گئی ہے۔ اس لئے جو کچھ کہتے ہیں غزل بن جاتی ہے۔ البتہ عشقی مثنویاں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی ان میں وہی غزل کی زبان استعمال کرنی چاہیے

یہ تمام تر بحث الفاظ کی انفرادی حیثیت سے تھی۔ لیکن اس سے زیادہ مقدم الفاظ کا باہمی تعلق اور تناسب ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شعر میں جس قدر لفظ آئیں الگ دیکھا جائے تو سب موزوں اور فصیح ہوں۔ لیکن ترکیبی حیثیت سے ناہمواری پیدا نہ ہو جائے اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ جو الفاظ ایک ساتھ کسی کلام میں آئیں ان میں باہم ایسا توافق تناسب۔ موزونی۔ اور ہم آوازی ہو کہ سب مل کر گویا ایک لفظ یا ایک جسم کے اعضا بن جائیں۔ یہی بات ہے جس کی وجہ سے شعر میں سلاست۔ صفائی اور روانی ہوا کرتی ہے۔ یہی وصف ہے جس کی وجہ سے شعر میں موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شاعری اور موسیقی کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔

معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اثر

یہاں تک الفاظ کے نسبت جو بحث تھی وہ زیادہ تر لفظ کی حیثیت یعنی آواز۔ اور صورت اور لہجے کے لحاظ سے تھی۔ لیکن شاعری کا اصلی مدار الفاظ کی معنوی حالت پر ہے۔ یعنی معنی کے لحاظ سے الفاظ کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے ان میں کیونکر اختلاف مراتب ہوتا ہے۔

ہر زبان میں مرادف الفاظ ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن جب غور سے دیکھا جائے تو ان الفاظ میں بھی باہم فرق ہوتا ہے۔ یعنی ہر لفظ کے مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ مثلاً خدا کو فارسی میں خدا۔ پروردگار۔ داور۔ دادار۔ ایزد۔ آفریدگار سب کہتے ہیں۔ بظاہر ان سب الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن درحقیقت ہر لفظ میں ایک خاص بات اور خاص اثر ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے شاعر کی نکتہ دانی یہ ہے کہ جس

مضمون کے ادا کرنے کے لئے خاص جو لفظ موزوں اور مؤثر ہے وہی استعمال کیا جائے ورنہ شعر میں وہ اثر نہ پیدا ہوگا۔ یہ ایک دقیق نکتہ ہے۔ ذوق کے پیدا ہونے کے بعد آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

فصیح اور مانوس الفاظ کا انتخاب

شاعر کے لئے نہایت ضرور ہے کہ فصیح اور مانوس الفاظ کا تفحص کرے اور کوشش کرے کہ کوئی لفظ فصاحت کے خلاف نہ آنے پائے فصاحت کی تعریف اگرچہ اہل فن نے منطقی طور پر جنس و فصل کے ذریعے سے کی ہے۔ یعنی حرفوں میں تنافر نہ ہو۔ لفظ نادر الاستعمال نہ ہو۔ قیاس لغوی کے مخالف نہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فصاحت کا معیار صرف ذوق اور وجدان صحیح ہے۔ ممکن ہے کہ ایک لفظ میں تنافر حروف ندرت استعمال۔ مخالفت قیاس۔ کچھ نہ ہو۔ باوجود اس کے وہ فصیح نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک لفظ بالکل نادر الاستعمال ہو اور پھر فصیح ہو۔ غیر زبان کے الفاظ جو کبھی ہم نے استعمال نہیں کئے تھے بلکہ ہمارے کانوں میں بھی نہیں پڑے تھے اوّل اوّل جب ہم سنتے ہیں تو ان میں سے بعض ہم کو فصیح معلوم ہوتے ہیں اور بعض نا مانوس اور مکروہ۔ حالانکہ ندرت استعمال میں دونوں برابر ہیں۔

ایک نکتہ خاص طور پر یہاں لحاظ رکھنے کے قابل ہے۔ اکثر الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں ثقل ہوتا ہے۔ لیکن ابتدائی زمانے میں جب لوگوں کا احساس نازک نہیں ہوتا تو ان کا ثقل محسوس نہیں ہوتا۔ کثرت استعمال اس ثقل کو اور کم کر دیتی ہے۔ لیکن بالآخر جب احساس نازک ہو جاتا ہے تو وہ الفاظ صاف کھٹکنے لگتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ متروک ہو جاتے ہیں۔ لیکن نکتہ داں اور لطیف المذاق شاعر فتوی عام سے پہلے اس قسم کے الفاظ ترک دیتا ہے۔ اور اس کا چھوڑ نا گویا ان الفاظ کے متروک کرنے کا اعلان ہوتا ہے۔ یہی شعرا ہیں جن کی شاعری زبان کا آئین اور قانون بن جاتی ہے۔ اس کی مثال اردو میں شیخ امام بخش ناسخ ہیں۔ بہت سے بد مزہ اور ناگوار الفاظ مثلاً آئے ہے جائے ہے

کھوئے ہے۔ یا اردو الفاظ کی فارسی جمعیں مثلاً خوباں وغیرہ وغیرہ الفاظ ناسخ کے زمانے میں عموماً مروج تھے۔ اور تمام شعرائے دہلی اور لکھنؤ ان کو برتتے تھے لیکن ناسخ کے مذاق صحیح نے برسوں کے بعد آنے والی حالت کا پہلے اندازہ کر لیا۔ اور یہ تمام الفاظ ترک کر دئے جو بالآخر دلی والوں کو بھی ترک کرنے پڑے۔

غرض یہ ہے کہ شاعر جس طرح مضامین کی جستجو میں رہتا ہے اس کو ہر وقت الفاظ کی جانچ پر تال اور ناپ تول میں بھی مصروف رہنا چاہئے۔ اس کو نہایت دقت نظر سے دیکھنا چاہئے کہ کون سے الفاظ میں وہ مخفی اور دور از نگاہ ناگواری موجود ہے جو آیندہ چل کر سب کو محسوس ہونے لگے گی۔

یہ بات بھی بتا دینے کے قابل ہے کہ بعض الفاظ گو فی نفسہ ثقیل ہوتے ہیں لیکن گرد و پیش کے الفاظ کا تناسب ان کے ثقل کو مٹا دیتا ہے یا کم کر دیتا ہے۔ اس لئے شاعر کو مجموعی حالت پر نظر رکھنی چاہئے۔ اگر معنی کے لحاظ سے اسم قسم کا لفظ اس کو کسی موقع پر مجبوراً استعمال کرنا ہے تو کوشش کرنی چاہئے کہ ایسے موقع پر اس کے لئے جگہ ڈھونڈھے کہ عیب جاتا رہے یا کم ہو جائے۔

سادگی ادا | سادگی ادا کے یہ معنی ہیں کہ جو مضمون شعر میں ادا کیا گیا ہے بے تکلف سمجھ میں آجائے۔ یہ بات اسباب ذیل سے حاصل ہوتی ہے۔

۱۔ جملوں کے اجزا کی وہ ترتیب قائم رکھی جائے جو عموماً اصلی حالت میں ہوتی ہے۔ وزن اور بحر و قافیہ کی ضرورت سے اجزائے کلام اپنی اپنی مقررہ جگہ سے زیادہ نہ ہٹنے پائیں۔

۲۔ مضمون کے جس قدر اجزا ہیں ان کا کوئی جزو رہ نہ جائے جس کی وجہ سے یہ معلوم ہو کر بیچ میں خلو رہ گیا ہے۔ جس طرح زینے سے کوئی پایہ الگ کر لیا جاتا ہے۔ اکثر اشعار میں جو تعقید اور پیچیدگی رہ جاتی ہے اس کی یہی وجہ ہوتی ہے کہ مضمون کا کوئی

ضروری جزو چھوٹ جاتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اکثر موقعوں پر بعض اجزائے مضامین کا چھوڑ دینا خاص لطف پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والوں کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ شعر۔

سخت شرمائے میں اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں ۔۔۔ چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بیجا کرنا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں معشوق کو بھولا بھالا سمجھتا تھا اس لئے میں نے اس کو چھیڑنا چاہا تو سچی شکایتیں کیں کہ وہ اس سے ناراض یا شرمندہ نہ ہوگا۔ لیکن وہ سمجھ گیا اور بہت شرمایا۔ اب مجھ کو افسوس ہے کہ فقط چھیڑنا مقصود تھا اس لئے جھوٹی شکایت کرنی چاہئے تھی کہ وہ شرمندہ بھی نہ ہوتا اور چھیڑ چھاڑ کا لطف بھی قائم رہتا۔ اس مضمون سے یہ حصے کہ میں نے "ان کو چھیڑا" "اور سچی شکایتیں کیں" چھوڑ دئے گئے ہیں۔ لیکن مضمون کے بقیہ حصے ان کو پورا کر دیتے ہیں۔ یہ شاعری کا ایک خاص نازک پہلو ہے۔ اور مرزا غالب کا یہ خاص انداز ہے۔

۳۔ استعارے اور تشبیہیں دور از فہم نہ ہوں۔ اس کی تفصیل استعارے اور تشبیہ کی بحث میں آئے گی۔

۴۔ اکثر اشعار میں قصہ طلب حوالے ہوتے ہیں اور ان پر اکثر شاعرانہ مضامین کی بنیاد قائم ہوتی ہے ان کو **تلمیحات** کہتے ہیں۔ تلمیحات ایسی نہیں ہونی چاہئیں جو کسی کو معلوم نہ ہوں۔

۵۔ سادگی ادا میں اس بات کو دخل ہے کہ روزمرّہ اور بول چال کا زیادہ لحاظ رکھا جائے۔ روزمرّہ چونکہ عام زبانوں پر چڑھا ہوا ہوتا ہے اس لئے ایک لفظ ادا ہوتے کے ساتھ فوراً پورا جملہ ذہن میں آجاتا ہے۔ اور اس کے سہارے سے مشکل سے مشکل مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑے نامور شعرا کا اصلی کمال یہی ہے کہ

اعلیٰ سے اعلیٰ خیال روزمرہ اور بول چال میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ گویا معمولی بات ہے۔ مثلاً حضرات صوفیہ کے ہاں منازل سلوک میں بعض مرحلے مثلاً توکل۔ رضا۔ ترک خودی بہت دشوار گذار ہیں۔ داغ نے اس مسئلے کو کس سادگی سے ادا کیا ہے۔

رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

سادگی یہ ہے کہ عام و خاص دونوں بے تکلف سمجھ سکیں۔ فرق یہ ہوگا کہ عام آدمی شعر کا ظاہری اور سرسری مطلب سمجھ لیں گے۔ لیکن خواص کی نظر اس کے نکات۔ لطائف اور دقائق تک پہنچے گی۔ اور ان پر شعر کا اثر عوام سے زیادہ ہوگا۔

شاعری کی بڑی خوبی جدت ادا ہے۔ جدت ادا میں بات کو خواہ کسی قدر معمولی پیرائے سے بدل کر اور اصلی راستے سے ہٹ کر بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے شاعر کو اس موقع پر سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں سادگی ادا کو قائم رکھنا گویا اجتماع النقیضین ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں شاعری کے کمال کا یہی موقع ہے۔ اس کی یہ صورت ہے کہ جدّت کے سوا سادگی کی اور تمام باتیں موجود ہوں۔ یعنی الفاظ سہل ہوں۔ تشبیہات قریب الفہم ہوں۔ ترکیب میں پیچیدگی نہ ہو۔ روزمرّہ اور محاورہ موجود ہو۔ ان سب باتوں کے ساتھ جدت ادا میں اعتدال سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اس صورت میں جدت کی وجہ سے سادگی میں کسی قدر فرق پیدا ہوگا تو اور باتیں اس کی تلافی کر دیں گی۔

جملوں کے اجزا کی ترکیب

یہ شعر کی خوبی کا بڑا ضروری جزو ہے۔ ہر زبان میں تقدم و تاخر کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے کہ اس سے تجاوز جائز نہیں۔ جب اسی ترتیب سے یہ اجزا کلام میں آتے ہیں تو مضمون بے تکلف سمجھ میں آ جاتا ہے۔ جب یہ اجزا اپنی اصلی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں تو مطلب میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جس قدر یہ تبدیلی زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر کلام پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔ لیکن شعر میں وزن

اور بحر اور قافیے کی ضرورت سے اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی تاہم شاعر کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ گل کے پرزوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھے۔ اور کم سے کم یہ کہ زیادہ نہ ہٹ جانے پائیں۔ جس قدر یہ وصف شاعر کے کلام میں زیادہ ہوگا اسی قدر شعر میں زیادہ روانی اور سلاست ہوگی یہی وصف ہے جس نے سعدی کے کلام کو تمام تر شعرا سے ممتاز کردیا ہے۔ ان کے متعدد اشعار ایسے ہیں کہ ان کو نثر کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ان میں جملے کے اجزا کی وہی ترتیب ہے جو نثر میں ہو سکتی ہے۔ اور ایسے تو بہت ہیں جن کی نظم و نثر میں خفیف سا فرق ہے۔

واقعیت فن ادب کا یہ ایک معرکۃ الآرا اور مغالطہ انگیز مسئلہ ہے۔ ایک فریق کا خیال ہے کہ واقعیت شعر کی ضروری شرط ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ محاسن شعری میں مبالغہ بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مبالغہ اور واقعیت متناقض چیزیں ہیں۔ یہ مسئلہ مدت سے زیر بحث ہے۔ اور فیصلہ اس لئے نہیں ہوتا کہ ہر فریق صرف اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔ اور مخالف کا استدلال دھندلا کرکے دکھاتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دونوں طرف کے دلائل پورے زور کے ساتھ بیان کرکے انصافاً فیصلہ کیا جائے

مبالغے کا طرفدار کہتا ہے کہ ائمہ شعر نے تصریح کی ہے کہ کذب اور مبالغہ شاعری کا زیور ہے۔ تمام بڑے بڑے شعرا جن کی شاعری مسلمۂ عام ہے ان کے کلام میں عموماً مبالغہ اور غلو موجود ہے۔ اس کے علاوہ اکثر وہی اشعار کارنامۂ شاعری خیال کئے جاتے ہیں جن میں کذب اور مبالغہ ہے۔ لیکن زیادہ تر آئمہ فن اس کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مبالغے کے جس قدر اشعار مقبول ہیں ان میں مبالغے کے سوا اور خوبیاں ہیں اور دراصل یہ انھیں کا اثر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر کی دو قسمیں ہیں۔ تخئیلی۔ غیر تخئیلی۔ تخئیل میں واقعے سے غرض نہیں ہوتی۔ بلکہ زیادہ تر یہ مطمح نظر ہوتا ہے کہ قوت تخئیل کس قدر پُر زور اور وسیع ہے۔

اس بناپر اس قسم کی شاعری میں مبالغے سے کام لیا جائے تو بدنما نہیں۔ لیکن وہاں بھی سامعین کی طبیعت پر استعجاب کا جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ مبالغے کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت تخیل کی بناپر ہوتا ہے۔ لیکن اور اقسام شاعری مثلاً فلسفیانہ۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ عشقیہ۔ نیچرل ان میں مبالغہ بالکل لغو چیز ہے۔ اس لئے اگر شعر میں مبالغہ جائز بھی ہو تو صرف شعر کی ایک خاص نوع (تخیل) میں ہوگا۔ اس سے عام خوبی ثابت نہیں ہوئی۔

شاعری سے اگر صرف تفریح خاطر مقصود ہو تو مبالغہ کام آسکتا ہے۔ لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے جو قوموں کو زبروزبر کر سکتی ہے۔ جو ملک میں ہل چل ڈال سکتی ہے۔ جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے۔ جس سے نوحہ کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ وہ واقعیت اور اصلیت سے خالی ہو تو کچھ کام نہیں کر سکتی۔

یہ ضرور نہیں کہ شعر میں جو کچھ کہا جائے وہ سرتاپا واقعیت ہو۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ اصلیت کے اثر سے خالی نہ ہو۔ مثلاً ایک واقعہ واقع میں نہیں ہوا۔ لیکن شاعر کو اس کا پورا یقین ہے۔ یہ واقعہ شعر میں ادا ہوگا تو اثر سے خالی نہ ہوگا۔ میر انیس کہتے ہیں۔

حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

اس شعر میں بظاہر مبالغہ ہے۔ کسی انسان کے حملے سے زمین اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتی۔ لیکن جب یہ تصور کیا جائے کہ یہ کلام کس کی زبان سے نکلا ہے تو کلام میں واقعیت کا اثر آجاتا ہے۔ اور پھر مبالغہ مبالغہ نہیں رہتا۔

شعر کیوں اثر کرتا ہے

یہ امر بدیہی ہے کہ شعر ایک مؤثر چیز ہے۔ لیکن یہ بحث طلب ہے کہ اس اثر کا اصلی سبب کیا ہے۔ ارسطو نے کتاب الشعر میں اس کی وجہ لکھی ہے اس کا حاصل یہ ہے۔

"انسان میں نقالی اور محاکات کا فطری مادہ ہے۔ جانور میں یا تو یہ مادہ مطلق نہیں ہوتا۔ یا ہوتا ہے تو کم ہوتا ہے۔ مثلاً طوطی صرف آواز کی نقالی کر سکتا ہے۔ حرکات سکنات کی نقل نہیں

کر سکتا۔ بندر حرکات سکنات کی نقل اتارتا ہے لیکن آواز سے کام نہیں لے سکتا۔ بخلاف اس کے انسان آواز سے۔ اشارے سے۔ حرکات سے۔ سکنات سے۔ اور مختلف طریقوں سے ہر چیز کی نقل اتار سکتا ہے" یہی انسان کی فطرت ہے کہ اس کو **محاکات** سے ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ فرض کرو اگر ایک بدصورت جانور کی ہو بہو تصویر کھینچی جائے تو ہر شخص کو لطف آئے گا۔ حالانکہ خود اس جانور کے دیکھنے سے طبیعت مکدر ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شے کی محاکات خود لطف انگیز ہے۔ فی نفسہ وہ شے بری ہو یا بھلی۔ اور چونکہ شعر بھی ایک قسم کی نقالی اور مصوری ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ اس سے طبیعت پر اثر پڑتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ موسیقی اور راگ بالطبع مؤثر چیز ہے اور شعر میں موسیقی کا جزر شامل ہے اس لئے جس شعر میں زیادہ موسیقیت ہوتی ہے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

ارسطو نے جو وجوہ بیان کئے گو بجائے خود صحیح ہیں لیکن شعر کی تاثیر انھی باتوں پر موقوف نہیں۔ شعر میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس مضمون کے دل نشیں ہونے کے لئے پہلے یہ نکتہ سمجھنا چاہئے کہ انسانی معاشرت کی کل فلسفہ اور سائینس سے نہیں۔ بلکہ جذبات سے چل رہی ہے۔ جو عقل کی حکومت سے قریباً آزاد ہے۔

شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے اس لئے تاثیر اس کا عنصر ہے۔ شاعری ہر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اس لئے رنج۔ خوشی۔ جوش۔ استعجاب حیرت میں جو اثر ہے شعر میں بھی وہی اثر ہوتا ہے۔ مصورانہ شاعری اس لئے دل پر اثر کرتی ہے کہ جو مناظر اثر انگیز ہیں شاعری اس کو پیش نظر کر دیتی ہے۔

بادِ سحر کے جھونکے۔ آب رواں کی رفتار۔ پھولوں کی شگفتگی۔ غنچوں کا تبسم۔ سبزے کی لہلہاہٹ۔ خوشبوؤں کی لپٹ۔ بادل کی پھُوار۔ بجلی کی چمک۔ یہ منظر آنکھ کے سامنے ہو تو دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ شاعری ان مناظر کو بعینہٖ پیش کر دیتی ہے اس لئے اس کی تاثیر سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے؟۔

(مولوی شبلی نعمانی۔ از شعر العجم جلد چہارم)

مولانا عبدالحلیم شرر عباسی

سنہ۱۸۶۰ء میں آپ شہر لکھنؤ محلہ جھوائی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ ۵ برس کی عمر میں آپ کی بسم اللہ ہوئی۔ آپ کے والد ماجد حکیم تفضل حسین صاحب عربی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فارسی کے یکتائے عصر تھے واجد علی شاہ کے ملازم تھے۔ کلکتے میں رہتے تھے۔ آٹھ برس کی عمر میں آپ کو اپنے ہمراہ کلکتے لے گئے۔ وہاں حافظ الٰہی بخش صاحب سے قرآن مجید ختم کیا۔ اور اپنے والد سے ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ شاہزادۂ مرزا جہاں قدر بہادر کے اُستاد مُلّا باقر سے صرف نحو پڑھی۔ اور مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی سے معقولات اور فلسفہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور اسی زمانے میں مولوی محمد حیدر صاحب سے انگریزی شروع کی۔ اور ادب عربی کی بھی چند کتابیں پڑھیں۔ اسی کے قریب زمانے میں حکیم محمد مسیح صاحب سے طب پڑھی اور چندے مطب بھی کیا۔ کلکتے میں قیام کے زمانے میں سال دو سال کے بعد آپ لکھنؤ آتے۔ اور پانچ چھ مہینے قیام کر کے چلے جاتے۔ علم کا شوق بیکار نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ لکھنؤ میں آپ نے مولوی محمد یحییٰ صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب سے متوسطات معقول تمام کیں۔ سنہ۱۸۷۷ء میں آپ کے والد نے آپ کو لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں آکر آپ نے آفتاب ہند جناب مولانا عبدالحیٰ صاحب مرحوم نور اللہ مرقدہٗ سے سب کتب درسیہ تمام کیں۔ اور مشہور ادیب جناب مفتی میر عباس صاحب سے عربی علم ادب کی تعلیم پائی۔ سنہ۱۸۷۹ء میں علم حدیث کا شوق آپ کو دہلی لے گیا۔ مشہور محدث جناب مولوی نذیر حسین صاحب سے صحاح ستہ اور موطا امام مالک اور تفسیر جلالین ختم کر کے لکھنؤ واپس آئے۔ نظم میں آپ کو مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی سے تلمذ حاصل ہے۔ جو اُس زمانے کے مشہور ناظم و نثار تھے۔ حیدر آباد میں قیام فرماتے تھے اور برکات دولت آصفیہ سے مالامال تھے

سنہ۱۸۸۱ء میں آپ اودھ اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ آپ نے نکالا جس میں بہت نازک۔ رنگین۔ شاعرانہ مذاق کے مضامین نکلتے رہے۔ اودھ اخبار کی اڈیٹری ترک کرنے کے بعد آپ نے ایک دلچسپ ناول لکھا جس کو بہت مقبولیت ہوئی۔

جنوری سنہ۱۸۸۷ء میں آپ نے دلگداز جاری کیا۔ جو اپنے رنگ کا بے نظیر پرچہ ہے

سنہ۱۸۹۱ء میں آپ حیدر آباد تشریف لے گئے۔ نواب وقار الامرا بہادر معین المہام مال نے اپنے خزانۂ پائیگاہ سے دو سَو روپیہ ماہوار آپ کی تنخواہ مقرر فرمائی۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں آپ نے تاریخ سندھ لکھی۔ جس کے مسودے کو دیکھ کر نواب وقار الامرا بہادر نے پانچ ہزار

روپے انعام کے طور پر خزانہ ریاست سے دلوائے۔

۱۸۹۳ء میں آپ نواب وقارالامرا بہادر کے صاحبزادے نواب ولی الدین خاں بہادر کے ہمراہ انگلستان تشریف لے گئے۔ انگلستان میں ۱ سال رہے۔ اور وہیں فرانسیسی زبان سیکھی۔ اور اتنا درک حاصل کر لیا کہ فرنچ زبان کی کتابوں کو سمجھ لیں۔ اور اس زبان کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر لیں۔ انگلستان سے واپسی کے ۶ ماہ بعد نواب وقارالامرا بہادر سے باضابطہ اجازت حاصل کر کے پھر لکھنؤ آئے۔ اور یہاں آکر برابر علمی خدمات میں مشغول رہے۔

۱۹۰۶ء میں آپ پھر حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہاں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہوئے

۱۹۰۹ء میں جناب مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم اور مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے کے ہمراہ آپ بھی اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس وقت سے برابر لکھنؤ میں قیام رہا۔ اور علمی مشاغل سے کوئی دم خالی نہیں رہا۔

نثر میں شاعرانہ خیالات کا اظہار کرنا۔ تاریخی اور عشقیہ ناولوں کو دلچسپ پیرائے میں ادا کرنا تاریخی حالات کو تحقیق سے لکھنا۔ قدرتی منظر۔ دلی جذبات کو ایسے طور پر لکھنا کہ پڑھنے والے کے دل پر اس کا سچا اثر قائم ہو جائے۔ آپ کا حصہ ہے۔ جس میں اس وقت کوئی آپ کی برابر نہیں کر سکتا۔ ناولوں کی بابت تو تمام ہندوستان نے مان لیا ہے کہ آپ سے بہتر کوئی لکھنے والا نہیں آپ کثیر التصانیف ہیں۔ آپ کی حسب ذیل چند تصانیف نہایت قابل قدر ہیں۔ تاریخ سندھ عصر قدیم۔ ماہ ملک۔ ایام عرب۔ فردوس بریں۔ رومتہ الکبریٰ وغیرہ

ایک چھوٹے ذرّے کی سرگذشت

میں اپنے تنگ و تاریک کلبۂ احزاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ دماغ شکستہ چھپر کے لوٹے پٹارے میں بند تھا۔ اور خیال فضائے عالم کے ناپیدا کنار میدان میں اُڑتا پھرتا تھا خیال کے راہوار پر سوار ہو کے میں نے گشت شروع کی تو کُرات فلکی کے پاس جا پہنچا۔ اور دیکھنے لگا کہ کتنے کتنے بڑے اور کیسے کیسے عظیم الشان کُرے کس سُرعت اور سبک روی کے ساتھ چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ اور کس طرح اپنی دُھن میں لگے ہوئے ہیں کہ ایک پل کیلئے بھی قرار نہیں لیتے۔ پھر ان کرات کی کثرت اور ان کے ہجوم و اژدحام پر نظر پڑی اور دل

حیرت زدہ گھبرا کے بول اٹھا کہ "میدان تخلیق انھیں لاکھوں۔ کروروں کُروں سے بھرا ہوا ہے جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک عالم ہے۔ اور ہم ان سب کی کُنہِ حقیقت ان کے حالات و اطوار۔ اور ان کے اغراض تخلیق سے کس قدر ناواقف ہیں۔

اپنا عجز۔ اور اپنی بے حقیقتی یاد آنا تھی کہ خیال سب طرف سے پھر پھرا کے اور کروروں پدموں میل کی مسافت طے کر کے پھر اپنے اسی کلبہ احزاں میں واپس آیا۔ اور اپنی حقیقت دریافت کرنے میں مشغول ہوا۔ مگر طلسم قدرت کے محافظ فرشتوں نے روکا اور ڈانٹ کے کہا "بس آگے قدم نہ بڑھانا۔ سب سے بڑا طلسم خود تیرا نفس ہے۔ جسے تو ہرگز نہیں سمجھ سکتا"۔ سیاح خیال اس قدرتی ڈانٹ پر سہما۔ اور ٹھٹک کے کھڑا ہو گیا۔ گھبرا کے بھاگنا چاہتا تھا کہ چھت میں ایک ننھا سا سوراخ نظر پڑا۔ جس میں سے شعاع آفتاب نے اندر آ کے زمین پر دھوپ کی ایک نورانی چتی بنا دی تھی۔ اس چتی سے چھت کے سوراخ تک نور کی ایک روشن سلاخ دکھائی دی جس میں لاکھوں ننھے ننھے ذرے اسی طرح کے اُڑتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے پھرتے تھے۔ جس طرح فضائے عالم کے زبردست اور عظیم الشان کُرے اُڑ رہے ہیں اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ تھی کہ جب ہم بھی دھوپ میں آ گئے تو یہ ذرّات نظر سے غائب ہو گئے جیسے کہ دن کو اجرام فلکی ہمارے سامنے سے غائب ہو جاتے ہیں اور جب ہم کلبۂ احزاں کی تیرگی میں جا بیٹھے تو وہ پھر چمک اٹھے جیسے کہ رات کو تارے جگمگا اٹھتے ہیں۔

ذرات کی اس نیرنگی اور ان کی چمک دمک نے دیر تک محوِ حیرت رکھا۔ پھر دل نے کہا "کیا عجب کہ ذرات ارضی کے اس عالم اصغر سے کرات سماوی کے عالم اکبر کا کچھ انکشاف ہو سکے"۔ اور فلسفیانہ غور و خوض کے لئے سر جھکانے کو تھا کہ ناگہاں انھیں ناچتے اور چمکتے ہوئے ذروں میں سے ایک نے آواز دی "تو اور ہماری حقیقت

پا سکے! انسان کی عقل ناقص اور یہ دعویٰ! یہ بے دست و پائی اور اس کے ساتھ یہ مجنونانہ حوصلہ! جا اپنا کام کر! اور قدرت نے جس کام میں لگا دیا ہے اسی میں لگا رہ! تو اس لئے نہیں پیدا ہوا ہے کہ ہمارے حرکات و سکنات کا تماشا دیکھے یا ہماری حقیقت معلوم کرے۔ اس بارگاہ قدرت کا تماشا دیکھنے والا کوئی اور ہی ہے۔ ہم اور سب ایکٹر ہیں۔ اور اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔" میں نے اسے گویا پا کے التجا کی کہ "اپنا کچھ حال تو بیان کر" برافروختہ ہو کے بولا "اپنا فرض منصبی ادا کرنے والوں کو داستان گوئی کی فرصت نہیں۔ یہ بے فکری و غفلت انسان ہی کو مبارک رہے۔ عالم تخلیق کے ہر ہر ذرے سے سبق لے کہ منشاء قدرت اور اغراض تخلیق پورے کرنے میں کس خموشی کے ساتھ مصروف ہے جسے دیکھے گا اس حالت میں پائے گا کہ خاموش ہے اور اپنا کام کر رہا ہے۔ مگر سب کے خلاف ایک تو ہے کہ اپنے کام سے غافل ہے اور فضول بک بک کر رہا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ اچھا یہی بتا کہ تو کہاں جا رہا ہے؟ اور کیوں جاتا ہے؟"

اس کا اس نے لاپرواہی سے یہ جواب دیا کہ "یہاں کام کی دھن میں کبھی ادھر توجہ ہی نہیں کی کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا کر رہے ہیں؟ کدھر جانا ہے اور کہاں جا کے دم لیں گے۔ جس کام میں اس خلاق مطلق نے لگا دیا ہے لگے ہوئے ہیں۔ جہاں لے جائے گا جائیں گے۔ اور جہاں پہنچائے گا پہنچ جائیں گے۔ ہم تو اپنے مالک کے بے عذر و بے زبان خدمتگار ہیں۔ تیری طرح ہمیں چناں چنیں۔ اور کیوں اور کس واسطے نہیں آتی۔

تب میں نے لاجواب ہو کے عاجزی سے کہا "اچھا اپنی آئندہ حالت اور اپنے اغراض اور ارادے نہیں بتاتا تو خدا کے لئے کچھ گذشتہ سرگذشت ہی بتا۔"

تنگ مزاجی سے بولا "یہ بھی کیسے یاد ہے؟ کبھی فرصت سے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ اپنی زندگی کے اگلے کارناموں پر غور کرتا۔ نہ یہاں کوئی دفتر ہے نہ کوئی تاریخ۔ لیکن خیر تو خدا کا واسطہ دلاتا ہے تو جو کچھ یاد آتا ہے بتائے دیتا ہوں" یہ کہہ کے اس نے اپنی سرگذشت

سُنانا شروع کی۔ اور بولا۔

"سن۔ جب صفحۂ دنیا حیوانی زندگی سے خالی تھا اور صرف عالم عناصر کے باہمی تصرفات نظر آتے تھے۔ ان دنوں آج ہی کل کی طرح میں ایک ذرّہ خاک کی وضع سے ہوا میں اُڑتا اور عرصۂ ہستی کی سیر کرتا پھرتا تھا۔ قدرت نے آخر ایک پہاڑ پر پہنچایا۔ جہاں میں چند روز ہیں ایک بڑی بھاری چٹّان کے جسم حجری میں شامل ہو گیا۔ اس پر کارکنان قدرت نے ایک درخت اُگا دیا۔ جس کی قوت نامیہ نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اور اب میں ایک جسم نباتی کا جزو تھا۔ لیکن تغیرات نے کسی ایک حالت پر ٹھہرنے نہ دیا۔ کبھی جنگل میں آگ لگتی اور میں زبانۂ آتش بن کے چمکتا۔ کبھی سیلاب آتا اور میں پانی کی موجوں کے ساتھ بہتا۔ کبھی باد سموم چلتی اور میں ریگ رواں کے ساتھ دوڑتا پھرتا۔"

"اب حیوانی زندگی کی تخلیق ہوئی۔ میں نے نئی مہیب صورتیں دیکھیں اور پھڑک پھڑک کے ہوا میں اُڑا مگر صنّاع قدرت نے پکڑ کے خلقت کے اس نئے کارخانے میں مجھے بھی لگا دیا۔ چنانچہ میرا گذر حیوانی اجسام میں ہوا۔ اب میں وحوش کی وحشت ناک صورتوں میں نمایاں ہو کے لڑتا تھا۔ کبھی مارتا تھا۔ کبھی مارا جاتا تھا۔ کبھی شیر بن کے مویشیوں پر جھپٹتا تھا۔ اور کبھی مویشی بن کے اپنے زبردست حریف سے بھاگتا تھا۔ کبھی اژدہا بن کے زمین پر رینگتا تھا۔ اور کبھی طائر بن کے ہوا میں اڑتا تھا۔ بازیگاہ قدرت کا یہ دوسرا کھیل ختم نہیں ہوا تھا کہ خدا نے انسان کی بنیاد ڈالی۔ اس دلچسپ قصے میں سے صرف اس قدر مجھے یاد ہے کہ پہلے پہل جب فرشتے عزرائیل کو لے کر آسمان کی طرف اڑے ہیں تو ان کے اُڑنے کی ہوا سے ایک درخت کی ٹہنیاں ہل گئی تھیں اور انھیں ٹہنیوں میں سے ایک کی پھُنگی میں ان دنوں میں تھا۔ پھر اُس کے بعد جب حضرت آدم جنت سے پھینکے گئے اور زمین پر آ کر گرے ہیں تو ان کے گرنے سے جو خاک اڑی تھی اس کے ذرات میں بھی یہ خاکسار موجود تھا۔ کئی بار میں اس آگ میں چنگاری بن کے

چمکا جس پر جناب حوا نے روٹیاں پکائی تھیں۔ اور کئی مرتبہ ان گیہوؤں ہیں میں شریک تھا جن کے آٹے سے روٹیاں پکیں۔

یوں مختلف وضعوں میں رہنے کے بعد میں اس خون میں شریک تھا جو قابیل کی گنہگاری کے وقت ہابیل کے جسم سے بہ کے زمین پر گرا۔ کیا کہوں میں نے کیا کیا رنگ دیکھے ہیں۔ جب آدمی گھونسوں اور تھپڑوں سے لڑتے تھے تو میں اکثر ان کی مٹھیوں میں ہوتا۔ جب وہ ایک دوسرے کی طرف ڈھیلوں اور پتھروں کو پھینک پھینک کر لڑتے تو میں کبھی کبھی ان کے پھینکے ہوئے ڈھیلوں میں ہوتا۔ جب وہ ڈنڈوں اور موگریوں سے مجادلہ کرتے تو میں کئی بار ان کی موگریوں میں شامل تھا۔ اور بعد ازاں جب انھوں نے لوہے کے آلات و اسلحہ سے کام لینا شروع کیا تو میں کبھی کسان کے ہل میں اور کبھی سپاہی کے تیر میں۔ کبھی کسی نیزے کا پھل تھا۔ اور کبھی کسی تیر کا پیکاں۔

حضرت ادریس نے جس سوئی سے پہلے پہل سیا اس کی نوک میں ہی تھا حضرت نوح نے جس لکڑی سے کشتی بنائی اس کا ایک جزو میں بھی تھا۔ اب بادِ تند کا ایک جھونکا مجھے اڑا کے سرزمین فارس میں لے آیا۔ جہاں میں جام جمشید کی مٹی میں گوندھا گیا۔ اور وہ جام بنا جس سے جمشید کا نام روشن ہے۔ فریدوں کا زمانہ آیا تو میں اس کے علم اقبال کا ایک پھریرا بنا۔ اور چند روز بعد خاک میں مل گیا۔ پھر کے کاؤس کے اس کھٹولے میں تھا جس پر بیٹھ کے قوی بال عقابوں کی مدد سے وہ آسمان کی طرف اُڑا تھا۔

اور پھر ہوا اور پانی کی مدد سے میں نے اقصائے عالم کی سیر کی۔ بابل میں پہنچ کے بعل کی مورت میں شامل ہوا۔ اور اس قہار گلخن ناز کی کیفیت دیکھا کرتا تھا جس میں کبھی ہزار ہا اسیران ستم پابزنجیر چڑھائے اور جلا کے خاک کئے جاتے تھے۔ اور کبھی کوئی پری رخسار دوشیزہ دیوتا کے لئے لاکے جلائی اور اس کی پیاری صورت خاک میں ملائی جاتی تھی۔

اب بادِ تکوین مجھے یہاں سے بھی اُڑا لے گئی۔ اور فینقیوں کے ایک تاجرانہ قافلے کا گرد کارواں بن کے مصر پہنچا۔ یہاں کبھی فراعنہ کی نازنینانِ حرم کا زیور تھا۔ اور کبھی امرائے مصر کی محفلوں میں شرابِ ارغوانی۔ کبھی فرعون کے سر کا تاج تھا۔ اور کبھی اس کی داڑھی میں گندھا ہوا موتی۔ کبھی وہ مقدس پوجاری تھا جو دیوتاؤں کے ساتھ بلّی اور مگرمچھ کی پرستش کرایا کرتے تھے۔ اور کبھی وہ مقدس و محترم بلّی تھا جس کی وہاں کے سب سے بڑے بتخانے میں پرستش کی جاتی تھی۔ اور آخر میں اس چھوٹی کشتی کا جزو تھا جس میں بٹھا کے حضرت موسیٰ بہائے گئے تھے۔

چند روز بعد بنی اسرائیل کے قافلے کے ساتھ میں ارضِ کنعاں میں پہنچا۔ تابوتِ سکینہ میں شامل رہ کے خداپرستی کی شان دیکھی۔ اور حضرت سلیمان کے مقدس ہاتھوں سے بیت المقدس کی برگزیدہ عمارت میں لگا دیا گیا۔ یہاں چند روز قرار و سکون اختیار کر کے آرام سے بیٹھا۔ اور بنی اسرائیل کے تغیرات کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ان کا عروج دیکھا۔ ان کی ترقیاں دیکھیں۔ ان کی خوبیاں دیکھیں۔ اور ان کی ضلالتیں دیکھیں۔ وہ نازک گھڑیاں دیکھیں جب بابل اور اسیریا والوں کے ٹیڑی دل اس ارضِ مقدس کے پامال کرنے کو آتے تھے۔ اور واپس جاتے تھے۔ اور آخر وہ قیامت کی گھڑی بھی دیکھی جب بخت نصّر کے ہاتھوں سے بیت المقدس پامال کیا گیا۔ بنی اسرائیل اسیر ہو کے بابل کی طرف چلے۔ اور میں نے بھی گرد کارواں میں شامل ہو کے ان کے ساتھ ساتھ مشرق کی راہ لی۔

یہاں سے کچھ دنوں کے لئے اُڑتا ہوا ایران میں چلا گیا۔ جہاں زردشت کے آئین و قوانین دیکھے۔ لکڑی بن کے آتش کدوں میں گیا۔ اور اجسامِ انسانی میں نشوونما پا کے دخموں کی سیر کی۔ پھر خاص سائیرس کے اسلحہ کا ایک جزو بن کے بابل میں واپس آیا۔ اور بعل کے مندر کے ساتھ سارے شہر اور مذہبِ صابئی کو پامال کر ڈالا۔ میں یہیں تھا کہ نبی ہو کے

آزاد کئے گئے۔ اور انھیں واپسی وطن کی اجازت ملی۔ ایک اسرائیلی کے جسم میں قیام
کرکے میں نے بھی مغرب کی راہ لی۔ اور چند روز کی صحرانوردی کے بعد بیت المقدس کے
منہدم کھنڈروں پر کھڑا ہو کے رویا اور اس کے ازسرِ نو تعمیر کرنے میں مشغول ہوا۔
یروشلیم کے ہیکل ربّانی کا گل شدہ چراغ پھر روشن کر کے میں خاک میں مل گیا۔
اور عربی تاجروں کے قافلے کے ساتھ یونان پہنچا وہاں یونانیوں کے اجسام میں رہ رہ
کے ان کی بہادریاں دیکھیں۔ اور ان لوگوں کی عقل آرائیاں دیکھیں۔ کبھی وینس (زہرہ)
کی دلربا مورت بن کے بت پرستی کی شان دیکھی۔ کبھی کسی دوشیزہ کے جسم میں
نفوذ کرکے پیشین گوئیاں کیں۔ اور یونان کے بڑے بڑے عقدے حل کئے۔ کبھی
فلسفی بن کے رموزِ حکمت بتائے۔ کبھی طبیب بن کے مسیحائی کا جلوہ دکھایا۔ کبھی سپاہی بن کے
دادِ شجاعت دی۔ اور کبھی کسی مظلوم کی صورت میں نمایاں ہو کے ایمفی تھیٹر میں
داخل ہوا۔ اور درندوں کے دانتوں اور پنجوں سے نوچا پھاڑا گیا۔

ہوتے ہوتے سکندر اعظم کا ایک سپاہی تھا اور اس کے جھنڈے کے نیچے لڑتا ہوا
ایران کی طرف چلا۔ مگر راستے ہی میں نذرِ اجل ہو کے خاک میں مل گیا۔ تقدیر نے
یوں یاوری نہ کی تو اس کے لشکر کی گرد بنا ہوا ایران پہنچا۔ یہاں کے عظیم الشان
انقلابات دیکھے۔ بہادروں کے پاؤں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو گرد اڑ کے آسمان
کی طرف جاتی اس میں مَیں بھی ہوتا۔ مگر اقبالِ سکندری کا تماشا دیکھنے کے شوق میں
رات کو پھر اس کے پاس آ جاتا۔ آخر دارا کے زخمی جسم پر جو خاک پڑی ہے اس کے
ذرات میں مَیں بھی تھا۔ اور اس کے بعد نوشابہ کے جبینِ ناز پر جو افشاں چنی گئی ہے
اس میں مَیں بھی موجود تھا۔ جب دارالسلطنت عجم میں سکندر کے حکم سے آگ لگائی
گئی ہے اس وقت کی عام مصیبتوں اور تباہیوں کو میں شعلوں اور دھوئیں کے
ساتھ اُڑ اُڑ کے دیکھتا تھا۔ اور افسوس کرتا تھا۔ پھر سکندر کے ساتھ میں نے

ہندوستان کی راہ لی۔ افغانیوں کی مزاحمتیں دیکھیں۔ راجہ پورس کی لڑائی پھر اس کی اطاعت دیکھی۔ ان یونانی عمارتوں کو دیکھا جو یہاں اس نے تعمیر کیں۔ اور پانی کی لہروں کے ساتھ بہتا ہوا اس کے لشکر کے ہمراہ جنوب کی طرف چلا۔ ملتان کا معرکۂ کارزار دیکھا جس میں سکندر زخمی اور نیم جاں ہو گیا تھا۔ جس وقت وہ زمین پر گرا ہے میں اگرچہ ایک ذرہ خاک تھا جوش محبت سے ایسا بیتاب ہوا کہ اس کی پیشانی پر گر کے اس کا منھ چوم لیا۔ پھر اس کے ساتھ بابل واپس آیا۔ اس کی لاش کے ہمراہ مغرب کی راہ لی۔ اور اسی کے ساتھ خاک میں دبا دیا گیا۔

خیال تھا کہ اب شاید ہمیشہ کے لئے سکون حاصل ہو جائے اور اسی حالت میں خاموش بیٹھا رہوں گا مگر نظام قدرت نے قرار لینے نہ دیا۔ چند روز بعد پھر برآمد ہوا۔ اور قیصر روم کی تلوار میں ایک آبدار ذرّہ جوہر بن کے چمکا۔ اور رومیوں کے ساتھ ساتھ مختلف شکلوں اور جسموں میں نمایاں ہو ہو کے میں نے دور دور کی سیر کی۔ بحیرۂ روم کے گرد چکر لگایا۔ اور انگلستان میں پہنچا جہاں قسطنطین کی ماں ہلنا کی زلف گرہ گیر کے خم میں چھپا ہوا گالیا (فرانس) میں آ کے اس کے شوہر سے ہم آغوش ہوا۔ پھر قسطنطین اعظم کی پہلی صلیب کا ایک جوہر بن کے نمودار ہوا۔ اور رومیوں کے ستائے ہوئے پریشان حال مسیحیوں کو اپنی طرف کھینچ کے روم پر حملہ آور ہوا۔ رومتہ الکبریٰ کو فتح کر کے قسطنطنیہ میں آیا۔ اور سینٹ صوفیہ کی عمارت تعمیر کرانے کے بعد ہلنا کے ہمراہ پھر ارض مقدس میں وارد ہوا۔ یہاں بڑے بڑے گرجے اور کنیسے تعمیر ہوتے دیکھے۔ یہود کی پامالی کے ساتھ ارض مقدس کی دوسری تباہی کا ہولناک منظر دیکھا۔ جب کہ بت پرست قیصر روم نے یہود کے تمام گذشتہ تبرکات کو ایک دم بھر میں جلا کے خاک کر دیا تھا۔

چند روز بعد دیکھا تو مسیحیت رومی تاج وتخت کی وارث تھی۔ یہود ہر جگہ ستائے جاتے تھے۔ اور بھاگ بھاگ کے جان بچاتے تھے۔ انھیں کے ایک بھاگنے والے گروہ کی گرد کارواں میں شامل ہو کے میں نے ارض عرب کی راہ لی۔ اور مدینہ یثرب میں پہنچ کے قرار لیا۔ اب یہاں میں ایک معزز یثربی کے جسم میں تھا کہ پیغمبر عرب علیہ السلام مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے وہاں آئے۔ اور میں ان کے عقیدت کیشوں میں شامل ہو گیا۔ یہاں میں ایک محترم انصاری کی نورانی پیشانی پر سجدے کا نشان بن کے چمکا۔ اور چند ہی روز بعد عربوں کے اقبال کے ساتھ ساتھ ممالک ارض کی سیر کرنے لگا۔ کبھی عباسیوں کی دستار میں تھا۔ اور کبھی سلجوقیوں کے عَلَم میں۔
آخر بابر کی فوج کے ایک سردار کی تلوار میں جگہ پا کے ہندوستان آیا۔ جہاں کبھی امیروں کا خلعت بن کے نمایاں ہوا۔ اور کبھی فقیروں کا کشکول۔ کبھی سپاہی کی تلوار تھا۔ اور کبھی کسی شیخ طریقت کا ظفر تکیہ۔ غرض ایسے ایسے عظیم الشان معاملات کو دیکھ کے۔ اور ایسی ایسی معرکہ آرائیوں کی سیر کر کے دنیاوی جھگڑوں سے آزاد ہوا۔ اور پھر وہی پہلا ذرہ خاک ہوں۔ اور تیرے اس کلبۂ احزاں کی فضا میں گشت لگا رہا ہوں۔
یہ واقعات سُن کے میں نے کہا "اے مقدس ومحترم ذرۂ خاک۔ تو تو عجب مبارک چیز نکلا۔ میری نظر میں تو تجھے ان عظیم الشان کرات فلکی سے بھی زیادہ وقعت وعظمت حاصل ہے۔ آ تجھے اپنے پاس رکھوں۔ اور تیری قدر کروں۔
بولا۔ "تم مجھے میری سیر روک نہیں سکتے۔ اور نہ مجھے اس کی فرصت ہے۔ اتنے دلچسپ تماشے دیکھے ہیں۔ اور خدا جانے ابھی کیا کیا دیکھوں گا۔ یہ نہ سمجھو کہ میں خود اپنے شوق اور اپنی مرضی سے کہیں جاتا یا کچھ کرتا ہوں۔ میری باگ اس خلاق عالم کے ہاتھ میں ہے جدھر لے جاتا ہے جاتا ہوں۔ جہاں بٹھا دیتا ہے

بیٹھ جاتا ہوں اور جس کام میں لگا دیتا ہے لگ جاتا ہوں"۔

میں نے کہا" تیری پاک نفسی میں شک نہیں۔ لیکن اب ذرا ٹھہر۔ ہندوستان تیری پوری قدر نہیں کر سکتا۔ مگر میں تجھے انگلستان کے برٹش میوزیم میں بھجوا دونگا جہاں تو ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ اگلی دنیا تجھے دیوتا یا دیوی بنا کے پوجتی۔ اب تو ان دنوں کی طرح پُوجا تو نہ جائے گا۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ دیوتاؤں سے بھی زیادہ تیری عزت کی جائے گی۔ لوگ تجھے سب چیزوں سے زیادہ عزت وادب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور شاید پھر کبھی تجھے اس عالی شان عمارت سے قدم باہر نکالنے کی زحمت نہ دیجائے گی۔

یہ سنتے ہی بگڑ کے بولا" اس چند روزہ عروج دنیوی پر مغرور نہ ہو۔ کس کی رہی اور کس کی رہ جائے گی؟ میں کاہل نہیں۔ اور نہ مجھے فرعون اور کلیوپٹیرا کی لاشوں کے درمیان میں لپٹ کے سونے کا شوق ہے۔ میں ٹھہرنے یا قرار لینے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہوں۔ جب تک اجرام فلکی اپنے اپنے حیز کے گرد چکر لگاتے رہیں گے اسوقت تک فضائے ہستی میری جولاں گاہ رہے گی۔ بس جا اب اپنا کام کر۔ کیوں تضیع اوقات کر رہا ہے؟ اور مجھے بھی جانے دے"۔

یہ سنتے ہی میں نے ہاتھ بڑھا کے ارادہ کیا کہ اُسے پکڑ لوں مگر ہاتھ کی حرکت سے جو ہوا پیدا ہوئی اس کے لئے کافی تھی۔ اُڑا۔ اور دھوپ کی نورانی سلاخ سے علیحدہ ہو کے نظر سے غائب ہو گیا۔

(شرر لکھنوی۔ از دلگداز)

ھُو

اُم

اہل ذوق صوفی صافی کہتے ہیں کہ وہ۔ اور صرف وہ اور ہم کہتے ہیں کہ

ہم تم اور فقط ہم تم۔ پس جو کچھ ہیں ہم ہی تم ہیں۔ اور باقی کچھ نہیں۔ تم ناز آفرینی کے لئے ہو اور ہم ناز برداری کے لئے۔ تم ہمارا دل بہلانے کے لئے ہو اور ہم عالم ہستی پر تصرف کرنے کے لئے۔ تم گُل خوش رنگ ہو اور ہم اس سے لطف اٹھانے والے تم صبح گلشن کے طائر خوش الحان ہو اور ہم اس کا نغمۂ دلکش سننے والے۔ تم آفتاب جہاں تاب ہو اور ہم ستارہ پرست۔ تم بت ہو اور ہم برہمن۔

صوفیوں میں سے ہم صرف اسی کے قائل ہیں جس نے حقیقت شناسی کے جوش میں آ کے انا الحق کا نعرہ بلند کیا۔ اور ہم ہی ہم کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اگرچہ خودی کے جوش میں تم کو بھول گیا تھا۔ مگر پھر بھی رمز شناس تھا۔ ان ناواقفوں سے لاکھ درجہ اچھا تھا جو کہتے ہیں وہ۔ وہ تو غائب کی ضمیر ہے اور جو غائب ہو اس کا ذکر ہی کیا؟ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ تم۔ اور تم ہی نہیں ہم بھی۔

لوگ کہیں گے کہ یہ تو ثنویت ٹھہری۔ یعنی آتش پرستوں کی طرح دو کا بنانا ہوا۔ لیکن یہ معترضوں کی ناسمجھی ہے۔ آتش پرستوں کے دو آپس میں متبائن و متضاد واقع ہوئے ہیں۔ اور ہمارے دو اللہ! اللہ! ایسے دو بھلا کسی نے دیکھے ہیں؟ جو اگر دو ہیں تو صرف نام کے لئے۔ ورنہ ہم اصل میں ایک ہی ہیں۔ ایک جان دو قالب۔ تم ہمارے لئے۔ اور ہم تمہارے لئے۔ ہم نہیں تو تم بھی نہیں۔ اور تم نہیں تو ہم بھی نہیں۔

ہم تم ہیں ایک جان دو قالب۔ آپس میں بڑی محبتیں ہیں۔ اسی اتحاد و یک جہتی کے جوش سے بےخود ہو کے بعض اوقات ہم تمہیں بھول جاتے ہیں۔ اور ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ گویا عالم ہستی میں ہم ہی ہم ہیں کوئی دوسرا نہیں۔ مگر وہ وقتی جذبات ہوتے ہیں۔ جن کی بدولت کبھی عالم خیال میں تم غالب آ کے ہمیں مٹا دیتے ہو۔ اور تم ہی تم رہ جاتے ہو۔ اور کبھی ہم ایسے چھا جاتے ہیں کہ تمہیں فنا کر کے ہم ہی ہم رہ جاتے ہیں

یہ انقلاب سچ پوچھئے تو نشۂ الفت کے جھونکے ہیں۔ ان جذبات سے دور ہو کے اور ان عاشقانہ سیہ مستیوں سے نجات پانے کے بعد جب ہم غور کرتے ہیں تو دیکھو یہی ہم تم اپنی جگہ پر قائم ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارا شعار اور ہمارا کلمہ ہی ہو جاتا ہے کہ ہم تم۔

غور سے دیکھو اور انصاف کرو تو خود ہی کھل جاتا ہے کہ ہمارے تمہارے سوا کوئی نہیں۔ کل کائنات بس تین چیزوں سے عبارت ہے۔ متکلم۔ حاضر۔ اور غائب یعنی ہم تم اور وہ۔ وہ کی نسبت ہم بتا ہی چکے کہ غائب ہے۔ اور غائب کی کوئی ہستی نہیں۔ پھر جب غائب یعنی وہ نہ رہا تو بس ہم ہی تم رہ گئے۔

سچی حق پرستی یہ ہے کہ وہ کا نام و نشان نہ باقی رہے۔ ہم تمہارے خیال میں محو ہوں اور تم ہم پر مہربانی کرتے رہو۔ یہی دنیا ہے اور یہی عقبیٰ۔ اور یہی اصل ایمان ہے۔ وہ کا خیال آیا اور کافر۔ ہمارے کیش و آئیں میں وہ شیطان ہے۔ وہ اور اُس کی طرف دھیان گیا اور ایمان رخصت۔

یہ تو حق پرستی تھی۔ اور ہمارے عقیدے کی شریعت۔ اب رہی توحید اور طریقت وہ یہ ہے کہ جس طرح منصور تم کو بھول کے انا الحق کہہ اٹھا تھا ہم ہم کو بھول کر تم ہی تم کہنے لگیں۔ اور جدھر نظر اٹھا کے دیکھیں تمہارا ہی ظہور نظر آئے ہم بھی تم بن جائیں۔ اور سارا عالم بھی تم ہو۔

تم ہائے تم! بس تم ہی تم۔ وصال ہے تو تم سے۔ فراق ہے تو تمہارا۔ زبان پر ہو تو تم۔ دل میں ہو تو تم۔ یہاں ہو تو تم۔ وہاں ہو تو تم۔ غرض کہ تم ہی تم۔ جب ناز آفرینی اور کرشمہ سنجی یا کثرت اور انبساط کا وقت ہوتا ہے اس وقت تم ہی پھیل کے سارا عالم۔ سارا عرصۂ ہستی۔ اور ہم۔ تم۔ وہ۔ بن جاتے ہو۔ اور جب خودداری اور بے تعلقی یا وحدت اور انقباض کا وقت آتا ہے اس وقت تم ہی سمٹ کے وہ مرکز اصلی۔ اور نقطۂ ازل بن جاتے ہو۔ جس کو ہم اپنی اصطلاح میں

تم کہتے ہیں۔

سورج تمہارے نور کا جلوہ دکھا رہا ہے۔ چاند تمہارا آئینہ ہے۔ پھول تمہارا عارض گلگوں ہے۔ نرگس تمہاری چشم نیم باز ہے۔ بلبل تمہارا ذکر کر رہا ہے۔ اور پپیہا تمہیں پکارتا پھرتا ہے۔ غرض جہاں تک خیال جاتا ہے اور جدھر نظر اٹھا کے دیکھتے ہیں یا تمہارا جلوہ نظر آتا ہے یا تم تم کی آواز آ رہی ہے۔

نظام فلکی کو بطلیموس نے ایک تنگ پٹارے میں بند کرنا چاہا تھا۔ مگر بعد کی تحقیقات بلکہ مشاہدے اور معائنے تک نے ثابت کر دیا کہ عرصۂ قدرت کا اور چھور نہیں جس نے ادنیٰ سے ادنیٰ ذرّوں سے لے کے بڑے بڑے عظیم الشان کُرے تک ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور کسی عاشق حرماں نصیب کی طرح سرگرداں ہیں نہ کہیں ٹھہرتے ہیں اور نہ کبھی قرار لیتے ہیں۔ علم ہیأت والے بتا رہے ہیں کہ یہ سب کرات فلک یوں چلتے ہیں۔ یوں پھرتے ہیں۔ اِدھر جاتے ہیں اُدھر چکر لگاتے ہیں۔ غرض سب کچھ کہہ گئے مگر یہ نہ بتایا کہ یہ کیوں پھرتے ہیں؟ کہاں جاتے ہیں۔ اور ان کی اس دوڑ دھوپ کی اصلی غرض کیا ہے؟۔ اگر وہ نہیں بتاتے تو لو ہم سے سنو۔ یہ سب تمہاری تلاش اور تمہارے شوق میں سرگرداں ہیں۔ تمہاری دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اور گو ہم نہیں سُنتے مگر اپنی زبان حال سے قدم قدم پر پکارتے جاتے ہیں۔ تُم۔ تُم۔

تمہارے ناز معشوقانہ اور تمہاری کرشمہ سازیاں یہ عجب تماشا دکھا رہے ہیں کہ سب کو اپنی طرف کھینچتے ہو اپنے پاس بلاتے ہو۔ اپنا سرگرداں کرتے ہو۔ اپنی شمع جمال کا پروانہ بناتے ہو۔ مگر اپنے قریب نہیں آنے دیتے۔ شوق وصل کی بیتابیوں نے عالم تکوین میں ہل چل ڈال رکھی ہے۔ ذرّہ ذرّے سے ٹکراتا۔ کُرہ کُرے سے لڑتا۔ اور ایک دوسرے کو مٹاتا اور کھائے جاتا ہے۔ مگر تم متانت و خموشی کے ساتھ بیٹھے تماشا دیکھتے ہو اور ترس نہیں کھاتے۔

مگر ہم اس بے پروائی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ جب جوش اتحاد غالب ہوتا ہے اور ہم تمہارے سوا سب کو بھول جاتے ہیں اس وقت ہماری نظر میں سارا عالم کوئے یار، یا تمہاری گلی بن جاتا ہے۔ اور جوش محبت سے وجد میں آ کے ہم یہ نعرہ مستانہ بلند کرنے لگتے ہیں کہ۔ ہم۔ تم۔ (شرر لکھنوی۔ از دلگداز)

وُہ !

ہم اور تم کی داستان ہم ناظرین کو سنا چکے۔ اب وہ کی باری ہے۔ لوگ کہتے ہیں اور نحو میں بھی جو زبان کے نکات و رموز کے شناسا ہیں دعویٰ کر رہے ہیں کہ تین پرسن (اشخاص) ہیں۔ ہم۔ ہم۔ تم۔ اور وہ۔ لیکن غور سے دیکھو تو ہم تم سب مٹ جانے والے ہیں۔ ایک باقی رہنے والا وہ ہے۔ لہذا وہ ہی اصل ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ ہی ہے۔

اہل تصوف جوش وحدت میں کہہ اٹھتے ہیں ہم یا میں۔ منصور کی صدائے انا الحق آج تک عارفین کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ ہم میں اگر طریقت تھی تو وہ میں شریعت ہے ہم وحدت وجود تھی۔ اور وہ وحدت شہود۔ سچ یہ ہے کہ جوش محبت سے بیتاب ہو کے اگر کسی نے ہم کا غل مچا دیا تو یہ اس کی بیتابی کا تقاضا تھا۔ ورنہ اصل میں یہ ایک بڑی بھاری غلطی تھی۔ کیونکہ جس کو وفور محبت سے ہم نے ہم یا تم کہا۔ وہ اصل میں نہ ہم ہی تھا اور نہ تم ہی۔ بلکہ وہ وہ تھا۔ اور جہاں تک تحقیق و غور سے کام لیجئے وہی وہ ہے ہم سے اس سے نسبت ہی کیا؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ہم خاک اور وہ پاک۔ ہم ظلمت اور وہ نور۔ ہم زمین پر اور وہ آسمان پر۔ ہم یہاں اور وہ وہاں۔ ذ بھلا کوئی بھی نسبت ہے؟۔

عالم میں درحقیقت اسی وہ نے ہل چل ڈال رکھی ہے۔ جب تک ہم تم اور وہ کی تفریق نہ تھی یہ تشخصات نہیں قائم ہوئے تھے۔ اور اپنے پرائے کا امتیاز نہ تھا۔ نہ ما و شما کا جھگڑا تھا۔ نہ انانیت کے دعوے تھے۔ اور نہ یہ روز روز کی تو تو میں میں۔ بھال

بحت اور تجرد محض کا سماں تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اسی وقت تک کچھ لطف بھی تھا۔
اگرچہ وہ ہی وہ تھا۔ مگر ایسا وہ کہ ماسوا کے نہ ہونے سے اُسے وہ بھی نہ کہہ سکتے تھے
اختیار تھا کہ چاہیں اسے وہ کہیں۔ چاہیں ہم۔ کہیں۔ اور چاہیں تم کہیں۔ نہ یہ تھا کہ
ہم کہہ دینے پر سر کاٹا جاتا ہو۔ اور نہ ایسا تھا کہ وہ کہہ دینے سے کسی کے نزدیک کافر قرار
پاتے ہوں۔

مگر آہ! اس غیر متناہی ہم اور وہ اور تم کو اس خموشی و بیکاری میں چین نہ آیا۔ تجرد کی
سنسان بستی میں نچلا نہ بیٹھا گیا۔ طلسم خانۂ ہستی کے قفل میں کُن کی کنجی بھری۔ بازی گر
قدرت کا پٹارہ کھلا۔ ساتھ ہی ہم۔ تم۔ کی صورتیں نکل کے نیچے آ گریں۔ اور وہ اپنے عرش
کے اوپر اس شان سے اور اتنی بلندی پر نمودار ہوا کہ سب ماسوا کی نظریں اوپر اٹھ گئیں
مگر وہاں دیکھا تو بُعد کا دھندھلکا تھا۔ اور یہ وہ کے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔
لیکن اس نقاب کی آڑ سے نور کی شعاعیں نکل کے ہم۔ تم کو اپنی طرف کھینچتی۔ اور اس
سابقۂ اتحاد کو یاد دلا کے فراق کے صدمات سے بے چین کئے دیتی تھیں۔

اب کیا تھا؟ مشتاقوں کے دلوں میں شوق کا اور زیادہ ہجوم ہوا۔ مذاہب میں
وہ کا دعویٰ بلند ہوا۔ زاہد مرتاض نے ہو ہو کا شور مچایا۔ اور اہل ظاہر کا شعار اور
کلمہ قرار پایا۔ لا الہ الا ہو۔ محققین ذوق و شوق میں کہہ اٹھے۔ ہو الاول۔
ہو الآخر۔ ہو الظاہر۔ ہو الباطن۔ عشاق زیادہ بیتاب ہوئے اور کہہ اُٹھے۔
آتے ہیں خیالوں میں دماغوں میں دلوں میں پھر ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہم پردہ نشیں ہیں
یہی وہ عربی میں ہو ہے۔ اور چونکہ عربی مذہبی زبان ہے اس لئے ہو نے ثقاہت
کی شان دکھائی۔ اور عُبّاد و زُہّاد میں ہو ہو کا چرچا ہوا۔ وہ نے رندانہ مشربی کے
عالم میں ایسے ایسے مزے دکھائے کہ وہ کے سوا کسی چیز میں مزا نہ باقی رہا۔ اس عالم میں جو کچھ
ہے وہ ہی وہ ہے۔ اگر آرزوئے وصال ہے تو وہ کی۔ شکوۂ فراق ہے تو وہ کا۔ دل میں

بسا ہوا ہے تو وہ۔ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے تو وہ۔ بنتی ہے تو وہ سے۔ بگڑتی ہے تو وہ سے۔ خلاصہ یہ کہ ہر طرف وہ ہی وہ کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ ہی وہ ہے۔ ہم وہ کے لئے اور وہ ہمارے لئے۔

ہم پر وہ کی دہشت اس قدر طاری ہے کہ سوا وہ کے ہمیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ طیور خوش نوا میں وہ کی آواز ہے۔ خوشبودار پھولوں میں وہ کی بو آ رہی ہے۔ گل رعنا وہ کے رخسار تاباں کا جلوہ دکھا رہا ہے۔ نرگس وہ کی چشم فتّان ہے۔ سنبل وہ کی کاکل پیچاں ہے۔ غرض جس چیز میں دیکھو وہ کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔

اس لئے وہ اے پیارے وہ۔ دلدار وہ۔ ناز آفریں وہ۔ ہمیں تو بس تو ہی چاہئے۔ اور کچھ نہیں۔ تیرے سوا ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔ ایک وہ مل جائے تو پھر ہمیں کسی کی پروا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ ہو۔ ہم ہوں یا ہم بھی نہ ہوں اور صرف وہ ہی وہ رہ جائے

(شرر لکھنوی۔ از دلگداز)

شکارگاہ خسروی

اس وقت ہم ناظرین کو اس دلچسپ سرزمین پر لے چلتے ہیں جہاں کے قدرتی منظر انسان کو جنت کا سماں یاد دلا دیتے ہیں۔ اور جو حُسن و جمال اور انسانی خوبصورتی اور رعنائی کے اعتبار سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یعنی گرجستان کا علاقہ اور کوہ قاف کا سرسبز اور شاداب دامن۔

بلاد خسرو زرآب سے ذرا آگے بڑھ کے سلسلۂ کوہ قاف کے رفیع الشان اور سر بہ فلک پہاڑ کوہ شاہ داغ کے جنوبی دامن میں ایک نہایت ہی دلکش و نزہت بخش وادی ہے۔ ہر طرف قدرت نے دلفریب اور فرحت افزا باغ لگا رکھا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کوہستانی برف سے خنکی و تازگی حاصل کرتی ہوئی آتی ہے، اور

نازک و سرسبز پودھوں کے پہلوؤں میں اسی طرح گدگدا کے نکل جاتی ہے کہ بیتاب ہو کے جھوم جاتے ہیں۔ اور اس خود فراموشی کی شان سے ناچنے لگتے ہیں کہ پھولوں کا جو زیور حُسن پرستان قدرت نے پنھایا ہے گر گر کے زمین پر بکھرنے لگتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی نہریں پہاڑوں کے پہلوؤں سے ناچتی اور کودتی ہوئی نیچے اتر رہی ہیں۔ جو اس وادی کے تمام پودھوں میں ہر طرف پھر پھر کے اور چکر لگا لگا کے پانی پہنچا رہی ہیں۔ اور تھوڑی دور آگے بڑھ کے قدیم دریائے خسرو میں جسے اب دریائے نور کہتے ہیں مل گئی ہیں۔

طیور ہر طرف نازک شاخوں پر بیٹھے ہیں اور پھولوں سے چونچیں ملا ملا کے نغمہ سنجی کر رہی ہیں۔ کوہستانوں کی خوبصورت و تندرست لڑکیاں اپنے گلّوں کے چرانے کو آئی ہیں۔ بکریاں اور بھیڑیں وسیع و سرسبز مرغزار میں پھیل گئی ہیں۔ اور ان کی یہ خوبصورت اور پری جمال نگہبانیں عجیب فارغ البالی و اطمینان سے نہروں اور پاکیزہ و شفّاف پانی کے کنارے بیٹھی ہیں۔ کبھی ہاتھ منھ دھونے لگتی ہیں اور کبھی پانی کی بلوریں سطح میں اپنے پیارے اور سادے چہرے دیکھ دیکھ کے خوش ہونے لگتی ہیں۔ انھیں کے قریب اور تھوڑے فاصلے پر وحشیان صحرا۔ ہرن اور چیتل۔ نیل گائیں۔ اور گورخر بے خوف و خطر آتے ہیں۔ پانی پی پی کے سیراب ہوتے ہیں۔ اور ادھر اُدھر چرنے لگتے ہیں۔

وقت بھی نہایت دلچسپ ہے آفتاب مشرقی پہاڑیوں سے بلند ہوا ہے۔ اور اپنی روشن کرنوں سے عالم کو سنہرا زیور پنھا رہا ہے۔ ان دنوں جب کہ موسم بہار پورے کمال پر ہو یہاں اکثر برسات کا سماں رہا کرتا ہے۔ اور ابر گھرا نظر آتا ہے۔ مگر آج خلاف معمول آسمان کھلا ہوا ہے۔ اور آفتاب اپنی پوری اور صاف روشنی سے اس دلفریب وادی کی دلچسپیوں کو چمکا رہا ہے۔

ناگہاں پہاڑی کوّے ایک شور مچا کے اُڑے۔ ہرن جو اطمینان و بے ہراسی سے اِدھر اُدھر چر رہے تھے چوکنے ہو ہو کے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ گڑریوں کی خوبصورت لڑکیاں سہم گئیں۔ گھبرا گھبرا کے بھاگنے لگیں۔ اور کوہستان کے گھونگھٹوں میں چھپنے لگیں کہ کوئی شخص آ کے پکڑ نہ لے جائے۔

اور ان سادہ مزاج لڑکیوں کی یہ وحشت بے وجہ نہ تھی اس لئے کہ چند ہی منٹ میں شکاریوں کی ایک بہت بڑی اور عظیم الشان جماعت شاہانہ شان و شوکت سے اس پُر فضا وادی میں داخل ہوئی جس کا تزک و احتشام دیکھ کے ہر شخص متحیّر ہے کہ یہ لوگ شکار کو آئے ہیں یا کسی مملکت پر فوج کشی کرنے کو۔ سب کے آگے تین ہزار سوار ہیں۔ لمبے لمبے نیزے ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ سروں پر طلاکار اور چمکتے ہوئے خود ہیں۔ جن پر کلغیاں لگی ہیں۔ گھوڑوں کا ساز و یراق طلائی ہے۔ اور گویا ان میں سے ہر ایک جاں بازی و نبرد آزمائی کو تیار ہے۔ ان سواروں کے پیچھے گیارہ سو ساٹھ غلاموں کا پرا ہے۔ جو بڑے بڑے اور وزنی گرز کندھوں پہ رکھے ہیں۔ اور عجب ادب و وقار کی چال سے آگے بڑھتے چلے آتے ہیں۔ غلاموں کے پیچھے ایک ہزار چالیس شمشیر زن سورما ہیں جو بھاری بھاری زرہیں اور ان پر دیبائے رومی کے رنگ برنگ کُرتے پہنے ہوئے ہیں۔

اس وقت تک تو یہ جلوس کسی الوالعزم اور حملہ آور بادشاہ کے سفر جنگ کا سماں دکھا رہا تھا۔ مگر اب ان شمشیر زن سپاہیوں کے بعد معلوم ہوا کہ نہیں یہ لوگ حملہ آوری اور ملک گیری کے لئے نہیں بلکہ شکار کو آئے ہیں۔ اس لئے اب سات سو بازوالوں کا گروہ آیا جن کے ہاتھوں پر مرصّع غلاف چڑھے ہیں اور ہر ایک کے ہاتھ پر ایک باز ہے جو نازک و خوشنما طلائی زنجیر میں بندھا ہے۔ اور کمال استادی کے ساتھ سدھایا گیا ہے بازوالوں کے پیچھے تین ہزار سوار ہیں جن میں سے ہر ایک ایک شکاری چیتے کو خوشامد کرتا اور چمکارتا ہوا لئے آتا ہے۔ ان کے بعد ستر زبردست شیر ہیں جن کی گردن میں ریشمی زرد

ڈوریاں پڑی ہیں۔ اور دہانے طلائی زنجیروں سے جکڑے ہیں۔ شیروں کے بعد آٹھ سَو شکاری سگتے ہیں۔ جن کے گلوں میں مرصع پٹے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح زور میں آ آ کے چھوٹنے کی کوشش کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے سونے چاندی کی زنجیروں کو توڑ ڈالیں گے ان کے پیچھے کئی ہزار تیر اندازوں کا جتھا ہے جن میں سے ہر ایک شرط باندھ کے نشانہ اڑا دینے کو تیار ہے۔

جب عرصۂ رزم کے مردمیدان گذر گئے۔ اور شکار وصید افگنی کا بھی پورا سامان آچکا تو بزم کی دلچسپیاں شروع ہوئیں۔ دو ہزار اونٹوں کی ایک قطار آئی جن کی لمبی لمبی گردنوں میں طلائی گھونگھرو پڑے ہیں۔ پیٹھوں پر نہایت پُر تکلف محملیں ہیں اور ہر محمل میں ایک پری جمال و آفت روزگار گانے والی بربط و سرود لئے بیٹھی ہے۔ ان نازنین ناچنے گانے والیوں کے سروں پر طلاکار اور مرصع تاج ہیں۔ گلوں میں نہایت روشن اور شگفتہ رنگوں کے ریشمی کرتے ہیں۔ اور سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوئی ہیں۔ اونٹوں کے پیچھے دو سو آدمی آئے جن کے ہاتھوں میں چاندی کی انگیٹھیاں ہیں۔ اور ان میں عود و عنبر ڈال ڈال کے ساری وادی کو روح افزا خوشبو سے مہکاتے آتے ہیں۔ ان انگیٹھی والوں سے ملے ہوئے دو سو خدمتگار ہیں۔ یہ زرد اور بنفشئی حریری قبائیں پہنے ہیں۔ کانوں میں موتیوں کے گوشوارے پڑے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں میں گلدستے ہیں اور بادشاہ کے اشاروں پر دوڑنے کو تیار ہیں۔

یہ سب سامان جب آچکا تو خود بادشاہ کی سواری آئی اور سر پر نارنجی مرصع و مطلا درفش کاویانی کے لہرانے سے معلوم ہوا کہ خود وارث نسل ساسیاں اور قابض تخت ایران خسرو پرویز ہے۔ اس کے سر پر تاج کیانی ہے۔ اور ایسے قیمتی و پُر تکلف لباس سے آراستہ ہے کہ باوجودیکہ چتر شاہی کے سائے میں ہے مگر سارے جسم پر جواہرات جھلک رہے ہیں۔ اور الماس و نیلم وغیرہ کی ضو اور شعاعوں سے دیکھنے والوں کے

دل پر عجب رعب طاری ہوتا ہے۔ ایک شایستہ وخوبصورت عربی گھوڑا اس کی ران کے نیچے ہے۔ ہزار سے زیادہ نازنین ومہ جبین عورتیں دلربائی کی وضع سے زلفیں پریشان کئے نہایت بانکپن کے ساتھ تاج مرصع سر پر رکھے۔ اور عجب شوخ ادائی وکرشمہ خیزی سے گھوڑوں کو کداتی ہوئی ساتھ ہیں۔ اور بادشاہ کو اپنے جھرمٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ انھیں نازنین دلرباؤں میں دو ایک کے ہاتھ میں سونے کی صراحیاں اور مرصع جام ہیں۔ جو بڑی مستعدی سے اپنی خدمت بجا لارہی ہیں بار بار شراب کا جام لبریز کرکے شہنشاہ گیتی پناہ کے ہاتھ میں دیتی ہیں اور وہ بے تکلف پی لیتا ہے۔

عین اس وادی کے درمیان میں پہنچ کے خسرو پرویز نے شراب کا ایک جام پیا تھا اور رومال سے منھ پوچھ رہا تھا کہ ناگہاں ایک ملائک فریب نازنین عجب ناز وانداز سے سامنے آکے کھڑی ہوگئی۔ اس کے غیر معمولی حسن وجمال نے تمام ہمراہی گل رخوں کا حُسن پھیکا کردیا۔ سب کے چہرے ماند پڑ گئے۔ اور معلوم ہوا کہ عین اس وقت جب کہ آسمان کے سب تارے خوب کھلے ہوئے تھے آفتاب نکل آیا۔ اور سب تاروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پری یا دیوی آسمان سے اُتر کے آئی۔ اور تصویر بن کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

یہ زاہد فریب وماہ طلعت نازنین چند ساعت تک اسی طرح تصویر بنی کھڑی رہی۔ اور خسرو پرویز بھی اس کی دلربا صورت دیکھ کے نقش حیرت بن گیا۔

ناگہاں اس بت حور وش کا غرور خودداری ٹوٹا۔ بیمار نرگسی آنکھوں سے موتیوں کے آنسو جاری ہوئے۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لے کے بولی۔ اے شہریار گیتی ستاں اور اے تاجدار نسل ساساں! لونڈی سے کیا خطا ہوئی کہ ایسی مہجور ومبتلائے درد والم ہے اور حضور کو پروا نہیں؟ اپنے اس عہد وپیماں کو یاد کیجئے اس وقت کی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچئے جب حضور ناز برداری کرتے تھے

تجھے اور لونڈی کو ملنے میں تامل تھا۔ وہ اگلی صحبتیں۔ وہ پرانی ذوق وشوق کی باتیں کیا سب خواب وخیال ہوگئیں؟ (شررؔ لکھنوی۔ از ایام عرب جلد دوم)

حکمتِ عملی کیا چیز ہے؟

کائنات کے مینا بازار میں جتنی چیزیں صنّاع قدرت نے آراستہ کی ہیں اصطلاح میں موجودات عالم کہلاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں اپنی نوعیت اور وضع کے لحاظ سے مختلف اور ساخت کے لحاظ سے عجیب وغریب صنعت وکمال کا نمونہ ہیں کہ ان سے بہتر اور اعلیٰ اس وقت تک پیدا نہیں ہوا۔ جس طرح ان کی صورت اور ظاہری کیفیت مختلف ہے اسی طرح ان کے فوائد واغراض بھی جدا جدا ہیں۔ اور ہر چیز فی حدِّ ذاتہٖ ایسی کامل ہے کہ نہ صرف اس کی صورت ہی نظر فریب اور دوکان آفرینش کی آرائش کا باعث ہے بلکہ اس سے وہ غرض بھی جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے بہت اچھی طرح پوری ہوتی ہے۔

اس بوقلموں سامان میں ایک کل کا پتلا ہے جس کا نام انسان ہے۔ یہ پتلا بہ لحاظ خلقت تو موجودات عالم کا بزو اور مینا بازار کی ایک نمائشی شے ہے۔ لیکن اس سارے کارخانے کا تماشائی بھی ایک یہی ہے۔ اور کل چیزوں پر اس طرح حاوی اور متصرف ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں کوئی صفت ایسی خاص ہے جو دیگر موجودات میں نہیں۔ اور یہ نہ صرف تمام مخلوقات میں زیادہ شریف ہے بلکہ خالق سمٰوات والارض کی طرف سے اس تمام کارخانے کا جسے دنیا کہتے ہیں خلیفہ اور ایجنٹ بھی مقرر ہوا ہے۔

انسان کو دنیا میں مرتبہ تو بہت بڑا ملا ہے کہ سارے عالم میں اشرف المخلوقات اور خلیفۂ خدا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی ذمہ داریاں اور فرائض کی سختیاں بھی اس قدر ہیں کہ ذرا چوکا اور اپنے رتبے سے گرا۔ اس سبب سے تمام انسان

اشرف المخلوقات نہیں بلکہ صرف وہی انسان اشرف و اعلیٰ ہیں جن کی ذات میں وہ اوصاف موجود ہوں جو شرافت و کمال تک پہنچانے والے اور اس اعلیٰ خطاب کے شایان بنانے والے ہیں۔ یہ صفت جو انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ کرتی ہے **حکمت** ہے۔

حکمت ہے تو چھوٹا سا لفظ لیکن اس کے معنی اتنے وسیع ہیں کہ اس میں علم و عمل کی وہ تمام باتیں شامل ہیں جنھیں انسان کو کمال حاصل کرنے کے لئے جاننا اور ان پر کاربند ہونا چاہئے۔ **علم** موجودات کی حقیقت اور احوال کے جاننے کو کہتے ہیں۔ تاکہ جہاں تک انسان سے ممکن ہے وہ کسی خاص شے کی حقیقت جیسی کہ فی الواقع ہے معلوم کرے۔ اور **عمل** یہ ہے کہ جہاں تک انسان سے ہوسکے ایسے مفید اور بکارآمد امور پر کاربند ہو جن کی مزاولت و ممارست اس کے نقصوں کو دور کرے اور خود اس کی ذات میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے جو کمال تک پہنچانے والا ہو۔ جس کو یہ دونوں باتیں اچھی طرح حاصل ہوں وہ حکیم کہلاتا ہے۔ اور اس کا رتبہ دوسرے انسانوں سے زیادہ بلند اور زیادہ اعلیٰ ہوتا ہے۔ پس حکمت نہ صرف علم ہی ہے بلکہ عمل پر بھی شامل ہے۔ کیونکہ اگر صرف علم ہی ہو اور اس کے ساتھ عمل نہ ہو تو وہ انسان کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ کتابیں الماری میں رکھی رہتی ہیں لیکن الماری کو اس سے کیا فائدہ ہے؟ اسی طرح مضامین حافظے میں موجود ہوں لیکن ان پر کاربند نہ ہو تو انسان کو اس سے کیا نفع حاصل ہوسکتا ہے! ہاں جب علم و عمل دونوں ہوں تو حکمت پوری ہوگی۔ اور انسان اپنے رتبے اور شرافت میں مرتبہ مرتبہ ترقی کرتا جائے گا۔ وہ علم جو انسان کو یہ سکھلائے کہ اس کو اپنے ارادے۔ حرکات۔ اور افعال میں کن کن مصالح کو ملحوظ رکھنا چاہئے تاکہ امور معاش و معاد کا انتظام درست ہو۔ اور اس کے نفس میں وہ قوت

پیدا ہو کہ وہ کمال کی طرف ترقی کرنے لگے حکمت عملی کہلاتا ہے۔

انسان سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ یا تو ان طبعی قوتوں کے سبب سے ہوتے ہیں جو فطرت نے تمام انسانوں میں یکساں پیدا کی ہیں۔ مثلاً تمام انسانوں میں یہ خاصیت مشترک ہے کہ وہ مل کر رہیں دوسروں سے نفع حاصل کریں۔ اپنی مضرتوں کو دور کریں وغیرہ۔ اس لئے تمام لوگوں سے جو ایسے افعال صادر ہوں کہ اصلی تحریکوں کے سبب سے وقوع میں آئے ہوں وہ قریب قریب یکساں ہوتے ہیں۔ اور ان کی اصلاح کے لئے ایک سے اصول مقرر کئے جا سکتے ہیں لیکن بعض باتیں وضعی ہوتی ہیں مثلاً آداب اور رسم و رواج قانون وغیرہ یہ مختلف ممالک میں مختلف مصالح کے سبب مختلف ہوتے ہیں اور ان کے لئے ایک قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ خود اس ملک کے حکما، اپنے تجربے اور سمجھ سے حسب اقتضائے ضرورت و مصلحت مقرر کرتے یا اس میں اصلاح کرتے ہیں۔

اصول اخلاق کے لحاظ سے انسان کی حرکات طبعی اور وضعی تین قسم کی ہوتی ہیں۔ اوّل تو وہ جس کا اثر صرف انسان کی ذات پر پڑتا ہے یا جو افراد انسان سے متعلق ہوں اس کے علم کا نام تہذیب اخلاق یا تہذیب نفس ہے۔ دوسرے وہ جو گھر بار سے متعلق ہوں اور ان کا اثر ان لوگوں میں مشترک ہو جو ایک گھر کے ممبر ہیں مثلاً میاں۔ بی بی۔ اولاد۔ بھائی۔ بہن۔ ماں۔ باپ۔ قریبی رشتہ دار وغیرہ تدبیر منزل کہلاتا ہے۔ تیسرے وہ جن کا تعلق اتنا وسیع ہوتا ہے کہ شہر و ملک و قوم کے افراد تک پہنچتا ہے یہ سیاست مُدن کہلاتا ہے۔ حکمت عملی وہ اصول و قاعدے سکھاتی ہے جو تہذیب نفس۔ تدبیر منزل اور سیاست مُدن میں بکار آمد ہوں۔ اور انسان نہ صرف فضیلت و سعادت کے معنی سے واقف ہو جائے بلکہ اس میں یہ تحریک پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے نفس میں ان صفتوں کے پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اپنے نفس پر

اس قدر قدرت حاصل کرے کہ رذائل سے بچ سکے۔ نیز لوگوں میں عدالت قائم ہو اور وہ صراط مستقیم سے نہ بھٹکیں بلکہ فرداً فرداً اور مجتمعاً ان میں خیر و کمال پیدا ہو۔

موجودات عالم میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا کمال فطرتی ہے اور ان میں تغیر و تبدل واقع نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آفتاب و ماہتاب۔ زمین اور تمام اجرام فلکی وغیرہ کہ جب سے ہیں اور جب تک رہیں گے ایسے ہی رہیں گے۔ بعض ایسے ہیں کہ ان میں بہ تدریج کمال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں خود شے کے ارادے کو دخل نہیں۔ مثلاً درخت کہ رفتہ رفتہ بڑھتے ہیں لیکن ان کی حرکت ارادی نہیں ہے۔ بعض ایسی چیزیں ہیں کہ جب ایک حد معین پر پہنچ جائیں تو پھر اُس سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتیں۔ اور ان کے تمام افراد کا کمال یکساں ہوتا ہے۔ مثلاً حیوانات کہ ایک نوع کے سب جانور شعور و فہم میں برابر ہیں۔ بیا اپنا گھونسلا بہت خوبصورت بناتا ہے لیکن اس سے زیادہ عمدہ نہیں بنا سکتا۔ نہ یہ اس کے امکان میں ہے کہ مختلف قسم کا بنائے۔ بطخیں پانی میں تیرتی ہیں۔ لیکن یہ صفت فطرتی ہے نہ اکتسابی۔ اسی طرح حیوانات کے کمال میں بھی ان کے حرکات ارادی کو دخل نہیں۔ اور اسی لئے حیوانات میں کوئی شریف اور کوئی رذیل نہیں ہے۔ انسان ہی ایک ایسا مخلوق ہے کہ اس کو کوئی کمال حاصل کرنے کے لئے خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر نہ کرے تو اس میں اُتنا کمال پیدا نہیں ہو سکتا جتنا حیوانات کو حاصل ہے۔ بطخیں تیرتی ہیں لیکن انسان جب تک نہ سیکھے نہیں تیر سکتا۔ پرندے اپنا آشیانہ بنا لیتے ہیں مگر انسان بغیر سیکھے اپنے رہنے کا مکان نہیں بنا سکتا۔ تمام جانور اپنی خوراک مہیا پاتے ہیں۔ انسان کو ان کے لئے خود تردد کرنا ضرور ہے۔ یہی حال اس کے اخلاق کا ہے کہ بغیر اکتساب کے ملکات شریفہ پیدا نہیں ہو سکتے۔ غرض جب وہ پیدا ہوتا ہے تو بہائم سے کم ہوتا ہے اور خود اپنی سعی و کوشش سے وہ رتبہ حاصل کرتا ہے کہ عالم کی تمام مخلوقات

سے اشرف و اعلیٰ بن جاتا ہے۔ اور جو ذریعہ اس کو یہ رتبہ بخشتا ہے وہ حکمت عملی ہے۔
علم حکمت عملی تمام علوم میں زیادہ شریف اور زیادہ ضروری ہے۔ اور صرف یہی ایک ایسا علم ہے جو تمام افراد انسان کے لئے یکساں مفید اور سب کو حاصل کرنا فرض ہے۔ علم حکمت عملی طب روحانی ہے کیونکہ اس کے جاننے سے نفس میں وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو اعتدال خلقی کی حفاظت کرتی ہے۔ اور خواہشات ردیہ جو روحانی امراض ہیں دفع ہوتے ہیں۔
علوم کی شرافت تین طرح پر ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کا موضوع شریف ہو مثلاً علم طب۔ علم بیطاری سے زیادہ شریف ہے کہ طب انسان کے علاج کے لئے ہے اور بیطاری حیوانات کے لئے۔ یا اُس علم کا فائدہ اور منفعت بہت زیادہ ہو۔ جیسے علم حساب یا فلاحت۔ یا اس کے دلائل اور براہین قوی ہوں جیسے علم منطق و علم ہندسہ۔ اس علم میں تینوں صفتیں موجود ہیں۔ اس کا موضوع نفس انسان ہے کہ اس سے بہتر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اس کی منفعت یہ ہے کہ جو چیز بہائم سے کم ہو اس کو ملائک سے افضل و برتر اور تمام کائنات میں برگزیدہ بنا دے۔ اور یہی حال برہان و حجت کا ہے کہ اس کے مسائل کی صحت تجربے سے ثابت اور دلائل عقلی سے متحقق ہے۔ لہذا سب سے پہلے علم اخلاق حاصل کرنا چاہئے۔ جسم انسان اگر اخلاط فاسدہ سے پاک نہ ہو تو جس قدر اس کو غذا دی جائے زیادہ مریض ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح جب تک نفس سے ردی ملکات دور نہ ہو جائیں سائنس اور فلسفہ مفید نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات کبر و نخوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور الحاد و بے دینی میں پڑ جاتا ہے اور اگرچہ بعض اشخاص کو کسی سائنس میں ید طولےٰ حاصل ہو لیکن ان کی روح ضلالت سے نہیں نکلتی۔ نہ وہ ابنائے جنس کے ساتھ عدالت سے پیش آتے ہیں۔
حکمت عملی کا منشاء یہ ہے کہ نفس میں ایسے ملکات راسخ ہو جائیں کہ بے تکلف افعال

محمود انسان سے سرزد ہونے لگیں اور یہ بات تعلیم اور عادت سے حاصل ہو سکتی ہے
لوگوں کے مزاج مختلف واقع ہوئے ہیں۔ بعض آسانی سے نیک بات قبول کر لیتے ہیں
بعض بہ دشواری۔ بعضوں کی طبیعت خیر کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔ بعضوں کی کم
اور بعضوں کی بالکل نہیں۔ لیکن ایسے لوگ جن کے اخلاق ذمیمہ میں تغیر پیدا ہونا ممکن ہی
نہ ہو بہت کم ہیں۔ زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں کہ انکے اخلاق میں کوئی نقص اس سبب
سے رہ گیا یا جڑ پکڑ گیا ہے کہ بُری تعلیم یا بری صحبت یا عدم توجہ نے ان کو اصلاح کی
طرف مائل نہیں کیا یا اخلاق ذمیمہ کی مدتوں کی مزاولت کے سبب ان کی طبیعت میں وہ
بُرا ملکہ مستحکم ہو گیا کہ اب چھڑانا ممکن نہیں۔ ورنہ انسان تو انسان مناسب وقت پر اگر
حیوانات کو تعلیم دی جائے تو وہ بھی بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ اور بہیمی خصائل بدل جاتے
ہیں۔ کتا اور گھوڑا تو بہت تربیت پذیر جانور ہیں۔ ہاتھی باوجودیکہ مدتوں جنگل میں وحشیانہ
زندگی بسر کرتا ہے جب انسانی تعلیم سے مُشرف ہوتا ہے تو کیسا مطیع فرماں بردار مہذب
ہو جاتا ہے۔ وہ خونخوار جانور جن کی آواز کی گونجیں دل ہلا دیتی ہیں تربیت سے ایسے
مہذب ہو جاتے ہیں کہ سرکس میں انسان کے ساتھ تماشے کرتے ہیں۔ وہ۔ شیر۔ چیتے
اور ریچھ جو انسان کے خون کے پیاسے ہیں اسی کا حکم مانتے ہیں اور ذرا آزار نہیں
پہنچاتے۔ انسان قوت عقل و تمیز ادراک و فہم میں تمام حیوانات سے ممتاز ہے تو تربیت
کا اس میں اثر کرنا بالاَولیٰ ممکن ہے۔ اور اگر وہ عادت ڈالے تو اپنے نفس کو قابو میں
رکھ سکتا ہے۔ انسان سے جو افعال خواہ اچھے ہوں یا برے بہ سہولت اور بلا تامل صادر ہوتے
یا ہو سکتے ہیں۔ وہ خُلق کہلاتے ہیں۔ اور یہ کیفیت دو طرح پیدا ہوتی ہے۔ یا تو خلقتاً یعنی
کسی شخص کا مزاج فطرتاً ایسا واقع ہوا ہو کہ کوئی خاص استعداد اس میں زیادہ ہو۔ اور
اس حالت میں ذرا سے اشارے اور تحریک سے انسان سے ایسے افعال صادر ہونے لگتے
ہیں جن کی اس کی طبیعت مقتضی ہو یہ خلق طبعی کہلاتا ہے۔ دوسری چیز عادت

ہے جو کوئی ملکہ پیدا کر سکتی ہے اور اس کو بھی انسان کے اخلاق میں بہت بڑا دخل ہے۔ عادت یہ ہے کہ انسان کسی فعل کی مزاولت کرے۔ یہاں تک کہ اتنی مشق بڑھ جائے کہ پھر اس کام کے کرنے میں دقت نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص جس سے کبھی شجاعت ظاہر نہیں ہوئی۔ اور جو دشمن کے مقابلے میں جاتا ہوا ہچکچاتا تھا دل کو مضبوط کر کے لڑائی میں شریک ہو اور اپنی فوج کے سپاہیوں کو داد شجاعت دیتے دیکھے اس طرح بار بار شریک ہونے اور مستعدی ظاہر کرنے سے اس کی طبیعت میں بھی شجاعت کا ملکہ پیدا ہو جائے یا کوئی شخص جو بے رحم آدمی نہیں تھا قزاقوں کے فرقے میں شریک ہو جائے تو اگرچہ اول اول اس سے مشکل سے خونریزی ہوگی لیکن پھر بے گناہ کے قتل کے ارتکاب میں ذرا بھی باک نہ ہوگا۔ یہ ملکہ جو مشق و عادت سے پیدا ہو خلق کسبی کہلاتا ہے۔ اور اسی کو اچھی طرح کام میں لانے اور اوصاف حمیدہ کی عادت ڈالنے سے انسان کے مدارج بڑھتے ہیں۔ اور وہ رتبہ انسانیت تک پہنچتا ہے۔ یہ آنکھوں دیکھی باتیں ہیں کہ لڑکے نیک آدمیوں کی صحبت میں عموماً نیک و صالح اور شریروں کی مجالست سے رذیل و شریر ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے اخلاق میں بیّن تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر تغیر اخلاق ممکن نہ ہو تو قدرت نے جو قوت تمیز و فکر عطا فرمائی ہے۔ بے فائدہ اور تعلیم و تادیب بالکل بے اثر ہو جائیں۔ قانون۔ قاعدے۔ شرع۔ دینیات محض عبث اور لاحاصل ہو۔ مرض علاج پذیر بھی ہوتے ہیں اور لاعلاج بھی۔ انسان کے جسم میں مرض پیدا ہوتے اور طبیعت ان کے دفع کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے لیکن اس کو مدد دینے اور ازالۂ مرض کے لئے علم طب کی ضرورت ہے۔ اگر کسی شخص کا کوئی مرض دفع نہ ہو تو علم کا ابطال یا عدم ضرورت ثابت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر کوئی برا خلق کسی شخص میں سے نہ جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ تغیر اخلاق ممکن نہیں۔ اور تمام انسانوں میں اخلاق ذمیمہ کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ علم اخلاق کی ضرورت

اور فائدے ویسے ہی قائم رہیں گے جیسے علم طب کے۔

وہ انسان نہایت برگزیدہ صالح اور سعید ہے جس نے نیک کاموں کی مزاولت اور ممارست سے اخلاق حسنہ کا ملکہ طبیعت میں پیدا کیا ہو۔ اور جس نے اپنے قوائے غضبی اور شہوانی کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا اور اپنی طبیعت کی باگیں خواہشات ذمیمہ کے ہاتھوں میں دے کر خصائل رذیّہ اختیار کئے وہ سب سے برا شخص ہے۔ اور یہ ملکات جب راسخ ہو جاتے ہیں تو انسان کو ایسا سخت جکڑ لیتے ہیں جیسے آہنی زنجیریں قیدی کو۔ انسان صرف اپنی ہی کوشش اپنی ہی سعی اور اپنی ہی مرضی سے کسی اعلیٰ مقصد حاصل کرنے کی خواہش کو دل میں راسخ کر سکتا ہے اور یہی طلب صادق ہے اگر وہ دنیا میں صداقت کے ممبر پر سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے تو خود اپنی ہی کوشش سے دوسرے کے سہارے سے وہ ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ انسان اپنا اور اپنے افعال کا حاکم اور مختار ہے۔ وہ کذب چھوڑ کر راست گفتاری۔ شہوت پرستی چھوڑ کر زہد و پرہیزگاری۔ جور و تعدّی چھوڑ کر انصاف و رحم اختیار کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح تمام فضائل حمیدہ اپنے نفس کو قابو میں کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جو لوگ قوائے جسمانی کو کام میں نہیں لاتے۔ اور کسی قسم کی ورزش نہیں کرتے اُن کے جسم بھدّے اور اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ وہ محنت اور زور کے کام نہیں کر سکتے۔ یہی حال قوائے روحانی کا ہے کہ جو لوگ ان کو معطل چھوڑ دیتے ہیں ان سے افعال محمود صادر نہیں ہوتے۔ نہ ان کو اپنے نفس پر اتنی قدرت حاصل ہوتی ہے کہ ممنوعات اور قبیح باتوں سے پرہیز کریں۔ اگر کوئی نظم حفظ یاد کریں اور کبھی کبھی اسے پڑھتے نہ رہیں تو بھول جاتے ہیں۔ اصول اخلاق کی طرف سے بھی اگر غفلت کی جائے اور ان کو یاد نہ رکھا جائے۔ تو ایک بار کتاب کا پڑھ لینا کافی نہیں۔ اور نہ صرف مطالعے سے بلکہ عملاً ان کی اتنی ممارست رکھنی چاہئے کہ جو خواہش نفس میں نیک باتوں کی پیدا ہوئی تھی وہ نہ مٹ جائے۔ اور نیک کام نہ بہ تکلف بلکہ عادتاً و تودع

میں آنے لگیں۔ اور اسی واسطے مبدا فیاض سے انسان کو عقل عطا ہوئی ہے کہ بھلے برے کو سوچے اور بھلائیوں پر اس طرح عمل کرے کہ وہ مثل طبیعت کے بن جائیں۔

(مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی۔ از حکمت علی)

عقل عملی کیا چیز ہے؟

دنیا کی ساخت اور انسان کی خلقت کو بغور دیکھنے سے یہ قضیہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نیک و بد راستے کا اختیار کرنا انسان کی مرضی اور انتخاب پر محوّل ہے۔ انسان دنیا میں اس طرح نہیں بھیجا گیا جیسے کہ ایک سمندر میں کوئی تنکا پڑا ہو کہ پانی کی لہریں جہاں چاہیں اُسے بہالیجائیں۔ بلکہ وہ دنیا کے سمندر میں ایک ماہر تیراک کی طرح تیرتا ہے اور اپنی سعی سے جس طرف چاہتا ہے جاتا ہے۔ پانی کی لہریں اس کی مزاحمت کرتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ان کا مقابلہ کرسکتا ہے اور جدھر دل میں آتا ہے اُدھر اپنا رُخ رکھتا ہے۔ وہ فی حدّ ذاتہٖ اپنے اعمال و افعال میں مختار ہے اور اُسے آزادی دی گئی ہے کہ جو قوتیں اُسے عطا ہوئی ہیں ان کو کام میں لائے۔ اور اسی سبب سے وہ اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جو لوگ جاہل بدکار بدسلیقہ تھے اگر کسی سبب سے اپنی برائیوں پر مطلع ہو گئے اور تلافی مافات کی کوشش کی تو عالم نیک کردار اور ہنرمند بن گئے۔ انسان ایک فعل کا خوگر ہوتا ہے اور جب اس کے خلاف قانون جاری کر دیا جائے تو اس سے پرہیز کرتا ہے۔ اسی طرح اسے اختیار ہے کہ وہ شرع اور اخلاق کے قانون کو مانے اور اس پر عمل کرے۔ خود انسان کا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ میں آزاد اور مختار ہوں۔ عادت اور خواہش اس پر قادر نہیں۔ بلکہ اس کی محکوم ہیں۔ بشرطیکہ وہ ان کو قابو میں رکھنا چاہے۔ اگر کوئی شخص خود ہی اپنی باگ خصائل ردّیہ کے ہاتھ میں دے دے تو خود اس کا قصور ہے۔ بلکہ جب انسان کسی بُرے امر کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے تو کانشنس (نفس لوّامہ

اس کو روکتا ہے۔ اور بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بچنا اختیار میں نہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ طبیعت میں امور ذمیمہ سے بچنے کا تقاضا ہو۔ بلکہ طبیعت انسانی خود جانتی ہے کہ اس میں بچنے کی قدرت ہے۔ اور اگر انسان آنکھ بند کرکے خود کنوئیں میں گر پڑے تو آپ ہی ذمہ دار ہوگا۔

اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے بہت سے لوگ اپنے اعمال کی اس غرض سے تنقیح کیا کرتے ہیں کہ اپنے صحیح اوصاف سے آگہی ہو اور اس سے خود ان کے نفس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اپنی تصویر کے صرف ایک ہی پہلو کو دیکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خود بیں خود پسند ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بہ نظر اصلاح دیکھے تو اُسے اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنے عیوب بھی نظر آئیں گے۔ اور اپنی ساری اچھی بری حقیقت آئینہ ہو جائے گی۔ اور پھر اس حالت میں وہ اپنے نفس کی اصلاح اور اپنے افعال کا انتظام کر سکے گا۔ وہ صاحب نظر جو اپنے عیوب کی خود خبر رکھتے ہیں اپنے تئیں ایسے سانچے میں ڈھالتے ہیں کہ دوسروں کو نکتہ چینی کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اپنے افعال و اعمال کی خود اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو اپنے حال پر غور و فکر کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ لیکن ابتدائی حالت میں یہ کیفیت ایسی کافی نہیں ہوتی کہ انسان اسی پر اکتفا کرے اور نہ اس سے اس قدر فائدہ پہنچتا ہے۔ جتنا پہنچنا چاہئے۔ اپنے کسی فعل کی اصلاح کا خیال کرنے کے لئے بھی ابتدا میں بہت بڑے عزم اور بہت بڑی جرات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس قدر اس میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے اس کی نسبت فائدہ کم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فائدہ ہونا ضرور ہے۔ مستقل مزاج آدمی جو اپنی دھن کے پورے ہوتے ہیں ان تکالیف سے شکستہ خاطر نہیں ہوتے۔ نہ وہ ایسی ادھوری اصلاح پر قناعت کرتے ہیں۔ بلکہ کاسبہ نفس کی عادت کو زیادہ مستحکم اور زیادہ پائدار بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک اپنے نفس کی پوری تفتیش اور پوری درستی نہیں کر لیتے سعی سے باز نہیں رہتے۔ فرض کرو کہ کسی ایسے شخص سے جو اپنے نفس کی اصلاح میں مصروف ہو کوئی لغزش

ہو اور ضمیر اس ناشایستہ حرکت پر اُسے ملامت کرے تو اسے سخت رنج ہوگا۔ اس موقع پر وہ اپنے دل میں مصمم ارادہ کرے گا کہ وہ پھر اس فعل کا مرتکب نہ ہوگا۔ لیکن اپنے نفس کے امتحان کے لئے وہ ایسے موقع کا منتظر رہے گا کہ باوجود نفس شہوانی یا غضبی کی سرکشی کے اپنی طبیعت پر قابو رکھ سکے۔ اور جب کبھی ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی طبیعت کی باگ قوائے شہوانی یا غضبی کے ہاتھ میں دے دے اس وقت اس کی اصلاح کامل سمجھی جائے گی۔ اس وقت انسان کی روحانی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اور اس کا رتبہ اتنا بالا ہو جاتا ہے کہ وہ برائی بھلائی کو اس طرح دیکھ سکتا ہے جیسے بلندی پر سے نیچے کی چیزیں الگ الگ دکھائی دیتی ہیں۔ اور انسان پر تخیلات فاسدہ کا قابو نہیں چل سکتا۔ جب انسان روحانی طاقتوں کو قوت پہنچاتا اور خصائل حمیدہ کی عادت ڈالتا ہے اس وقت وہ ملکات ردیہ کا مقابلہ کرتا اور ان کے دور کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اور جوں جوں فضیلت حاصل ہوتی جاتی ہے اسی قدر رذائل کی بیخ کنی بھی ہوتی جاتی ہے۔ اس وقت انسان کو رذائل سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ اسے تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت تک ایسے بدنما خصائل کا اس پر کیونکر قابو تھا جس قوت کے ذریعے سے انسان کے افعال میں اتنا بڑا تغیر پیدا ہو وہ **عقل عملی** کہلاتی ہے

عقل عملی انسان کو یہ سمجھاتی ہے کہ جو جو وسائل اور اسباب اُسے دنیا میں حاصل ہیں ان سے کوئی کام کس طرح سب سے عمدہ اور بہتر ہو سکتا ہے۔ یہ قوت انسان کی دیگر تمام قوتوں کو مناسب درجے پر رکھتی ہے اور ان میں انتظام اور ترتیب قائم رکھتی ہے۔ یہ قوت انسان کو یہ بتلاتی ہے کہ اس کا درجہ کیا ہے اور وہ دنیا میں کیا کر سکتا ہے؟ عقل عملی انسان کو ان فرائض کے ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے جو اس وقت درپیش ہیں۔ اور اس کی مدد سے انسان خیالی اور وہمی خوش آیندہ حالتوں کا انتظار نہیں کرتا۔ نہ تاسف و حسرت کے عالم میں اپنے زور و قوت کو ضائع کرتا ہے۔ بلکہ حالت موجودہ کو خوشگوار اور

دل پسند بنانے کی سعی کرتا ہے۔ عقلِ عملی کسی خاص قوّت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی مختلف قوتوں کے مل کر کام کرنے کا نام ہے۔

عقلِ عملی کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ راست و غلط میں تمیز کرنا بتاتی ہے۔ اس صورت میں اس کو قوت تمیز بھی کہتے ہیں۔ راست و غلط ایسے دو لفظ ہیں جن کی صحیح صحیح حقیقت معلوم کرنے پر تمام اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔ اگر صحیح و غلط کی تمیز نہ ہوتی تو دیگر حیوانات کی طرح انسان خواہ کچھ ہی کرے اُسے جائز ہوتا اور دنیا میں حسن و قبح بھلائی و برائی نیک نامی و بدنامی ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کے معنی کچھ نہ ہوں۔ لیکن قوت تمیز صحیح غلط جائز و ناجائز میں امتیاز کرنا سکھاتی ہے۔ اور ایک کام کو اختیار کرنے اور دوسرے کو ترک کرنے کا حکم دیتی ہے۔ راست و غلط میں تمیز کرنا اور اصول اخلاق پر کاربند ہونا خود انسان کا کام ہے۔ بعض اوقات طبیعت کے تقاضے مختلف جانب رجحان پیدا کرتے ہیں۔ لیکن جن کے دل نورِ حکمت سے معمور ہیں وہ تمام جذبات کو عقل کا مطیع رکھتے ہیں۔ وہ عادت اور خواہش کے محکوم نہیں ہوتے بلکہ اُن پر حکمرانی کرتے ہیں۔

انسان کی تمام زندگی ایک مدرسہ ہے جس میں وہ ہر روز تجربے کے نئے نئے سبق پڑھتا ہے۔ اس مدرسے کے معلّم گوناگوں افکارات نئے نئے امتحان نئی نئی دقتیں طرح طرح کی تکالیف اور مشکلیں ہیں۔ لیکن یہ صبر و استقلال۔ پرہیزگاری۔ عزیمت تامہ۔ ہمت۔ قناعت۔ اور خدا پرستی سکھاتے ہیں۔ انسان کو اپنی نسبت نہ صرف یہ جاننا چاہئے کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ بھی جاننا چاہئے کہ وہ کیا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سبق کے حاصل کرنے کے لئے انسان کو دنیا میں مختلف لوگوں سے ملنا اور مختلف قابلیت کے آدمیوں کی صحبت سے فائدہ اُٹھانا لازم ہے۔ سوسائٹی میں ملے بغیر انسان کو اپنی قابلیت کا پورا علم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ خود بیں اور خودرائے

رہتا ہے۔ اور اپنی استعداد کے جانچنے میں غلطی کیا کرتا ہے۔ سوسائٹی میں ملنے سے اُس کو بہت سے ایسے تجربے حاصل ہوتے ہیں جو اُس کی عقل کو زیادہ اور اُس کے دماغ کو روشن اُس کی رائے کو مستحکم اُس کی نظر کو بلند کرتے ہیں اور نیک وبد کی وہ تمیز جو عملاً کوئی اچھا کام کرنا سکھاتی ہے ایسے ہی تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ تجربے کے علاوہ علم بھی انسان کے دماغ کو روشن۔ خیالات کو درست۔ رائے کو صائب۔ اور اعتقادات کی اصلاح کرتا اور عقل کو جلا دیتا ہے۔ اور عقل عملی اُس معلومات سے جو تجربے اور علم سے حاصل ہو فائدہ اُٹھاتا اور اُسے کام میں لاتا سکھاتی ہے۔

(مولوی محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی۔ از حکمت عملی)

حصہ نظم

مرزا محمد رفیع سودا

سودا تخلص ۔ مرزا محمد رفیع نام ۔ شہر دہلی کو اُن کے کلام سے فخر تھا ۔ ان کے باپ مرزا محمد شفیع میرزایان کابل سے تھے ۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا ۔ مرزا محمد شفیع بطریق تجارت ہندوستان میں وارد ہوئے ۔ ہند کی خاک نے ایسے قدم پکڑے کہ یہیں رہے ۔

بعض کا قول ہے کہ باپ کی سوداگری سودا کے لئے وجہ تخلص ہوئی ۔ لیکن بات یہ ہے کہ ایشیا کے شاعر ہر ملک میں عشق کا دم بھرتے ہیں ۔ اور سودا اور دیوانگی عشق کی ہمزاد ہیں ۔ اس لئے وہ بھی ان لوگوں کے لئے باعث فخر ہے ۔ چنانچہ اس لحاظ سے سودا تخلص کیا ۔ اور سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت رد کن میں آئی ۔

سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے ۔ دہلی میں پرورش اور تربیت پائی ۔ کابلی دروازے کے علاقے میں ان کا گھر تھا ۔ ایک بڑے پھاٹک میں نشست رہتی تھی ۔ وہ دروازہ تباہی دہلی میں تباہ ہوا ۔

سودا بموجب رسم زمانہ کے اوّل سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے ۔ خان آرزو کے شاگرد نہ تھے ۔ مگر اُن کی صحبت سے فائدے بہت حاصل کئے ۔ چنانچہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے ۔ خان آرزو کی ترغیب سے اردو شعر کہنے لگے ۔ اور طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلی جیسے شہر میں اُن کی اُستادی نے خاص و عام سے اقرار لیا ۔ کہ اُن کے سامنے ہی اُن کی غزلیں گھر گھر اور کوچہ و بازار میں خاص و عام کی زبانوں پر جاری تھیں ۔

جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے۔ اور فرمائشیں کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لئے تقاضا کیا۔ انھوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا۔ پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے۔ دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی ہم تو پاخانے میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ حضور ویسی ہی بو بھی آتی ہے۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا۔ اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ ہم تمھیں ملک الشعرا کر دیں گے۔ یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے۔ کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا۔

مرزا دل شکستہ ہو کر بیٹھ رہے۔ مہربان خاں نسبت خاں وغیرہ امرا در دسا قدر دان موجود تھے۔ کچھ پروا نہ ہوئی۔ نسبت خاں کی تعریف میں مرزا نے ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔

جب ان کے کلام کا شہرہ نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو کمال اشتیاق سے خرچ سفر بھیج کر طلب کیا۔ انھیں دلّی چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ جواب میں فقط اس رباعی پر حسن معذرت کو ختم کیا۔

سوداؔ پئے دنیا تو بہر سو کب تک ۔۔۔ آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے ۔۔۔ بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

کئی برس کے بعد وہ قدر داں مر گئے۔ زمانے بدل گئے۔ سودا بہت گھبرائے۔ ۶۰ یا ۶۶ برس کی عمر میں دلی سے نکل کر چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ وہ بہت اعزاز سے ملے۔ اور اُن کے آنے پر کمال خورسندی ظاہر کی۔ لیکن یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے اتنا کہا کہ مرزا وہ رباعی تمھاری اب تک میرے دل پر نقش ہے اور اس کو مکرر پڑھا۔ انھیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا۔ اور بپاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہاں تک کہ شجاع الدولہ مر گئے۔ آصف الدولہ مسند نشین ہوئے اُن کے دربار میں ان کی رسائی ہوئی۔ علاوہ انعام واکرام کے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ہو گیا۔ جب تک مرزا زندہ رہے۔ نواب مغفرت مآب۔ اور اہل لکھنؤ کی قدر دانی سے ہر طرح فارغ البال رہے تقریباً ۷۰ برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وہیں دنیا سے انتقال کیا۔ شاہ حاتم زندہ تھے۔ سن کر بہت روئے اور کہا کہ افسوس کہ ہمارا پہلوان سخن مر گیا۔

ان کا کلیات جس کو حکیم سید اصلح خاں نے ترتیب دیا تھا ہر جگہ ملتا ہے اور قدر و منزلت کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کلیات کو اگر پُرانے محاوروں سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو سرتاپا نظم اور انشاء اردو کا دستور العمل ہے۔ قصائد، مثنویاں۔ غزلیں رباعیاں۔ مستزاد قطعات۔ تاریخیں۔ پہیلیاں۔ ترجیع بند۔ مخمس۔ سب کچھ کہا ہے۔

قصائد کا اس دھوم دھام سے کہنا۔ اور اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا

ان کا پہلا نمبر ہے۔ ان کے کلام کا زور شور انوری اور خاقانی کو دباتا ہے۔ اور نزاکت مضمون میں عرفی و ظہوری کو شرماتا ہے۔ قصیدے کے لئے شکوہ الفاظ اور بلندی مضامین چستی تراکیب وغیرہ لوازمات سے ہیں۔ وہ ان کے کلام میں موجود ہے۔

مثنویاں ان کی میر تقی میر کی مثنویوں سے لگا نہیں کھاتیں۔

غزلوں کا مجموعہ - یہ اعتبار جوہر کلام کے سرتاپا مرصع ہے۔ بہت سی غزلیں دلچسپ اور دلپسند بحروں میں ہیں کہ اس وقت تک اردو میں نہیں آئی تھیں۔

ان کے کلام پہ عام رائے

کل اہل سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی۔ میر صاحب نے انھیں پورا شاعر مانا ہے۔ ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طمنچے کی چاپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصہ ہے۔ خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے اُن کے یہاں ہیں مگر اُسی قدر جتنا کھانے میں نمک۔

جن لوگوں نے زبان اردو کو پاک صاف کیا ہے۔ مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے کہ کہیں سے جدا نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے اردو زبان کو فارسی محاوروں اور استعاروں سے نہایت زور بخشا ہے۔ انھیں کا زور طبع تھا جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترکیب پا کر تیسری زبان پیدا ہوگئی اور اسے ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ وہی ہندوستان کی زبان ٹھہری جس نے حکام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کیا۔ اسی کی بدولت ہماری زبان فصاحت اور انشا پردازی کا تحفہ لے کر شائستہ زبانوں کے دربار میں عزت کی کرسی پائے گی۔ اہل ہند کو ہمیشہ ان کا ممنون احسان ہونا چاہئے۔ اور ان کی عظمت کرنی چاہئے۔

مرزا خود الفاظ نہایت خوبصورتی سے تراشتے تھے کہ بقبول خاص و عام ہوتے تھے۔ مفصلہ

عاشقانہ خوب لکھتے تھے۔ مگر تصوف جو ایشائی شاعری کی مرغوب نعمت ہے۔ خواجہ میر درد کا حصہ ہے
مرزا قصیدے کے تو بادشاہ ہیں۔ مگر غزل میں میر تقی میر کے برابر سوز و گداز نہیں۔ اس کا سبب
یہ ہے کہ میر صاحب کی طبیعت درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس لئے اُن
کی غزلیں عمدہ ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت ہمہ رنگ و ہمہ گیر۔ ذہن براق اور زبان شاق تھی۔
فکر اور خیال اُن کا جس طرف جاتا رُک نہ سکتا تھا۔ قوت شاعری اُن کی بڑھی ہوئی تھی" طبیعت
ہر وقت شگفتہ رہتی تھی۔ اس لئے ان میں رنج والم۔ درد و محبت کا دلیسا پر اثر مضمون
نہ نکلتا تھا۔

مرزا اور میر کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔ جن سے اُن کا انداز کلام معلوم ہوتا ہے

میر۔ سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
سودا۔ سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت — خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے
میر۔ گلا جس سے کروں تیری بے وفائی کا — جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا
سودا۔ گلا لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا — لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا
میر۔ چمن میں گل نے جو کل دعوی جمال کیا — جمال یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا
سودا۔ برابری کا تری گل نے جب خیال کیا — صبا نے مار تھپیڑا منہ اُس کا لال کیا
میر۔ ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے — ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ
سودا۔ سودا جہاں میں آ کے کوئی کچھ نہ لے گیا — جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لئے

انتخاب از کلیات سودا

قصیدہ در شکایت فلک

سنگ کو اتنے لئے کرتا ہے پانی آسماں — منہ پہ لا دے آرسی تا عیب روئے مرداں
مستعد اتنا ہے یہ افعی گزندِ خلق پہ — پیچ اُس کے چال کا دیکھو تو ہے شکل دہاں
خوان پر اُس رو سیہ کے مت سمجھ تاروں کی نقل — چمکے ہیں تودے میں خاکستر کے یہ چنگاریاں
ختم اُس پہ ہو چکی بدخلقی و بدخصلتی — پھر نہ آیا اس کے گھر اس کا گیا جو میہماں
کام عالم کا بسان جوئے تصویر اُس کے ہاتھ — بند رہتا ہے یہ معنی گو بصورت ہو رواں
کھولتا ہرگز نہیں ہے کار بستہ سے گرہ — تانہ باندھا چاہے محکم کر اُسے یہ بدگماں

تنگی اوقات کرتا ہے نصیبِ حسن و لطف
غنچۂ گل اس سبب سے رنگ و بو کا ہے مکاں

ناتواں کو دے توانائی اگر اُس کی مدد
خار ہو جاویں وہیں زنجیر پائے رہرواں

دیکھ ٹک احوال عنقا کا کہ اس ظالم کے ہاتھ
نام پیدا اگر کرے کوئی تو مٹتا ہے نشاں

درپئے رنج و تعب رہتا ہے اہل درد کے
دکھ دہندوں کی ہوا خواہی میں دے ہے اپنی جاں

یا برہنہ در بدر مجھ کو پھرا دے دھوپ میں
خار کے سر پر کرے دامان گل کا سائباں

میل کھینچے دیدۂ بینا میں یہ باریک عقل
پر کرے کحل الجواہر لے کے چشم سرمہ داں

ابر دریا بار کو برسا دے دشت یاس پہ یہ
مشک رکھے مزرع امید ہر پیر و جواں

مینس کو موتی چگاتا ہے سدا بے تمیز
پشت کھینچے ہے ہما کا دے کے مشت استخواں

رشتہ کے خاطر کرے سوراخ گوہر کا جگر
بہر سود ناکساں اس سے کساں کا ہے زیاں

گر اسے منظور ہو تن کے کسی کی پرورش
فائدہ اُس کو نہیں کچھ بلکہ ہے نقصان جاں

چشم مطلب ہوئے روشن دیکھ کر قصاب کو
فربہی سے پر اگر ہو جاوے نخل پہلواں

دور میں اس رو سیہ کے اب بجز بخل و حسد
دوستی کا تو نہیں ہرگز کہیں نام و نشاں

نور منہ پر شمع کے دیکھے تو جلتا ہے پتنگ
دشمنی معشوق و عاشق تک ہے اتنی درمیاں

ہاتھ سے خست کے اُس کے جگ میں ہیں خاص و عام
حال روشن دل کرے اب مطلع ثانی بیاں

ماہ کے خاطر مقرر وقت شب ہے ایک نان
پھر جو یہ چاہے سدا سارے وہ ہوئے سو کہاں

اک لب ناں کے لئے حیران ہوتے شہر شہر
مثل ماہ نو پڑے پھرتے ہیں عالی ہمتاں

کیا کروں اس کی طبیعت کے تلون کو میں نقل
کیا کر دل پیر تنگی گردش کا اپنا سکے بیاں

آن میں اوج حسب کو پہنچے مجہول النسب
خاک ذلت پر کرے پل میں فلاں ابن فلاں

چتر ہوتا کاسۂ فقر اکثر آیا ہے نظر
بارہا تختے پہ دیکھا صاحب تخت رواں

تا کجا کہئے غرض اس سفلۂ دوں کے مزاج
اک وتیرے پر نہیں گا ہے چنیں گاہے چناں

قصیدہ در شکایت زمانہ

سوائے خاک نہ کھینچوں گا منتِ دستار ‏ — ‏ کہ سرنوشت لکھی ہے مری بہ خطِ غبار
چمن زمانے کا شبنم سے بھی رہے محروم ‏ — ‏ اگر نہ رو دے مرے روزگار پہ شب تار
کرے دل ہوں تیز میں دندان اشتہا ہر صبح ‏ — ‏ زمانہ سنگ ملامت سے توڑتا ہے نہار
عجب نہیں ہے کہ جاتی رہی ہو دنیا سے ‏ — ‏ زبس خوشی نے مرے دل سے اب کیا ہے کنار
شراب خون جگر ہے مجھے گزک دل خویش ‏ — ‏ صدائے نالۂ دل ہے مجھے ترانۂ یار
رہے نہ شیشہ و صحبت کے بیچ کیفیت ‏ — ‏ نت اُٹھ کے سنگ سے اس سر کا توڑتا ہے خمار
زمانہ دل کو مرے اور عہد یار تو اب ‏ — ‏ شکست سے نہیں دیتا ہے ایک آن قرار
زبس کہ دل ہے مکدر مرا زمانے سے ‏ — ‏ بجائے اشک میں آنکھوں سے پوچھتا ہوں غبار
کہاں تلک وہ کرے روزگار کا شکوہ ‏ — ‏ کہ جس کے بخت کی سوگند کھائے ہے ادبار
دلا تو اپنے غم دل کو اب غنیمت جان ‏ — ‏ بدل خوشی سے اسے دور میں نہ کر زنہار
کسو ہی سے غم دل یوں لے گیا دوراں ‏ — ‏ کہ شادی مرگ کیا ہو نہ اُس کو آخر کار
جو گوش ہوش تو رکھتا ہے تو برابر ہے ‏ — ‏ صدائے نغمہ داؤد و نالۂ دل زار
تو سادہ لوحی سے اے دل جہاں کی ہے کج فہم ‏ — ‏ کرے ہے راستی اپنی سے ہر زباں گفتار
میں حرف حق کو سنا ہے زبانی منصور ‏ — ‏ کہ راست گو کو زمانے میں کھینچتے ہیں دار

غزلیات

۱

بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا ‏ — ‏ ہم نے اُسے ہر خار بیابان میں دیکھا
روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا ‏ — ‏ جس نور کو تو نے مہ کنعان میں دیکھا
برہم کرے جمعیت کونین جو پل میں ‏ — ‏ لٹکا وہ تری زلف پریشان میں دیکھا
واعظ تو سنے بولے ہے جس روز کی باتیں ‏ — ‏ اُس روز کو ہم نے شب ہجران میں دیکھا
اے زخم جگر سودۂ الماس سے خو کر ‏ — ‏ کتنا وہ مزا تھا جو نمکدان میں دیکھا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ کیا جانئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

۲

پایا وہ ہم اس باغ میں جو کام نہ آیا کچھ اپنے لئے جز ثمر خام نہ آیا

اے زمزمہ پرداز چمن نالہ ہمارا وہ مرغ نہ سمجھے جو تہ دام نہ آیا

گو شکل کماں خانۂ گردوں ہے منقش پر اس میں نظر گوشۂ آرام نہ آیا

آراستہ جو بزم ہوئی دور فلک میں واں جام بجز گردش ایام آیا

بستاں تو پُر از میوۂ اقسام ہے لیکن سائے میں کسو نخل کے آرام نہ آیا

ہر رنگ تماشا ہے جہاں صورت خورشید جو صبح کو دیکھا وہ نظر شام نہ آیا

آفات ہی اے چرخ اٹھا جاتی ہے تو نے ظالم کسی گرنے کو تجھے تھام نہ آیا

یوں منہ نہ دھوائے صبح کہ آگے مرے سودا جوں لالہ پر از خون جگر جام نہ آیا

۳

نہ بار خاطر یہ دل ہے گُل کا نہ ناز بردار گلستاں کا بسان شبنم ہے خود سبک بار سیر فرمائے لامکاں کا

ہزار آب حیات چھڑکیں مسیح اور خضر لب کے لیکن اُٹھے نہ محشر تلک بھی بیمار شہید تیرے لب دہاں کا

چمن پر ابر بہارے اب شراب ٹپکے تو کیا عجب ہے ہوا ہے رندانہ قبول ساقی حباب عالی ہیں مے کشاں کا

برنگ شبنم یہ آب ودانہ عبث ہے کرنا یہ ناز تجھ کو نہ خرمن گل رہے چمن میں نہ رخت واسباب باغباں کا

کرے ہے کیوں سودا دل پریشاں عبث بھی تو اہل جہاں سے خیال زلف دراز گویا تلاش ہے عمر جاوداں کا

۴

اے گُل صبا کی طرح پھرے اس چمن میں ہم پائی نہ بو وفا کی ترے پیرہن میں ہم

شیشے کی طرح دل کے تئیں رو کے تا سحر خالی کریں ہیں بیٹھ تری انجمن میں ہم

فانوس بیچ شمع جلے جس طرح ہنوز جلتے ہیں تیرے ہجر سے ظالم کفن میں ہم

سودا نہ تن ہمارے سے شعلہ اُٹھا کبھو بھٹی کی طرح جل گئے کچھ من ہی من میں ہم

۵

تو کیوں جلتی رہی بلبل چمن میں دیکھ کر شبنم
کہ وہ داماں پاکِ گل جسے کرتی ہے تر شبنم

نہ دیکھا اس سوا کچھ لطف اے صبح چمن تیرا
گل ادھر لے گئے گل چیں گئی روتی اُدھر شبنم

بھلا گل تو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر
بتا روتی ہے کس کی ہستی موہوم پر شبنم

کہا بلبل سے میں گلشن میں کچھ تجھ کو بھی اے ناداں
خبر ہے اس کی یاں کرتی ہے کیوں اتنا گذر شبنم

چمن میں وقت رخصت صبح کو میں کیا کہوں تجھ سے
روئی ہر گل کی چھاتی سے لپٹ کر کس قدر شبنم

پس ان باتوں سے یہ روشن ہے بیش دیدۂ بینا
رکھے ہے عشق کی محبوب پر تیرے نظر شبنم

بچے وضع جہاں اس رشک سے محفوظ رکھتا ہے
بہار آخر ہے اک پل میں کہاں پھر گل کدھر شبنم

ترے آگے اُسے خورشید کا منہ خوش نہیں آتا
چمن سے ورنہ کیوں جاتی رہی وقت سحر شبنم

۶

بلبل تصویر ہوں جوں نقش دیوار چمن
نے قفس کے کام کا ہرگز نہ درکار چمن

کیا گلا صیاد سے ہم کو یوں ہی گذری ہے عمر
اب اسیر دام ہیں تب تھے گرفتار چمن

نوک سے کانٹوں کی ٹپکے ہے لہو اے باغباں
کس دل آزردہ کے دامن کش ہیں یہ خار چمن

زخم پر ہر گل کے چھڑکے صبح محشر کا نمک
سیکھ لے گر ہم سے رونا شبنم زار چمن

لخت دل گرتے خزاں میں جائے برگ اے عندلیب
ہم اگر ہوتے تری جا گہ گرفتار چمن

فصل گل جاتی ہے سودا دیکھ لے نرگس کی طرح
باغ میں مہماں کوئی دن ہے یہ بیمار چمن

۷

ہر ایک شے میں سمجھ تو ظہور کس کا ہے
شرر میں روشنی شعلے میں نور کس کا ہے

دماغ میں پر انہ کبر ہے۔ میں حیراں ہوں
یہ مشت خاک میں اتنا غرور کس کا ہے

یہ سمجھ میں کہ تو خالق ہے اور ہم مخلوق
ترے گناہ سمجھنا شعور کس کا ہے

جہاں کی بزم سے یار و کسی کا اُٹھ جانا
یہ کون جانے کہ نزدیک دور کس کا ہے

کے ہے تند بظاہر تجھے ابھی سودا ترا سا مرتبہ اُس کے حضور کس کا ہے

۸

توہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی
دیوانہ کون گل ہے ترا جس کو باغ میں زنجیر کرنے موجِ نسیمِ سحر گئی
کیجو اثر قبول کہ تجھ تک ہماری آہ سینے سے ارمغاں لئے لختِ جگر گئی
خانہ خراب دل تو ہے لیکن میں کیا کروں جیسی بلائے جان ہے یہ آنکھ گھر گئی
ظالم کمر و رنگل کا گریباں ہوا ہے چاک اک عندلیب گر اجل اپنے سے مر گئی
پروانہ کون سا نہ جلا شام کو شمع رونق ہوئی نہ بزم سے وقتِ سحر گئی

۹

گل پھینکے ہیں عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی
اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی
کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی
تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

۱۰

اس دل کی تف آہ سے کب شعلہ بر آوے بجلی کو دم سرد سے جس کی حذر آوے
سینوں کو دلوں سے تو خالی کر اب اتنا ڈرتا ہوں نہ چھاتی کسی بے دل کی بھر آوے
ظالم کر اب انصاف کہ سینے میں کہاں سے ہر دم کے لہو پینے کو تازہ جگر آوے
کیا ہو جو قفس تک مرے اب صحنِ چمن سے دو برگ لئے گُل کے نسیمِ سحر آوے
سب کام نکلتے ہیں فلک تجھ سے یہ لیکن میرے دلِ ناشاد کی امید بر آوے

خواجہ میر درد

درد تخلص۔ خواجہ میر نام۔ زبانِ اردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن ہیں۔ خواجہ محمد ناصر

عندلیب تخلص ان کے باپ تھے۔ اور شاہ گلشن صاحب سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ خاندان ان کا دلی میں بہ سبب پیری و مریدی کے غایت معزز اور معظم تھا۔ علوم رسمی سے آگاہ تھے۔ سلطنت کی تباہی سے اکثر امرا و شرفا شہر اور گھر چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے۔ مگر ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ آئی۔ اپنے اللہ پر توکل رکھا۔ اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اُسی پر بیٹھے رہے۔ جیسی نیت ویسی برکت۔ خدا نے نباہ دیا۔

دیوان اردو ان کا مختصر ہے۔ سوا غزلیات اور ترجیع بند اور رباعیوں کے اور کچھ نہیں۔ قصائد و مثنوی وغیرہ کہ عادت شعرا کی ہے۔ اُنھوں نے نہیں کہی۔ باوجود اس کے سودا اور میر تقی کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں۔ ہرگز ان سے کم نہیں۔

تصنیف کا شوق اُن کی طبیعت میں خداداد تھا۔ تصوف میں آپ کی تصنیفات کثرت ہیں۔ مثلاً اسرار الصلاۃ۔ واردات درد۔ نالۂ درد۔ آہ سرد۔ درد دل۔ سوز دل۔ شمع محفل وغیرہ جنھیں شائقین علم تصوف عظمت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

آپ کی غزلیں ۷۔ ۹ شعر کی ہوتی ہیں۔ مگر انتخاب ہوتی ہیں۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے۔ گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات اُن کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا اُنھوں نے کہا۔ اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔ میر۔ میرا کی زبان اور ان کی زبان ایک ہے۔ نت۔ ٹک۔ تئیں۔ ایدھر۔ کیدھر جیدھر وغیرہ ان کی زبان میں موجود ہیں۔

دنیا کے مال اور عزت و جاہ کی طرف آپ کو مطلق توجہ نہ ہوئی۔ شاہ عالم بادشاہ نے آپ کے یہاں آنا چاہا۔ آپ نے قبول نہ کیا۔ مگر ہر ماہ میں اہل تصوف کا ایک معمولی جلسہ ہوتا تھا۔ اس میں بادشاہ بے اطلاع چلے آئے۔ اتفاق سے اُس دن بادشاہ کے پاؤں میں درد تھا۔ اس لئے پاؤں پھیلا دیا۔ انھوں نے کہا یہ امر فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عذر کیا کہ معاف کیجئے۔ عارضے سے معذور ہوں۔ انھوں نے کہا کہ عارضہ تھا تو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی۔

خواجہ صاحب ۲۴ صفر یوم جمعہ ۱۱۹۹ھ ۶۸ برس کی عمر میں شہر دہلی میں فوت ہوئے۔ کسی مرید با اعتقاد نے تاریخ کہی۔ ع۔

اے دنیا سے سدھارا وہ پیارا محبوب

غزلیات

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا / اعیان ہیں مظاہر ظاہر ظہور تیرا
یا افتقار کا تو امکاں سبب ہوا ہے / ہم ہوں نہ ہوں ولے ہے ہونا ضرور تیرا
باہر نہ آسکی تو قید خودی سے اپنی / اے عقل بے حقیقت دیکھا شعور تیرا
ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت / یاں بھی شہود تیرا واں بھی حضور تیرا
جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف سے / جی میں سما رہا ہے از بس غرور تیرا
اے درد منبسط ہے ہر سو خیال تیرا / نقصان گر تو دیکھے تو ہے قصور تیرا

۲

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا / پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور / شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن / میں جو پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے / وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں / دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا
درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا / ہم کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

۳

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا / میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا
رکھتا ہوں ایسے طالع بیدار میں کہ رات / ہمسایہ میرے نالوں کی دولت نہ سو سکا
گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر / میں نے تو درگذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا
دشت عدم میں جا کے نکالوں گا جی کا غم / کنج جہاں میں کھول کے دل میں نہ رو سکا
جوں شمع روتے روتے ہی گذری تمام عمر / تو بھی تو درد داغ جگر میں نہ دھو سکا

۴

کھلا دروازہ میرے دل پہ از بس اور عالم کا / نہ اندیشہ ہے شادی کا مجھے نے فکر ہے غم کا

بلند و پست سب ہموار ہیں اپنی نگاہوں میں　　برابر سانہ میں ہوتا ہے جوں سر زیر اد رہم کا
گلستان جہاں کی دید کیجو چشم عبرت سے　　کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخل ماتم کا
چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی یہ بلبل　　گلوں کے منہ پہ یوں چڑھتی ہے دیدہ دیکھ شبنم کا
نہیں مذکور شاہاں درد ہر گز اپنی مجلس میں　　کبھی کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادہم کا

۵

سینۂ دل حسرتوں سے چھا گیا　　بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا
تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا　　پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات　　پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا
مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک　　درد کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

۶

کیوں کر میں خاک ڈالوں سوز دل طپاں پر　　مانند شمع میرا کیا حکم ہے زباں پر
میں کس طرح بتوں کے لا سامنے جھکا دوں　　دل تو دماغ اپنا کھینچے ہے آسماں پر
کیا اختیار اپنا جوں گل ہیں اس چمن میں　　گلچیں سے کیا چلے ہے کیا زور باغباں پر
میں جانتا نہیں ہوں بیٹھے بٹھائے یارب　　یوں آ پڑی کہاں سے آفت یہ میری جاں پر
اے درد یار جیسا ہوئے سو ہے غنیمت　　اتنا بھی جی نہ رکھئے ہر وقت امتحاں پر

۷

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم　　بہار باغ تو یوں ہی رہی لیکن کدھر شبنم
عرق کی بوند اس کی زلف سے رخسار پر ٹپکی　　تعجب کی ہے جاگہہ یہ پڑی خورشید پر شبنم
ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا　　ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم
کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیر صحبت صاف طبعوں کی　　ہوئی آتش سے گل کی بیٹھتے رشک شرر شبنم
بھلا ٹک صبح ہونے دو اسے بھی دیکھ لیویں گے　　کسی عاشق کے رونے سے نہیں رکھتی خبر شبنم

نہیں اسباب کچھ لازم سبکباروں کے اٹھنے کو
گئی اُڑ دیکھتے اپنے بغیر از بال و پر شبنم

نہ پایا جو گیا اس باغ سے ہرگز سُراغ اس کا
نہ پلٹی پھر صبا ادھر نہ پھر آئی نظر شبنم

نہ سمجھا درد ہم نے بھیدیاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں؟ روتی ہے کسکو یاد کر شبنم

۸

مژگان تر ہوں یا رگ تاک بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے درد آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایۂ قد کشیدہ ہوں

ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

یہ چاہتی ہے تو تپش دل کہ بعد مرگ
کنج مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

۹

گر دیکھیے تو مظہر آثار بقا ہوں
اور سمجھیے جوں عکس مجھے محو فنا ہوں

کرتا ہوں پس از مرگ بھی حل مشکل عالم
بے حس ہوں پہ ناخن کی طرح عقدہ کشا ہوں

ممنون مرے فیض کے سب اہل نظر ہیں
جوں نور ہر اک چشم کا دیدار نما ہوں

ہے آستر فقر اگر سمجھو تو شاہی
سلطاں ہے اگر شاہ تو میں ظلّ ہما ہوں

ہے مظہر انوار صفا میری کدورت
ہر چند کہ آہن ہوں پر آئینہ نما ہوں

احوال دو عالم ہے مرے دل پہ ہویدا
سمجھا نہیں تا حال پر اپنے تئیں کیا ہوں

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز
ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

ہوں قافلہ سالارِ طریق قدما میں
جوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

۱۰

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں — ہم آئینے کے سامنے جب آ کے ہو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی — دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم — پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول — منھ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار — کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر — اے درد آ کے بیعت دست سبو کریں

۱۱

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں — جان سے اپنے جو کرنے کو گذر جاتے ہیں

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے — مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

دید وا دید جو ہو جائے غنیمت سمجھو — جوں شرر ورنہ ہم اے اہل نظر جاتے ہیں

ہم کسی راہ سے واقف نہیں جوں نور نظر — رہنما تو ہی تو ہوتا ہے جدھر جاتے ہیں

اے رگ ابر یہ مژگاں بھی اگر ٹک برسیں — ایک پل میں کئی تالاب تو بھر جاتے ہیں

آہ معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز — لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کا دل عالم سے — درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

۱۲

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دئے — پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دئے

ہوں کشتۂ تغافل ہستیٔ بے ثبات — خاطر سے کون کون نہ اس نے بھلا دئے

عنقا کی طرح جتنے تھے یاں نامور فلک — تو نے خدا ہی جانے کہ کیدھر اڑا دئے

پگھلا دل اثر نہ مرے حال پر کبھی — ہر چند روتے روتے میں نالے بہا دئے

یارب یہ کیا خرام ہے جس نے اک آن میں — کتنے ہی مردے حشر سے آگے جلا دیئے

عالم میں جتنے پاک گہر تھے سو ایک ایک — ادنیٰ سے روزگار نے یوں ہی گھلا دیئے

دونوں جہان کی نہ رہی پھر خبر اُسے دو پیالے تیری آنکھوں نے جس کو پلا دئے
اے شورِ حشر! گردشِ دوراں نے اہلِ قبر ٹک بھی نہ سونے پائے کہ وہیں جلا دئے
چاہو وفا کرو نہ کرو اختیار ہے خطرے جو اپنے حق میں تھے وہ سب مٹا دئے
سیلابِ اشکِ گرم نے اعضا مرے تمام اے درد کچھ بہا دئیے اور کچھ جلا دئے

۱۳

چھاتی یہ گر پہاڑ بھی ہووے تو ٹل سکے مشکل ہے جی میں بیٹھے سو جی سے نکل سکے
نشو و نما کی کس کو امید اے بہار یاں میں خشک شاخ ہوں جو پھولے نہ پھل سکے
تحریک ہے یہ اُس یدِ قدرت کی ورنہ کب بے دست و پا صبا سے کوئی پات ہل سکے
مثلِ حباب جب کہ نظر سے گیا گیا میں وہ غریق ہوں کہ نہ ڈوبا اچھل سکے
گرنے نہ دیویں خلق کی نظروں سے دل کو ہم لوٹے اگر کسو کے سنبھالے سنبھل سکے
روشن ضمیر جتنے ہیں عالم میں جوں نجوم چرخ آسیا سے اپنے یہ دلنے نہ دل سکے
کرتے عبث ہو شیشہ گراں سنگ کو گداز پگھلائیے جو تم سے کوئی دل پگھل سکے

۱۴

بلبل نہ بر آئے باغباں سے گل کا بھی نہ بس چلے خزاں سے
جوں غنچہ وبالِ دل ہے غافل ہر خندہ کہ نکلے ہے وہاں سے
مانندِ صبا تری گلی میں جو کوئی گیا پھرا نہ واں سے
شبخوں کے لئے فلک پھرے ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں سے
ہر آن ہیں واردات دل پر آتا ہے یہ قافلہ کہاں سے
ہے مثلِ چراغ درد میرا دشمن دمِ عیسوی بھی جاں سے

۱۵

کب ترا دیوانہ آوے قید میں تدبیر سے جوں صدا نکلا ہی جاہے خانۂ زنجیر سے

قدر مردوں کی سمجھنے کے نہیں یہ مایہ دار — جوہری واقف نہ ہوئے جوہر شمشیر سے
دیکھتا تو آکے از خود رفتگاں کا حال ٹک — جا بجا سب پشت بر دیوار ہیں تصویر سے
منعم ایسے قصر لاکھوں مل گئے ہیں خاک میں — جز خرابی کے تیا کیا فائدہ تعمیر سے
درد اب ہنستے ہیں رونے پر مرے سب خاص و عام — کیا ہوئے وہ نالے جو لگتے تھے دل میں تیر سے

۱۶

فرض کیا کہ لے ہوس اک دو قدم ہی بلغ ہے — آپ کہیں نہ جائیے ملتا نہیں سراغ ہے
دیکھیے جس کو یاں اُسے اور ہی کچھ دماغ ہے — ایک شب چراغ بھی گو ہر شب چراغ ہے
غیر سے کیا معاملہ آپ ہی ہیں اپنے دام میں — قید خودی نہ ہو اگر پھر تو عجب فراغ ہے
حال مرا نہ پوچھئے جو کہوں میں سو کیا کہوں — دل ہے سو ریش ریش ہے سینہ سو داغ داغ ہے
کھو سکے کبھی خمار میرے نشے کی آبرو — دیدۂ آئینہ کی طرح تجھ سے بھرا ایاغ ہے
سنتے ہیں گل کہ آہ تو ہم سے ہے چھپ رہا کہیں — اپنی تلاش سے غرض ہم کو ترا سراغ ہے
غفلت دل سہی مگر پنبۂ گوش خلق درد — بلبل داستاں ترا ورنہ ہر ایک دلغ ہے

۱۷

اپنے تئیں تو ہر گھڑی غم ہے الم ہے داغ ہے — یاد کرے ہیں کبھی کب یہ تجھے دماغ ہے
جلتے ہی جلتے صبح تک گذری اسے تمام شب — دل ہے کہ شعلہ ہے کوئی شمع ہے یا چراغ ہے
پائیے کس جگہ تیا اے بت بے وفا تجھے — عمر گذشتہ کی طرح گم ہی سدا سراغ ہے
دولت فقر کے حضور گرد ہے جاہ و سلطنت — کہتے ہیں جس کو یاں ہما اپنی نظر میں زاغ ہے
اہل نظر کو رہنما درد نہیں ضرور کچھ — نقش شرر رہی ہے چشم اور وہی چراغ ہے

میر محمد تقی میر

میر تخلص۔ محمد تقی نام۔ خلف میر عبداللہ۔ شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ سراج الدین علی خاں

آرزو زبان فارسی کے معتبر مصنف اور مسلم الثبوت استاد و محقق ہندوستان میں تھے پیر صاحب کا اُن سے دور کا رشتہ تھا۔

میر صاحب کو ابتدا سے شعر کا شوق تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دلی میں آئے اور خان آرزو کے پاس اُنھوں نے اور اُن کی شاعری نے پرورش پائی۔ اگرچہ اُن کا تخلص میر تھا مگر گنجفہ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے۔ قدردانی نے اُن کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہ سے دیکھا۔ اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اڑا دیا۔ ہندوستان میں یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفے کے طور پر شہر سے شہر میں لے جاتے تھے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ نحوست اور فلاکت قدیم سے اہل کلام کے سر پر سایہ کئے ہیں۔ ساتھ اس کے میر صاحب کی بلند نظری۔ اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی۔ اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انھیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا اور وہ وضعداری اور قناعت کے دھوکے میں اسے فخر سمجھتے رہے۔

اگرچہ دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امرا و شرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت اُن کے لئے جگہ خالی کرتا تھا اور اُن کے جوہر کمال اور نیکی اطوار و اعمال کے سبب سب عظمت کرتے تھے مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے اور وہاں تو خود خزانۂ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اس لئے ۱۱۹۰ھ میں دلی چھوڑنی پڑی لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو کر دلی کو خدا حافظ کہہ کر کسی طرح لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ پہنچکر جیسا مسافروں کا دستور ہوتا ہے ایک سرائے میں اترے معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ رہ نہ سکے اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جا کر شامل ہوئے ان کی وضع قدیمانہ جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ نئے انداز نئی تراشیں بانکے ٹیڑھے جوان جمع انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب ہمارے غریب الوطن زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی۔ پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطع فی البدیہہ کہہ کر غزل طرح میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ۔۔۔ ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ۔۔۔ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ۔۔۔ ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

سب کچھ حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی۔ اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہوا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپیہ معینہ کر دیا۔

عظمت و اعجاز جو ہر کمال کے خادم ہیں۔ اگرچہ انھوں نے لکھنؤ میں میر صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر انھوں نے بد دماغی اور نازک مزاجی کو جوان کے ذاتی مصاحب تھے اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔ نواب آصف الدولہ سے ناراض ہو کر گھر بیٹھ رہے۔ ہر چند نواب مرحوم نے کوشش کی کہ میرے پاس آئیں نہ گئے۔ فقر و فاقہ میں گذارہ کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ اور سو برس کی عمر پائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی کہ ع واویلا مُرد شہ شاعراں

تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان غزلوں کے ہیں۔ اور رباعیاں۔ مستزاد۔ مخمس مثلث ہیں۔ دو واسوخت بھی ہیں۔ مگر لاجواب۔ چار قصیدے ہیں۔ ایک تذکرۂ شعرا لکھا ہے جس کا نام نکات الشعرا ہے

غزلوں کے دیوان۔ اگرچہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر جو ان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں۔ انھوں نے زبان اور خیالات میں جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی ہے۔ اتنا ہی بلاغت کو کم کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل اصول غزلیات کے لحاظ سے سودا سے بہتر ہے۔ ان کا صاف اور ستھرا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے۔ اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے۔ اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دلعزیز ہے۔

قصائد کی حالت۔ چونکہ مطالب کی دقت مضامین کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شان و شکوہ۔ بندش کی چستی لازمہ قصائد کا ہے۔ وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میر صاحب کے قصیدے کم ہیں اور اسی قدر درجے میں بھی کم ہیں۔ انھوں نے طالب سخن پر روشن کر دیا ہے کہ قصیدے اور غزل کے دو میدانوں میں دن اور رات کا فرق ہے۔ اور اسی منزل میں آکر سودا اور میر کے کلام کا حال کھلتا ہے۔

مثنویاں۔ مختلف بحروں میں ہیں۔ جو اصول مثنوی کے ہیں۔ وہ میر صاحب کا قدرتی انداز واقع ہوا ہے۔ اس لئے بعض بعض لطف سے خالی نہیں۔ ان میں شعلۂ عشق دریائے لطافت نے اپنی خوبی کا انعام شہرت کے خزانے سے پایا۔ مگر افسوس ہے کہ میر حسن مرحوم کی مثنوی سے دونوں پیچھے رہیں اور مثنویاں بہت پھیکی ہیں۔

کلام پر معمولی رائے۔ میر صاحب کی زبان شستہ۔ کلام صاف۔ بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں۔ محاورے

کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے اُن میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ اور زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتے ہیں۔ وہ گویا اردو کے سعدی ہیں۔ ان کو کبھی شگفتگی یا بہار عیش و نشاط کا لطف نصیب نہیں ہوا۔ وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے۔ اُس کا دکھڑا سناتے چلے گئے۔ جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مضامین اور شعرا کے لئے خیالی تھے۔ ان کے حالی۔ اِن کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم و درد کا پتلا نہیں۔ حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا۔ ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے جو دل پر گذرتے تھے وہاں زبان سے کہہ دیتے تھے۔ کہ سننے والوں کے دلوں کے لئے نشتر کا کام کر جاتے تھے۔

میر صاحب نے اکثر فارسی کی ترکیبوں یا ان کے ترجموں کو اردو میں داخل کیا۔ بہت ان میں سے پسند عام ہوئے بعض نامنظور۔ اکثر الفاظ اب مؤنث ہیں۔ میر صاحب نے انھیں مذکر باندھا ہے۔

غزلیات

سرسری ہم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم — یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
بارے سجدہ ادا کیا تہِ تیغ — کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا
اب خرابہ ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

۲

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج — بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا
اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ — پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا
سب شور ما و من کو لئے سر میں مر گئے — یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

تکلیف دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے کی ۔۔۔ دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا

۳

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل ۔۔۔ تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک ۔۔۔ پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
گو بے ستوں کو ٹال دے آگے سے کوہکن ۔۔۔ سنگِ گرانِ عشق اٹھایا نہ جائے گا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ ۔۔۔ نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

۴

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا ۔۔۔ جسکے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا
سب کھلا باغ جہاں الّا وہ حیران و خفا ۔۔۔ جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا
رہگذر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر ۔۔۔ اس خرابے میں نہ کرنا فکر تم تعمیر کا
بس طبیب اٹھ جا مرے بالیں سے مت دے دردِ سر ۔۔۔ کام یاں آخر ہوا۔ اب فائدہ تدبیر کا
کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں ۔۔۔ رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

۵

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہو گا ۔۔۔ تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہو گا
غمِ ہجر رکھے گا بیتاب دل کو ۔۔۔ ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھ آزار ہو گا
جو افراط الفت ہے ایسا تو عاشق ۔۔۔ کوئی دن میں برسوں کا بیمار ہو گا
یہی ہو گا کیا ہو گا میرؔ ہی نہ ہوں گے ۔۔۔ جو تو ہو گا بے یار و غمخوار ہو گا

۶

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا ۔۔۔ بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے ۔۔۔ رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
نہیں ہے مرجعِ آدم اگر خاک ۔۔۔ کدھر جاتا ہے قدِّ خم ہمارا

زمین و آسماں زیر و زبر ہے | نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا
کسو کے بال درہم دیکھتے میر | ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

۷

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا | کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی | آخر وہ برا نکلا ہم جس کو بھلا جانا
کیا پانی کے مول آکر مالک نے گہر بیچا | ہے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا
اے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں | اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

۸

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو | دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات | اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور | اس میں کیا اختیار ہے اپنا
کچھ نہیں ہم مثال عنقا لیک | شہر شہر اشتہار ہے اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو | سو دلوں کا غبار ہے اپنا

۹

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات | کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
جگر ہی میں اک قطرہ خوں ہے سرشک | پلک تک گیا تو تلاطم کیا

۱۰

کل چمن میں گل و سمن دیکھا | آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں | عاشقوں کو جلا وطن دیکھا
ذوق پیکان تیر میں تیرے | مدتوں تک جگر نے چھن دیکھا
حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ | میر کا کھول کر کفن دیکھا

کھلتا ہوں وہاں صحبت رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اُسی شہر سے میخانہ جہاں ہو

رہنے سے مرے پاس کے بدنام ہوئے تم
اب جاکے رہو واں کہیں رسوانہ جہاں ہو

ان اُجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میر
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

۱۲

گل لے کیا بہت کہ چمن سے نہ جلئے
گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے

میں بے دماغ کرکے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائیے

صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے
کھو بیٹھئے جو آپ کو تو اُس کو پائیے

خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں
اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے

اے ہمدم ابتدا سے ہے آدم کشی ہیں عشق
طبع شریف اپنی نہ ایدھر کو لائیے

۱۳

تیری گلی سے جب ہم قصد سفر کریں گے
ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا
تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کریں گے

اپنے بھی جی ہے آخر انصاف کر کہ کب تک
تو یہ ستم کرے گا ہم درگزر کریں گے

صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

۱۴

یاں سرکشاں جو صاحب تاج ولوا ہوئے
پامال ہوگئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے

دیکھی نہ ایک چشمک گل بھی چمن میں آہ
ہم آخر بہار قفس سے رہا ہوئے

پچھتاؤگے بہت جو گئے ہم جہان سے
آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے

تجھ بن دماغ صحبت اہل چمن نہ تھا
گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے

۱۵

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے — خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے
نہیں عشق کا درد لذت سے خالی — جسے ذوق ہے وہ مزا جانتا ہے
مجھے جانتا ہے آپ سا ہی فریبی — دغا کو بھی میری دغا جانتا ہے
جفا اُس پہ کرتا ہے حد سے زیادہ — جنھیں یار اہل وفا جانتا ہے
نہ گرمی جلاتی ہے ایسی نہ سردی — مجھے یار جیسا جلا جانتا ہے
مرے دل میں رہتا ہے تو ہی تبھی تو — جو کچھ دل کا ہے مدعا جانتا ہے
جہاں میر عاشق ہوا خوار ہی تھا — یہ سودائی کیا دل لگا جانتا ہے

۱۶

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو — وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے
فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اس میں ہم — غبار راہ ہوتے یا کسو کی خاک پا ہوتے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش — ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

۱۷

خوب ہی اے ابر اک شب آؤ باہم روئیے — پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے
وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں — خندۂ صبح چمن پر مثل شبنم روئیے
شادی و غم میں جہاں کی ایک سے دس کا ہے فرق — عید کے دن ہنسیے تو دس دن محرم روئیے
دیکھا ماتم خانۂ عالم کو ہم مانندِ ابر — ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دما دم روئیے
اب سے یوں کر لے مقرر اٹھیے جب کہسار سے — وادیِ مجنوں پہ بھی اے ابر اک دم روئیے

۱۸

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ! دو قدم راہ غلط کر — مجنون زخود رفتہ کبھی راہ پر آوے
ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی — جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے

کہتے ہیں ترے کوچے سے میر آنے کہے ہے
جب جانئے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

۱۹

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ نظر آوے

اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھی میر بلاکش ادھر آوے

مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ پہ سفر سے حذر آوے

۲۰

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
روشِ آبِ رواں پھیلے پھرا کرتے تھے

غیرتِ عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو
تھوڑی آزردگی میں ترکِ وفا کرتے تھے

دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع
لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے

مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
دیر میں مسجد دل میں دیر رہا کرتے تھے

اب تو بیتابیِ دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا
آگے رنج و تعب عشق اٹھا کرتے تھے

اُٹھ گئے پر مرے تکیے کو کہیں گے یاں میر
درد دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے

۲۱

آنکھوں کی طرف گوش کی در یہ وہ نظر ہے
کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے

یہ بادیۂ عشق ہے البتہ ادھر سے
بچ کر نکل اے سیل کہ یاں شیر کا ڈر ہے

سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود
اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے

کر کام کسو دل میں ۔ گئی عرش تو یہ کیا
اے آہ سحرگاہ اگر تجھ میں اثر ہے

اے شمع اقامت کدہ اس بزم کو مت جان
روشن ہے ترے چہرے سے تو گرم سفر ہے

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شرر ہے

ٹک جان کا جس جا ہے وہیں گھر بھی ہے اپنا
ہم خانہ خرابوں کو نہ یاں گھر ہے نہ در ہے

شیخ امام بخش ناسخ

شیخ صاحب کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے مگر کمال سے لاہور کو فخر کرنا چاہئے۔ جو کہ ان کے والد کا وطن تھا۔ خاندان کے باب میں صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے اور بعض اشخاص کہتے ہیں۔ اُس لاولد نے متبنّیٰ کیا تھا۔ اصلی والد آپ کے غربت میں بغرض بے مشرق کو گئے۔ فیض آباد میں اُن کی قسمت سے یہ ستارہ چمکا کہ فلک نظم کا آفتاب ہوا

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

غریب باپ سے صاحب نصیب بیٹے کے سوا نصیبہ نے رفاقت نہ کی۔ مگر اُس دولتمند سوداگر نے کہ لاولد تھا۔ بلند اقبال لڑکے کو فرزندی میں لے کر تعلیم و تربیت کیا کہ بڑے ہو کر شیخ امام بخش ناسخ ہو گئے۔

شیخ صاحب فیض آباد میں رہے۔ لکھنؤ کے دارالخلافت ہو جانے سے وہاں آئے اور وہیں عمر بسر کی۔

شیخ صاحب کی تحصیل علمی۔ آپ نے فارسی کی کتابیں حافظ وارث علی صاحب لکھنؤ سے پڑھی تھیں اور علمائے فرنگی محل سے بھی تحصیلی کتابیں حاصل کی تھیں۔ اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ تھی۔ مگر رواج علم اور صحبت کی برکت سے فن شاعری کی ضروریات سے پوری واقفیت تھی۔ اور نظم سخن میں اُن کی پوری پابندی کرتے تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ابتدا سے شعر کا شوق تھا۔ ایک دن کئی غزلیں۔ کئی نظمیں میر تقی مرحوم کی خدمت میں لے گئے۔ انھوں نے اصلاح نہ دی۔ دل شکستہ ہو کر چلے آئے۔ کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں۔ فرشتہ تو ہیں نہیں اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا۔ چنانچہ لکھتے تھے اور رکھ چھوڑتے تھے۔ چند روز بعد جو سمجھ میں آتا۔ اصلاح دیتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد پھر نظر ثانی کرتے تھے۔ سلسلہ مشق کا برابر جاری رہا۔ کسی کو سناتے نہ تھے۔ جب خوب اطمینان ہو گیا اور سید انشا جرات مصحفی وغیرہ مر گئے تو مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے۔ مرزا قتیل وغیرہ جو شعرا موجود تھے۔ بڑی قدردانی فرماتے تھے۔ اُن کے دل بڑھانے سے کلام نے زور پکڑا اہل کمال کی صحبتوں میں طبیعت خود بخود اصلاح پاتی گئی۔ رفتہ رفتہ خود اصلاح دینے لگے۔

آپ نے کسی کی نوکری نہیں کی۔ سرمایہ خداداد جوہر شناسوں کی قدردانی سے نہایت خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ پہلی دفعہ جب الٰہ آباد میں آئے تو راجہ چندو لال نے ۱۲ ہزار روپیہ بھیج کر بلا بھیجا انھوں نے

لکھا کہ اب میں نے سید کا دامن پکڑا ہے اُسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ یہاں سے جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا۔
راجہ موصوف نے پھر خط لکھا بلکہ ۵ ہزار روپیہ بھیج کر بڑے اصرار سے کہا کہ یہاں تشریف لائیے گا تو ملک الشعرا کا خطاب دلواؤں گا۔ حاضری دربار کی قید نہ ہوگی۔ ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی۔ انھوں نے منظور نہ کیا۔

غازی الدین حیدر کے زمانہ میں شیخ صاحب لکھنؤ سے آغا میر کے حکم سے مجبوراً نکلے۔ چند روز الہ آباد میں رہے پھر لکھنؤ گئے۔ وہیں ۱۲۵۴ھ میں انتقال فرمایا۔ مہر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی۔ ع۔ "دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے" بعض اہل تذکرہ لکھتے ہیں کہ ۶۴ - ۶۵ برس کی عمر تھی۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر ہوگی۔

آپ کے ۳ دیوان ہیں مگر ۲ مشہور ہیں۔ ایک الہ آباد میں مرتب کیا جس کا نام دفتر پریشاں رکھا۔ اس میں غزلیں۔ رباعیاں۔ تاریخیں ہیں۔ قصائد کا شوق نہ تھا۔ ان کا کلام عموماً شاعری کے ظاہری عیبوں اور لفظی سقموں سے تہمت پاک ہے اور اس امر میں انھیں اتنی کوشش ہے کہ اگرچہ ترکیب کی چستی یا کلام کی گرمی میں فرق آ جائے مگر اصول ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

غزلوں میں شوکت الفاظ بلند پردازی نازک خیالی بہت ہے مگر تاثیر کم تصوف اچھا نہیں کہتے۔ اور ان کی غزلوں میں ظرافت کا چٹخارا بھی نہیں ہے۔

شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کا مقابلہ۔ شیخ صاحب میں مضمون دقیق ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب میں محاورے کی صفائی کلام کی سادگی تھی۔

آپ کے چند نامی صاحب دیوان شاگرد ہوئے ہیں۔ خواجہ وزیر۔ وزیر۔ مرزا محمد رضا خاں برق۔ مہر علی اوسط رشک۔ شیخ امداد علی بحر۔ سید اسمٰعیل حسین منیر۔ آغا کلب حسین قاں نادر۔

غزلیات

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا — طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں لکھتے ہیں — دل پر داغ کو کیونکر ہے عشق اُس زلف پیچاں کا
شگفتہ مثل گل ہر فصل گل میں داغ ہوتے ہیں — نیا ہے کیا ہمارا کالبد خاک گلستاں کا
سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویراں ہونے سے — کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا
کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنج مرقد میں — تو عالم یاد آتا ہے شب مہتاب ہجراں کا
مرا ویرانہ مثل آئینہ معمور حیرت ہے — یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشم حیراں کا

جنوں میں سحر کی شب ہاتھ دوڑایا عجب اپنا ۔ کیا ہے چاک تا جیب سحر اپنے گریباں کا
تہِ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ ۔ کہ عالم ہر دہان زخم پر تھا روئے خنداں کا

۲

جس جگہ ہے حسن فوراً قدرداں پیدا ہوا ۔ چاہ میں یوسف گرا تو کارواں پیدا ہوا
سخت دل جو ہیں انھیں محروم رکھتا ہے فلک ۔ بیضۂ فولاد سے بچہ کہاں پیدا ہوا
ہوں وہ دریا جسمیں ہر اک عرش اعظم ہے حباب ۔ مل گئی اک لہر جس دم اک جہاں پیدا ہوا
وادی ہستی میں آتے ہی عدم کی راہ لی ۔ ساتھ اپنے توسن عمر رواں پیدا ہوا
بے گنہ کرتا ہے لے ناسخ ہزاروں کے وہ خون ۔ دوسرا دنیا میں اب چنگیز خاں پیدا ہوا

۳

تری ہی رہ گزر میں گبر و مومن کرتے ہیں سجدے ۔ ترے نقش قدم سے ہو گئے دیر و حرم پیدا
عیاں ہے ہر حباب دہر سے کیفیت دنیا ۔ برائے چشم بینا ہیں ہزاروں جام جم پیدا
نہیں ممکن کہ کلک فکر لکھے شعر سب اچھے ۔ برستا ہے بہت نیساں گہر ہوتے ہیں کم پیدا
کجی روز ازل سے طینت موذی میں داخل ہے ۔ کیا خالق نے ساتھ افعی کے ناسخ پیچ و خم پیدا

۴

لبریز اس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا ۔ بنتا ہے عکس رخ سے کیوڑا گلاب کا
رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دن ۔ ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا
راحت طلب کروں تو ملے آسماں سے رنج ۔ حاضر ہو موت ابھی جو خیال آئے خواب کا
جو ہے حسین اس کو ہے نفرت جہان سے ۔ ہوتا نہیں ادھر کبھی منہ آفتاب کا
گھل گھل کے مر گیا ہوں میں دریائے عشق میں ۔ کافی ہے میرے دفن کو گنبد حباب کا
صبح فراق میں ہوئی قدر شب وصال ۔ آیا ہے یاد پیری میں عالم شباب کا
ناسخ شراب پی شب تاریک ہے تو کیا ۔ محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا

۵

مرگیا ہوں دیکھ کر جلوہ رُخ پر نور کا
میری لوح قبر کو زیبا ہے پتھر طور کا

پاس ہوں یاروں کے جب تک مجھ کو کہتے ہیں نزار
خرد آتا ہے نظر انساں کو انساں دور کا

ترکِ لذت کر دلا پہنچے نہ تا تجھ کو گزند
نوش تو پیچھے ہے پہلے نیش ہے زنبور کا

مجھ سے اوّل خانۂ زنداں میں تھا مجنوں تو کیا
ہر محل میں پہلے ہوتا ہے گذر مزدور کا

تیرہ بختی توریوں پر کرتی ہے نازل بلا
شہد لٹتا ہے شب تاریک میں زنبور کا

دعویٔ باطل سے ہو جاتے ہیں اکثر نامور
شہرہ کیا بانگ انا الحق نے کیا منصور کا

ہیں جو صاحب درد اُن سے دور ہے سامان عیش
بادہ کھینچا ہے کسی نے زخم کے انگور کا

کیا ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

۶

سعی سے گوہر مقصد نہیں ہوتا حاصل
نہ کبھی آب رواں میں ہوا گوہر پیدا

ہوں وہ گریاں کہ پس مرگ مری تربت پر
سبزۂ تر کی عوض ہو مژۂ تر پیدا

کیوں نہ آئینہ ہو حیراں کہ سکندر تو کہاں
نہیں ہوتا کبھی اب عکس سکندر پیدا

ہے ازل سے وہ مرا قبلۂ ایماں ناسخ
جس کو خالق نے کیا کعبے کے اندر پیدا

۷

ماہ نو سے جو وہ خورشید مقابل ہوگا
یہ یقیں ہے کہ نظر آتے ہی کامل ہوگا

اُس پہ آفت نہیں منہ سوئے خدا ہے جسکا
طائرِ قبلہ نما کاہے کو بسمل ہوگا

شمس جانیں گے منجم تجھے اور اُس کو قمر
آئینہ جب ترے چہرے کے مقابل ہوگا

غافلو نشۂ دولت کے نہ اتنا بہکو
دیکھنا کاسۂ سر کاسۂ سائل ہوگا

آسماں کو نہ بہت ناز سے دیکھ اے ظالم
ابھی بے ہوش ہر اک عرش کا حامل ہوگا

انس ہے تجھ کو عبث لالہ رخوں سے ناسخ
داغ حسرت کے سوا کچھ نہ حاصل ہوگا

۸

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا — جو حلقہ ہے زلف عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشک چیں کا

زبس کہ وصف دہان و مژگاں ہے ہر دم ورد زبان شیریں — بدن میں حب نمک ہے جان شیریں مزا دہن میں ہے انگبیں کا

وہ چشم فتاں ہے غیرت گل وہ زلف پیچاں ہے رشک سنبل — عذار میں ہے شباہت گل دہن میں عالم ہے یاسمیں کا

یہ جوش پر یاں ہے اشک کا یم کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم — جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم شرر ہے اک آہ آتشیں کا

زبس کہ ہے جوش داغ ہجراں ہوا مرا سینہ باغ رضواں — برائے گلگشت جائے غلماں خیال پھرتا ہے اک حسیں کا

یہ ساعدوں کا ہے اس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہو وہ بیدم — نیام تیغ قضا ہے مرہم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

برا ہو بد بخت عاشقی کا نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا — بنا ہے عشق بتاں کا ٹیکا نشان سجدہ مری جبیں کا

اگر ہو پیچھا ہا پہ سمندر یقیں ہے ہو خاک دم میں جل کر — بنا جو ہو آفتاب محشر کھرنڈ ہے داغ آتشیں کا

طرح ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب یہاں سے — کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند رتبہ اس زمیں کا

۹

کیا تری الفت میں ہیں اک نالہائے عندلیب — ہے شکست رنگ گل میں بھی نوائے عندلیب

شکل پروانہ جو اس محفل میں جائے عندلیب — آگ اپنے آشیانے کو لگائے عندلیب

تو ہے ایسا گل کہ تیرے نقش پا کی خاک کا — عارض گل کے لئے غازہ بنائے عندلیب

ایک دم بیٹھی تھی وہ اگر تری دیوار پر — چومتے ہیں غنچۂ گل آج پائے عندلیب

ہو چلا ہے خشک ہر گل رشک روئے یار سے — آبجو اشکوں کی گلشن میں بہائے عندلیب

ہے یہی مفہوم گلبانگ صریر کلک سے — ہے ابھی باقی بہت سا ماجرائے عندلیب

تیری محفل وہ چمن ہے جس میں اے رشک چمن — عاشقوں کے ہوش اڑتے ہیں بجائے عندلیب

نغمہ سنج ایسا ہوں کھائے استخواں گر بعد مرگ — زاغ کی منقار سے نکلے نوائے عندلیب

داستان صیاد و گلچیں کی فقط رہ جائے گی — نے ثبات گل ہمیشہ نے بقائے عندلیب

باغ میں تجھ سے خجل ہو کر یہ ہر گل نے کہا — کاش مجھ کو اپنے شہپر میں چھپائے عندلیب

کر دیا اُس گل کے پہ تو نے جو دریا کو چمن ۔ بلبلوں سے صاف آتی ہے صدائے عندلیب
عارض جاناں کے ہوتے گل پہ کیوں عاشق ہوئی ہو گئی صیاد پہ ثابت خطائے عندلیب
ہر کلی منقار ہے اُس رشک گل کے عشق میں آتی ہے ہر شاخ گلبن سے صدائے عندلیب
شمع کے شعلے کو گر تشبیہ دوں گل برگ سے بزم میں گلگیر سے نکلے صدائے عندلیب
کب قفس میں صحن گلشن یاد آتا ہے اُسے عارض صیاد میں حاجت روائے عندلیب
چل کے صحن باغ میں ایسی پڑھوں رنگیں غزل آج ہر گل کو بھلا دوں نغمہائے عندلیب

۱۰

گر ترے دست حنائی دیکھ پائے عندلیب شاخ گل کو آہ سوزاں سے جلائے عندلیب
راز پوشی کاش ہم کو بھی سکھائے عندلیب نام شبنم کا ہوا در آنسو بہائے عندلیب
جائے گل دیکھوں الٰہی منہ اُسی محبوب کا ہے یہی ہر صبح گلشن میں دعائے عندلیب
موسم گل ہو چکا آئی خزاں مر جائیں گے بھیج گلشن میں شبیہہ اپنی برائے عندلیب
طوطیاں محو تکلم کبک پامال خرام آفت قمری ہے قامت رخ بلائے عندلیب
اپنا دل سا چاہتا ہوں غیر کے بھی دل کا حال سوئے گل ہرگز نہ دیکھوں لے رضائے عندلیب
تو وہ ہے پر کالۂ آتش جو گذرے باغ میں یہ تو رخ سے چراغ گل جلائے عندلیب
صحن گلشن میں دکھا کر قامت گلرنگ کو تو اگر چاہے تو قمری سے لڑائے عندلیب
جانتی ہے شاخ گل صیاد تیرے ہاتھ کو خود بخود دیکھوں تیرے قابو میں آئے عندلیب
موسم گل میں ہیں تو داغ ہوا افلاس کا آگے آنکھوں کے زر گل لوں اُڑائے عندلیب
دیکھ کر گل کو حقارت سے وہ گل کہنے لگا بس یہی ہے شاہد رنگیں قبائے عندلیب
بعد مردن اُڑتے پھرتے ہیں چمن میں بال و پر عشق گل میں دیکھ لے تاسخ وفائے عندلیب

۱۱

کیا اسیری میں کریں شکوہ ترا صیاد ہم واں بھی کچھ دام رگ گل سے نہ تھے آزاد ہم

آج کل سے کچھ نہیں اپنی زباں معجز بیاں
نطق عیسیٰ کی طرح رکھتے ہیں مادر زاد ہم

یہ زمیں ہے بے وفا یہ آسماں بے مہر ہے
جی میں ہے اک اب نیا عالم کریں ایجاد ہم

خندہ زن ہوتا نہیں اپنا دہان زخم بھی
کوئی دنیا میں نہ ہوگا جیسے ہیں ناشاد ہم

پہلے اپنے عہد سے افسوس سودا اٹھ گیا
کس سے ناسخ اس غزل کی چاہیں اب داد ہم

۱۲

کون سا تن ہے کہ مثل روح اُس میں تو نہیں
کون گل ہے جو ترا مسکن بہ رنگ بو نہیں

جام نرگس میں کہاں شبنم جو نکلے آفتاب
یار کے آگے مری آنکھوں میں اک آنسو نہیں

کیوں نہ ہو فرہاد ناکام اور خسرو کامیاب
زور زر کے سامنے کچھ قوت بازو نہیں

عشق میں بدمست ہوں میں پر کوئی واقف نہیں
نشہ ہے جامِ مے الفت میں لیکن بو نہیں

رات دن ناقوس کہتے ہیں یہ آواز بلند
دیر سے بہتر ہے کعبہ گر بتوں میں تو نہیں

قمریاں دیوانی ہیں کیونکر گلے میں ہو نہ طوق
باغ میں اک سرو مثلِ قامت دلجو نہیں

۱۳

یاں ازل سے داغ سودا ہے دل آگاہ میں
سنگ اسود جس طرح ہو نصب بیت اللہ میں

دل میں رہتا ہے پر آنکھوں کو نظر آتا نہیں
کیا تفاوت اب رہا اُس بت میں اور اللہ میں

ہیں ملازم بادشاہ حسن کی سرکار میں
ہم فلوس داغ حسرت پاتے ہیں تنخواہ میں

بعد مردن اس کو راحت اُس کو ہے حسرت نصیب
فرق اتنا ہی نظر آیا گدا و شاہ میں

جسم کاہیدہ ہے غم سے دل ہے سوزاں داغ سے
شعلۂ آتش نہاں ہے اپنی برگ کاہ میں

رشکِ نخل وادی ایمن ہے ہر برگ گیاہ
سنگریزے طور ہیں اُس کی تجلی گاہ میں

خوش عبث ہوتے ہیں ناداں ماہ نو کو دیکھ کر
اک مہینہ عمر کا ہوتا ہے کم ہر ماہ میں

سر بتوں کے آستانے سے نہ اُٹھے حشر تک
یہ دعا ناسخ کی ہے یارب تری درگاہ میں

۱۴

بے سبب کیونکر کہوں ہر گل ہے خنداں باغ میں
کچھ تو دیکھا ہے جو یوں نرگس ہے حیراں باغ میں

پھینک دیں ہر برگ گل کو نوچ کر منقار سے
بلبلیں دیکھیں اگر رخسارِ جاناں باغ میں

ہوش رونے کا ہوا ہے کوئے جاناں کو چلیں
آتی ہے برسات تو جاتے ہیں انساں باغ میں

سامنے خورشید کے جس طرح پنہاں ہے چراغ
ہو گئے یوں گل ترے آگے ہی پنہاں باغ میں

رنگ عشرت کر گیا پرواز باغ دہر سے
مجھ کو حیرانی ہے گل کیونکر ہیں خنداں باغ میں

واں ہزاروں ہیں گریباں چاک یاں گل بیشمار
مجھ کو یاد آتا ہے ناسخ کوئے جاناں باغ میں

۱۵

ہجر میں مر مر کے جب کاٹا شب دیجور کو
سمجھے ہم کافورِ میت صبح کے کافور کو

لائیں گر موسیٰ ید بیضا ہیں شمع طور کو
کر سکیں روشن نہ فرقت کی شب دیجور کو

بولے موسیٰ دیکھ کر اُس عارض پر نور کو
کر دیا روشن اسی شعلے نے شمع طور کو

قصر اے منعم بنایا ہے تو اوروں کے لئے
جانتے ہیں ہم برابر تجھ کو اور مزدور کو

زاہدا ہے کس قدر مشکل حسینوں کا وصال
جیتے جی پاتے ہیں حق کو بعد مردن حور کو

ہو گیا ہے دل مرا ظلم شب فرقت سے داغ
دوستو مرہم میں ڈالو صبح کے کافور کو

کاسۂ چینی یہ لے منعم! نہ کر اتنا غرور
ہم نے دیکھا ٹھوکریں کھاتے سر فغفور کو

بعد مردن بھی ہے تیرا خوف مجھ کو اس قدر
آنکھ اٹھا کر میں نے جنت میں نہ دیکھا حور کو

جان دی اُس پر ترے قد سہی کے عشق میں
حق تو یہ ہے دار سے کیا کام تھا منصور کو

بت پرستی میں ہے ناسخ حق پرستی کا خیال
دیکھتے ہیں ہر صنم میں ہم خدا کے نور کو

۱۶

کون سا خورشید آج اپنا چراغ خانہ ہے
بزم میں باہم ہجوم ذرہ پروانہ ہے

کر گئے وحشت نہ اس وحشت سرا سے کون کون
مثل مجنوں کل ہمارا حال بھی افسانہ ہے

ہے وہ گلشن داغہائے یاس سے سینہ مرا
مرہم زنگار جس میں سبزۂ بیگانہ ہے

آج کل شمعِ تجلی کا تصور ہے مجھے ‏— جو مزہ ہے میری آنکھوں میں پر پروانہ ہے
ہو گیا مینائے مے خالی اگر۔ تو جان لے ‏— ساقیا لبریز اپنی عمر کا پیمانہ ہے
عازمِ گلگشت وہ غارت گرِ گلشن ہے کیا ‏— آمد و رفتِ نسیمِ صبح بے تابانہ ہے
بعد مر جانے کے عاشق بھی نہیں آتے ہیں پاس ‏— کوئی بھی بالینِ شمعِ مردہ پر پروانہ ہے

۱۷

پھر بہار آئی کہ ہر شاخ پر پروانہ ہے ‏— ہر روش میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے
ہر بگولے میں عیاں اک جلوۂ مستانہ ہے ‏— گردشِ چشمِ غزالاں گردشِ پیمانہ ہے
ابر ہے صحنِ چمن ہے ساقیِ مستانہ ہے ‏— ہر طرف گو خندۂ برق و گل و پیمانہ ہے
میرے یوسف کی خریداری عزیزو ہے محال ‏— نقد جاں ہے اُس کی قیمت نقدِ دل بیعانہ ہے
کیا فقط مجھ کو غمِ دنیا سے آزادی ملی ‏— چھٹ گیا تکلیف سے جینے کی جو دیوانہ ہے
ہر کسی نے کی فریبِ دوستی میں دشمنی ‏— میری شمعِ قبر پر موجِ ہوا پروانہ ہے
دیکھتے تھے کل جنھیں آنکھوں سے ہم اے غافلو! ‏— آج اُن کا اپنے کانوں کے لئے افسانہ ہے
محوِ ایسے خانۂ رنگیں میں مہماں ہو گئے ‏— یہ نہیں ثابت کسی پر کون صاحب خانہ ہے
محفلِ عیشِ جہاں کا ہے دلا کیا اعتماد ‏— نشۂ مے خواب۔ آوازِ غنا افسانہ ہے
شہر دم میں ہوتے ہیں آباد جن کے حکم سے ‏— ایک دن اُن کے لئے بھی گوشۂ ویرانہ ہے
آج ہے جس کے قدم سے رونقِ باغِ جہاں ‏— گل وہی رخصت بہ رنگِ سبزۂ بیگانہ ہے
اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو! ‏— اس کی باتوں پر نہ جاؤ ناصح اک دیوانہ ہے

۱۸

بارہا ہو گئے لالے سے بیاباں خالی ‏— نہ کبھی داغ سے پایا دلِ نالاں خالی
باغ میں سن کے مری زمزمہ پردازی کو ‏— آشیاں کر گئے مرغانِ خوش الحاں خالی
ایک چھوٹا تو ملی دوسرے کو قیدِ حیات ‏— کبھی ہوتا نہیں یہ خانۂ زنداں خالی

میں ہوں کیا چیز دلا خاک نشیں ہو ضعیف | کر دیا موت نے اورنگ سلیماں خالی
روحیں جنت کو گئیں جسم سو کوچۂ یار | دفن ہوتے ہی ہوئے گنج شہیداں خالی
خانۂ عاریتی ہیں جو درم بھرتے ہیں | عقل سے مجھ کو نظر آئے وہ انساں خالی
کون دونوں میں خدا جانے خدا کو ہو پسند | کفر بھی چاہئے لازم نہیں ایماں خالی
یہ غبار اُن کو ہے ناسخ نہ ملا ایک گھڑی | صورت شیشۂ ساعت دل حیراں خالی

۱۹

نہ چھٹے بعد فنا کوچۂ جاناں ہم سے | یارب آباد نہ ہو روضۂ رضواں ہم سے
بت ہستی کو جو توڑیں تو خدا آئے نظر | آتش سنگ کی صورت ہے وہ پنہاں ہم سے
لفظ نرگس میں یہ ہیں معنی روشن پنہاں | ہو سکا بس یہی وصف لب دنداں ہم سے
ضعف نے طاقت گفتار ہی کھو دی ناسخ | اُنس جب کرنے لگا یار کا درباں ہم سے

۲۰

نہ پتھر سے فقط دامان طفلاں ہو گئے خالی | مرے سر پر تو کہساروں کے داماں ہو گئے خالی
مری دیوانگی کا ان دنوں ہے شور گلیوں میں | معلّم رہ گئے تنہا دبستاں ہو گئے خالی
تماکوچہ نہ گلشن ہے کہ جس کے شوق میں اے گل! | جہاں میں عندلیبوں سے گلستاں ہو گئے خالی
عبث اُن غافلوں کو رات دن فکر عمارت ہے | کریں عبرت کہ کیا کیا قصر و ایواں ہو گئے خالی
ہزاروں بے گناہوں کا ہوا خوں کچھ نہیں پروا | ہوا قاتل کو غم اس کا کہ زنداں ہو گئے خالی
جلائے ٹھوکروں سے اس قدر مردے کہ ان روزوں | ترے اعجاز سے شہر خموشاں ہو گئے خالی
قلم اتنے ہوئے فرسودہ خط شوق لکھنے میں | کہ کلکوں سے نیستاں کے نیستاں ہو گئے خالی
مرے نالوں نے کی صحرا میں جس دم شعلہ افشانی | وہیں شیروں سے اے ناسخ نیستاں ہو گئے خالی

خواجہ حیدر علی آتش

آتش تخلص ۔ خواجہ حیدر علی نام ۔ باپ کا نام خواجہ علی بخش ۔ دلی کے رہنے والے تھے ۔

خواجہ زادوں کا خاندان تھا جس میں مسند فقر بھی قائم تھی۔ اور سلسلہ پیری مریدی کا بھی تھا۔ مگر شاعری اختیار کی اور خاندانی طریقے کو سلام کر کے اس میں سے آزادی بے پروائی کو رفاقت میں لے لیا۔ انھوں نے اور ان کی شاعری نے نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کے دامن پرورش میں ترقی کی۔ فیض آباد میں رہے۔ پھر ان کے ساتھ لکھنؤ میں آ گئے۔ مصحفی کے شاگرد تھے اور حق یہ ہے کہ ان کی آتش بیانی نے استاد کے نام کو روشن کیا۔

خواجہ صاحب کی ابتدائی عمر تھی۔ اور استعداد علمی تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ طبیعت مشاعروں میں کمال دکھانے لگی۔ اس وقت دوستوں کی تاکید سے درسی کتابیں دیکھیں۔ باوجود اس کے عربی میں کافیہ کو کافی سمجھ کر آگے پڑھنا فضول سمجھا۔ مشق سے کلام کو قوت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت استاد ہو گئے۔ اور سیکڑوں شاگرد ان کی تربیت میں پرورش پا کر استاد کہلائے۔

سنہ ۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے یکایک موت کا جھونکا آیا کہ شعلے کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی۔

ع خواجہ حیدر علی اے وائے مُردند۔

تمام عمر کی کمائی جسے حیات جاودانی کا مول گننا چاہیے۔ ایک دیوان غزلوں کا ہے جو ان کے سامنے رائج ہو گیا تھا۔ دوسرا تتمہ ہے کہ پیچھے مرتب ہوا جو کلام ان کا ہے۔ حقیقت میں محاورہ اردو کا دستور العمل ہے۔ اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیے ہیں۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی۔ اور نہ فقط اپنے شاگردوں میں بلکہ بے غرض اہل انصاف کے نزدیک بھی مقبول اور قابل تعریف ہوئے۔

وہ شیخ امام بخش ناسخ کے ہم عصر تھے۔ مشاعروں میں اور گھر بیٹھے روز مقابلے رہتے تھے۔ دونوں کے معتقد کہ انبوہ در انبوہ تھے۔ جلسوں کو معرکے اور معرکوں کو دنگل بناتے تھے۔ مگر دونوں بزرگوں پر صد رحمت کہ مرزا رفیع اور سید انشا کی طرح دست و گریباں نہ ہوتے تھے۔

خواجہ صاحب کے کلام میں بول چال اور محاورے اور روزمرہ کا لطف بہت ہے۔ شیخ صاحب کے کلام میں اس درجہ نہیں۔ خواجہ صاحب کا کلام مضامین بلند سے بھی خالی نہیں ہے۔ ہاں طرز بیان صاف ہے۔ سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے۔ بلکہ کہیں میں استعارے اور تشبیہیں فارسیت کی بھی موجود ہیں مگر قریب الفہم۔ اور ساتھ ہی اس کے اپنے محاورے کے زیادہ پابند ہیں۔ یہ ان کا ایک وصف خداداد ہے۔

آپ کے بکثرت شاگرد ہیں۔ ان میں سے سید محمد خاں رند۔ میر وزیر علی صبا۔ میر دوست علی خلیل

ہدایت علی جلیل ۔صاحب مرزا شادر۔ مرزا عنایت علی لبسل ۔ نادر مرزا فیض آبادی۔ نامور شاگرد تھے کہ رُتبہ استادی رکھتے تھے ۔

غزلیات

ظہور آدم خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا — تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

نہ گھبرا چار دن کے واسطے اے روح قالب میں — گیا جب اس مکاں سے پھر نہیں اسکا مکیں آیا

یہ جنس دل بقدر اک نظر اُس کو دکھا دیں گے — جو کوئی مشتری بازار عالم میں حسیں آیا

نہ چھوڑے گا کسی کو آسماں بے گور میں بھیجے — سمجھ زیر زمیں اُس کو جو بالائے زمیں آیا

رجوع اپنے دل روشن سے کر آتش جو مضطر ہے — گیا خرم جب اُس درگاہ میں اندوہگیں آیا

۲

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا — جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

خیال تن پرستی چھوڑ فکر حق پرستی کر — نشاں رہنا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

کہاں جاتی ہے یہ ہر چند بھاگے شوق منزل سے — ہمیں آگے ہیں جب پیچھا کیا عمر گریزاں کا

رُخ روشن ترا جو دیکھتا ہے وہ یہ کہتا ہے — سحر کو کوئی منہ دیکھے تو ایسے ماہ تاباں کا

بہار آئی ہے سائل ساغر مے کا وہ ساقی ہے — چمن سرسبز ہیں آتش کرم ہے ابر باراں کا

۳

خواب میں مجھ کو خیال نرگس مستانہ تھا — آنکھ کھولی تو لبالب عمر کا پیمانہ تھا

اے پری پیکر نہ جب تک میں ترا دیوانہ تھا — یہ جو روشن ہے چراغ حسن بے پروانہ تھا

حسن عالمگیر چھپ سکتا چھپائے سے نہیں — پردے میں تو کوچہ و بازار میں افسانہ تھا

آج کل سے سلسلہ مہر و محبت کا نہیں — عالم ارواح میں میرے ترے یارانہ تھا

نیند اڑ جاتی جو سنتا یار میرا حال دل — خواب شیریں تلخ کر دیتا یہ وہ افسانہ تھا

پردہ ہائے گوش تک سننے کو آ جاتی ہے جان — کس قدر دلچسپ حسنِ یار کا افسانہ تھا

حال پر اپنے توجہ کی نظر تھی جن دنوں
آفتابِ ذرہ پرور جلوۂ جانانہ تھا

مصحفِ روئے حقیقت کی تلاوت سے کھلا
عشق معشوق مجازی ابجدِ طفلانہ تھا

ساقیا تعریف تیرے میکدے کی کیا کروں
ساتھ کیفیت کے تھا لبریز جو پیمانہ تھا

واہ ری نیرنگ سازیِ طلسمِ زندگی
محوِ بت آنکھیں تھیں دل اللہ کا دیوانہ تھا

روشنی دل میں تصور سے تھی حسنِ یار کے
گنج کی دولت سے مالامال یہ ویرانہ تھا

حسن دے کر عاشقِ شیدا دئے اللہ نے
ان بتوں کو لازم آتش سجدۂ شکرانہ تھا

۴

مری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا
ہمیشہ صورتِ ساحل رہے آغوش میں دریا

خموشی اور گویائی مری اک اک سے بہتر ہے
سکوت میں یہ قطرہ ہے گہر تو جوش میں دریا

کیا جو ضبط گریہ تو کیا دریا کو کوزے میں
کبھی دل کھول کر رویا تو آیا جوش میں دریا

اگر موتی نہ بنتے قطرہ ہائے ابرِ نیساں سے
تو حلقہ ڈالتا آتش صدف کے گوش میں دریا

۵

دل کے آئینے میں کر جوہرِ پنہاں پیدا
در و دیوار سے ہو صورتِ جاناں پیدا

خار دامن سے الجھتے ہیں بہار آئی ہے
چاک کرنے کو کیا گُل نے گریباں پیدا

باغ سنساں نہ کر ان کو پکڑ کر صیاد
بعد مدت ہوئے ہیں مرغِ خوش الحاں پیدا

اب قدم سے ہے مرے خانۂ زنجیر آباد
مجھ کو وحشت نے کیا سلسلۂ جنباں پیدا

اک گل ایسا نہیں ہووے نہ خزاں جس کی بہار
کون سے وقت ہوا تھا یہ گلستاں پیدا

موجد اس کی ہے یہ روئی ہماری آتش
ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتی شبِ ہجراں پیدا

۶

تار تار پیرہن میں بھر گئی ہے بوئے دوست
مثل تصویرِ نہالی میں ہوں پہلوئے دوست

چہرۂ رنگیں کوئی دیوانِ رنگیں ہے مگر
حسنِ مطلع ہیں جبیں مطلع ہے صاف ابروئے دوست

ہجر کی شب ہو چکی روز قیامت سے دراز دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست
دور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار کا آئینہ کو سینۂ صافی نے دکھایا روئے دوست
واہ ری شانہ کی قسمت کس کو یہ معلوم تھا پنجۂ شل سے کھلیں گے عقدہائے موئے دوست
داغ دل پر خیر گذرے تو غنیمت جانئے دشمن جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست
دو مریں گے زخم کاری سے تو حسرت ہے ہزار چار تلواروں میں شل ہو جائیگا بازوئے دوست
فرش گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست
یاد کر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم جب اڑاتی ہے ہوائے تند خاک کوئے دوست
اُس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

۷

بہار آئی ہے عالم ہے گل و نسرین و سوسن کا جوانانِ چمن نازاں ہیں اپنے اپنے جوبن پر
خدا عالی مقاموں کو ہے لازم خاکساروں سے پیادے غالب آئے ہیں سوار پشت توسن پر
ادب آموز ہے ہر ایک ذرہ اپنے وادی کا نہیں ممکن کہ گرد اڑ کے پڑے رہرو کے دامن پر
نہایت بلبل شیدا کا اس نے دل جلایا ہے جو بس ہووے تو رکھ دوں آگ میں گلچیں کے دامن پر
نہ دیکھا سخت طینت کو کبھی سرسبز دنیا میں شگوفہ پھولنا باقی نہیں دیوار آہن پر
حرارت طور کے شعلے کی ہر اک دانہ رکھتا ہے یقیں ہے خاک ہو بجلی گرے گر اپنے خرمن پر
جو کامل ہیں نہیں اندیشہ آتش اُن کو دشمن کا دہان زخم کاری خندہ زن ہیں چشم سوزن پر

۸

آشنا معنی سے صورت آشنا ہوتا نہیں آئینہ دل کی طرح سے حق نما ہوتا نہیں
دردمند عشق جویائے دوا ہوتا نہیں تندرستی سے یہ بیمار آشنا ہوتا نہیں
خار خار دہر سے دل آشنا ہوتا نہیں مثل آب و رنگ گل مل کر جدا ہوتا نہیں
کس کو پیوند زمیں کرتی نہیں یہ فتنہ ناز کون سا سرکش تمہاری خاک پا ہوتا نہیں

دیکھئے کب تک نہیں ہوتی قیامت آشکار ... تا کجا دیدار کا وعدہ وفا ہوتا نہیں
اک قلندر کی پسند آئی مجھے یہ کتنی بات ... چادر ابرو کی صفا سے دل صفا ہوتا نہیں
گوہر شبنم بہم پہنچائیں گلہائے چمن ... یار کا سا خندۂ دنداں نما ہوتا نہیں
استخوان آتش کے ہیں رزق سگان کوئے یار ... اس سعادت کا شرف بہرِ ہما ہوتا نہیں

۹

غبار راہ ہیں گو آج ہم ان بے سواروں میں ... سمندِ عمر منزل طے کرے گا دو ہزاروں میں
گئے بتخانہ تو جا کر کیا طوف حرم ہم نے ... اڑائی تیری خاطر خاک کن کن رہگذاروں میں
نہ دو آنسو گرے یادِ الٰہی میں ان آنکھوں سے ... اڑا کی خاک ہی میرے چمن کے آبشاروں میں
ہوا ہے قحط کیوں عالم میں موسیٰ و تجلی کا ... وہی پتھر نظر آتے ہیں اب تک کہساروں میں
میں وہ غم دوست ہوں جب کوئی تازہ غم ہوا پیدا ... نہ نکلا ایک بھی میرے سوا امیدواروں میں
نہ کر شبدیز گلگوں پہ غرور آشنا بھی اے خسرو ... پیادے روندیں گے کل آج ہے تو شہسواروں میں
رہا مثلِ خس و شعلہ مجھے ربط اہلِ عالم سے ... وہی دشمن ہوا جس کے بنا میں شہسواروں میں
کبھی کچھ کام بھی تو آئے میری ہمتِ عالی ... مگر چیرہ ہی لکھوایا ہے اے آتش سواروں میں

۱۰

اس شش جہت میں خوب تری جستجو کریں ... کعبے میں چل کے سجدہ تجھے چار سو کریں
پیدا کریں جو تجھ کو انھیں کو ہے دسترس ... یا مرد ہیں وہی جو تری جستجو کریں
اے بادشاہِ حسن فقیروں کی طرح سے ... عاشق دعائے خیر تجھے کو بکو کریں
تاثیر دار لوگ ہیں اللہ کے فقیر ... سنگِ صنم ہوں آپ جو ہم ذکرِ ہو کریں
موجود گو کہ تو ہے مگر چاہتا ہے شوق ... آوارہ ہوں تلاش تری چار سو کریں
آتش یہ وہ زمیں ہے کہ جس میں ہے قولِ درد ... دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

۱۱

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

میری اینڈ کے لئے مردے میں جان آتی ہے
کاٹنے دوڑتی ہے ماہیِ بے آب مجھے

دہنِ گرگ سے جیتا جو بچوں صحرا میں
ذبح کرنے کے لئے مول لے قصاب مجھے

نہیں رکھتے ہیں امیری کی ہوس مردِ فقیر
شیر کی کھال ہی ہے قاقم و سنجاب مجھے

دل غنی چاہئے گو ہوں میں فقیر اے آتش
شیر کی کھال ہی ہے قاقم و سنجاب مجھے

۱۲

کفن دوزوں میں قبر اہلِ دولت کا فسانہ ہے
تمامی کی ہے چادر بادلے کا شامیانہ ہے

سیاہی دور کر دل کی تو پیدا نورِ عرفاں ہو
سرِ افعی کو کچلا جس نے مال اُس کا خزانہ ہے

وبال جاں ہوا ہے جسمِ خاکی ضعفِ پیری سے
قفس سے تنگ بلبل کو خزاں میں آشیانہ ہے

نہ مطلب کشت سے رکھئے نہ خرمن سے غرض آتش
سمجھ لے اپنے منھ میں رزق جو قسمت کا دانہ ہے

۱۳

چمن میں جا کے کن آنکھوں سے دیکھوں داغ لالے کا
یہ میرا داغِ دل بھی داغ لالے کی نشانی ہے

نسیمِ صبح سے مرجھایا جاتا ہوں وہ غنچہ ہوں
وہ گل ہوں میں مجھے شبنم بلائے آسمانی ہے

خرابی سے ارادہ ہے مکاں تعمیر کرنے کا
گرا گر قصرِ تن کو گور کی منزل اٹھانی ہے

الٰہی طولِ عمرِ خضر دے یادِ بہاری کو
مزارِ بیکساں پر پھولوں کی چادر چڑھانی ہے

ارادہ عرشِ اعظم کا ہے آہِ صبح گاہی کو
در فریاد رس پر جل کے اب دھونی لگانی ہے

کوئی ویرانہ آتش کوئی آبادی نہیں باقی
تلاشِ گوہرِ مقصود میں کیا خاک چھانی ہے

۱۴

عارف ہے وہ جو حسن کا جویا جہاں میں ہے
باہر نہیں ہے یوسف اسی کارواں میں ہے

دکھلا رہی ہے دل کی صفا دو جہاں کی سیر
کیا آئینہ لگا ہوا اپنے مکاں میں ہے

دیوانہ جو نہ عشق سے ہو آدمی نہیں
حسن پری کا جلوہ طلسمِ جہاں میں ہے

دنیا سے کوچ کرنا ہے اک روز رہرو ہے
بانگ جرس سے شور ہی کارواں میں ہے

پڑھ سکتا سرنوشت کا مطلب کوئی نہیں
معلوم کچھ نہیں کہ یہ خط کس زباں میں ہے

حکمت سے ہے یہ خاک کا پتلا بنا ہوا
نور آنکھ میں ہے اس کی تو مغز استخواں میں ہے

آتش بلند پایہ ہے درگاہ یار کی
ہفتم فلک کی رفعت اسی آستاں میں ہے

۱۵

نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لئے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے

لطف چمن ہے بلبل گلزار کے لئے
کیفیت شراب ہے میخوار کے لئے

دشت عدم سے آئے ہیں باغ جہاں میں ہم
بے داغ لالہ رو گل بے داغ کے لئے

گفت و شنید میں ہوں بسر دن بہار کے
گل کے لئے ہے گوش زباں خار کے لئے

بلبل ہی کو بہار کے جانے کا غم نہیں
ہر برگ ہاتھ ملتا ہے گلزار کے لئے

احساں جو ابتدا سے ہے آتش وہی ہے آج
کچھ انتہا نہیں کرم یار کے لئے

ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق

شیخ محمد ابراہیم نام ذوق تخلص۔ شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے۔ جو ایک غریب سپاہی تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق آخر ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ کو پیدا ہوئے۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول کے پاس بٹھائے گئے۔ جو بادشاہی حافظ اُن کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ اُن کے یہاں ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ اُسی زمانے میں ان کو شعر و شاعری کا شوق ہوا شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے۔ کہتے کہتے خود اُستاد ہو گئے۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ اُن کے ولی عہد مرزا ابوظفر کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے عاشق شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص کرتے تھے۔ اس لئے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ سب وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ میر کاظم حسین بیقرار ذوق کے ساتھ کے پڑھے ہوئے شاہ نصیر کے شاگرد۔ ولی عہد کے ملازم خاص تھے۔ اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ انھیں کی وساطت سے یہ قلعے میں پہنچے۔ اور اکثر دربار ولی عہدی میں جانے لگے۔ شاہ نصیر مرحوم جو ولی عہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین

اُن کی غزل بنانے لگے۔ کچھ دنوں بعد وہ بھی جان الفنسٹن صاحب کے ساتھ میر منشی ہوکر شکارپور سندھ وغیرہ گئے۔ اُس وقت سے شیخ مرحوم غزلوں پر اصلاح دینے لگے۔
چند سال کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع واقسام کے صنائع وبدائع صرف کئے تھے۔ اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا فرمایا۔ اُس وقت شیخ کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ اُس قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن   آب وایلولہ ہوئے نشوو نمائے گلشن

جب مرزا ابو ظفر بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے تو اُنھوں نے پہلے یہ قصیدہ گذرانا۔

روکش ترے رُخ سے ہوا نور سحر رنگ شفق   ہے ذرہ تیرا پرتو نور سحر رنگ شفق

آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی تو اُنھوں نے ایک قصیدہ غرا کہہ کر نذر گذرانا۔ اُس پر خلعت کے علاوہ خان بہادر کا خطاب اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہہ کر گذرانا جس کا مطلع یہ ہے ؎ شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت الخ اس پر ایک گانوں جاگیر میں عطا ہوا۔
۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کے دن صبح ہوتے ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎ کہتے ہیں ذوق آج جہاں سے گذر گیا   کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
شیخ صاحب کو علم موسیقی۔ نجوم رمل۔ طب میں بھی دخل تھا۔

غزلوں پر رائے مضامین تازہ ہوتے ہیں۔ کلام صاف وعام فہم ہے۔ ترکیب چست۔ محاورے خوب باندھتے ہیں۔ آپ کا ابتدائی کلام سودا کے ڈھنگ کا ہے۔ مگر بعد میں میر اور درد وغیرہ کے ڈھنگ پر کہنے لگے تھے۔

قصائد پر رائے سودا کے بعد کسی نے آپ سے بڑھ کر قصیدے نہیں لکھے۔ فارسی کے مشہور قصیدہ گو انوری۔ ظہیر۔ نظیری۔ عرفی وغیرہ فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکے۔ لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دکھایا۔

عموماً انداز کلام کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے اُنھیں ایسی شان وشکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ اُنھیں قادر کلامی کے دربار سے ملک سخن پر قدرت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارے کی خوشبو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے۔ اور منھ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ

ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جیسے جہاں سجا دیکھتے ہیں وہ گویا دہن کے لئے ہوتا ہے وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کون سا ہے کہ سادگی میں رنگ دے جائے گا۔ اور کون سہا رنگینی میں۔ کامل مصور کی تیزی قلم کو اس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انہیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستے سے پلا دیا۔ ان کی قدرت کلام ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورے اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشے کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے ہر شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے۔

قصیدۂ مبارکباد جشن غسل صحّت

بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کہ اس بڑھاپے میں خدا نے دوبارہ زندگی دی۔ غسل صحّت کا جشن ہوا۔ مبارکباد میں یہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اس پر خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی عطا ہوا۔

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر — عیاں ہو خامے سے تحریر نغمہ جائے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑیئے تو پیدا ہو — نفس کے تار سے آوازِ خوشتر از بم و زیر

ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش — کلیدِ قفلِ دلِ تنگ و خاطرِ دلگیر

کرے ہے وا لبِ غنچہ در ہزار سخن — چمن میں موجِ تبسّم کی کھول کر زنجیر

کچھ انبساط ہوائے چمن سے دور نہیں — جو وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر

قفس میں بیضے کے بھی شوقِ نغمہ سنجی ہے — عجب نہیں کہ ہو مرغِ چمن بنالہ صفیر

اثر سے بادِ بہاری کے لہلہانے میں — زمیں یہ ہمسرِ سنبل ہے موجِ نقشِ حصیر

نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں — تو سبز فیضِ ہوا سے ہو وہ بہ رنگِ شعیر

زمیں پہ گرتے ہی سے کرلے دانہ برگ و ثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر

ہوا یہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

نہ خار دشت ہے نرمی میں خواب مخمل ہے
ہر ایک تار رگ سنگ بھی ہے تار حریر

ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دود گلخن بھی
برستا اٹھتا ہے آتش سے مثل ابر مطیر

یہ آیا جوش میں باران رحمت باری
کہ سنگ سنگ میں سنگ یدہ کی ہے تاثیر

ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغر عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی طرح خوشاب
ہر اک گھر گہر شب چراغ پر تنویر

کرے ہے صبح شکر خندہ اس مزے کے ساتھ
کہ جس طرح بہم آمیختہ ہوں شکر و شیر

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلف مشکیں کو
سواد مشک ختن پر ہے لاکھ آہو گیر

نہال شمع سے ہر شب چنے گل شب بو
بہار عیش میں گلچیں کی طرح سے گلگیر

ہنسے چراغ تو ایسے ہنسی میں پھول جھڑیں
حیا سے رنگ گل آفتاب ہو تغییر

رہے ہے چرخ پہ ہر صبح جوں صبوحی کش
بایں درازی ریش آفتاب ساغر گیر

عجب نہیں ہے کہ آرائش زمانہ سے
خدائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر

چمن میں ہے یہ درختان سبز پہ جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزان خطۂ کشمیر

نہ کیونکہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع
کہ آتی ہے نظر اک قدرت خدائے قدیر

ظہور نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیم نکہت گل اطہر و لطیف و خبیر

شمیم عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں
کہ فرش عنبر آگیں ہے زمیں تو گرد عبیر

حمل سے حوت تلک جابجا ہیں تصویریں
بنا ہے عالم بالا بھی عالم تصویر

جہات ستہ سے بزم جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجوم نشاط و سرور جم غفیر

زمانہ دشمنِ عشرت کا اس قدر قائل ۔۔۔ یہ صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر
ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہ عیش و نشاط ۔۔۔ کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر
اگر پیالا ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ ۔۔۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر
زمین مے کدہ یہ خندۂ نشاط انگیز ۔۔۔ کہ لائے مے سے ہو دیوار قہقہہ تعمیر
دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسل صحت نے ۔۔۔ ضمیر خلق سے اے بادشاہِ پاک ضمیر
عجب نہیں یہ ہوا ہے کہ مثل نبض صحیح ۔۔۔ کرے اگر حرکت موج چشمۂ تصویر
شہنشہا ترے یمن شفائے کامل سے ۔۔۔ جو لاعلاج مرض تھے یہ ہیں علاج پذیر
کہ چوب گل کو اگر ماریں بید مجنوں پر ۔۔۔ تو صورت بشر ہو شمتید خوش تقریر
اشارہ فہم ہو ایسا کہ وہ بیان کرے ۔۔۔ زبان برگ سے گونگوں کے خواب کی تعبیر
جو میل کحل بصارت ہو کلک خط غبار ۔۔۔ تو چشم دائرۂ عین بھی ہو چشم بصیر
نہ موج مے کو ہو پیچش نہ شیشہ لے ہچکی ۔۔۔ گئی جہاں سے یہ بیماری فواق و زحیر
نہ برق کو تپ لرزہ نہ ابر کو ہو زکام ۔۔۔ نہ آب میں ہے رطوبت نہ خاک میں تبخیر
بدل گئی ہے حلاوت سے تلخیٔ دارو ۔۔۔ شراب تلخ بھی ہو میکشوں کو شکر و شیر
قوی ہے قوت تاثیر سے دوائے طبیب ۔۔۔ غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر
شکست دل کو ترے یمن تندرستی سے ۔۔۔ کرے درست اگر مومیائی تدبیر
تو موئے کاسۂ چینی کو چارہ ساز قضا ۔۔۔ نکالے کاسۂ چینی سے مثل موئے خمیر
کھائے سر جو کبھی مفسدان سرکش کا ۔۔۔ علاج خارش سر ہو یہ ناخن شمشیر
بنا ہے نقش شفا خانۂ ہزار شفا ۔۔۔ ہر ایک خانۂ تعویذ صاحب تکسیر
ہر ایک اسم عزیمت میں اسم اعظم ہے ۔۔۔ ہر ایک نسخہ شفا میں ہے نسخۂ اکسیر
رہا نہ کوئی گرفتار رنج عالم میں ۔۔۔ چھٹے جو تیرے تصدق میں مجرمان اسیر
شہا ہے دم سے ترے زندگانیِ عالم ۔۔۔ یہ تیرا دم ہے وہ اعجاز عیسوی تاثیر

تو وہ ہے حامی دنیا و دیں زمانے میں ۔۔۔ کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر
کیا شہان جہاں نے مسخر ایک جہاں ۔۔۔ کئے ہیں تو نے شہنشاہ دو جہاں تسخیر
سحر سے شام تلک زر فشاں ہے پنجۂ مہر ۔۔۔ نثار کرتا ہے ہر روز ایک گنج خطیر
فلک یہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجدۂ شکر ۔۔۔ نشان سجدہ ہے زیب جبین ماہِ منیر
یہ روز یہ سے ترے ہے جوان جہان کہن ۔۔۔ کہے نہ کوئی دوشنبہ کو بھی جہاں میں پیر
حیات بخش جہاں تیرا مژدۂ صحت ۔۔۔ جو بخشے خلق کو عمر طویل و عیش کثیر
جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت ۔۔۔ صحیح جیسے کہ قرآں ہو مع تفسیر
یہ وہ خوشی ہے کہ فربہ ہوں جس سے روز بروز ۔۔۔ ہلال بست و نہم کی طرح بدن کے حقیر
پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلع روشن ۔۔۔ کہ جس کا مطلع خورشید بھی نہ ہووے نظیر

شہنشہا وہ تری روشنی رائے منیر ۔۔۔ عقول عشرہ کے انوار جس کے عشر عشیر
جو ہیں نکات معانی بشر کی فہم سے دور ۔۔۔ وہ تیرے ذہن میں موجود سب قلیل و کثیر
اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظے میں تو یہ ۔۔۔ نہ اپنا یاد ہے احساں نہ اور کی تقصیر
ترا تو سیئہ بھی یوں ہے داخلِ حسنات ۔۔۔ کہ جیسے صحبت اصحاب کہف میں قطمیر
مجال کیا کہ ترے عہد میں شرر کی طرح ۔۔۔ اُٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشان شریر
ہوا میں آ کے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ ۔۔۔ تو چٹکیاں دل آتش میں لے ہے آتشگیر
وہ برق قہر خدا تیری تیغ آتش دم ۔۔۔ کہ جس کی آنچ ترے دشمنوں کو نار سعیر
جو ہے خدنگ کا تیرے نشانہ چشم حسود ۔۔۔ تو ہے تفنگ کا تیرے دل مدد نخچیر
جو تیر نکلے کماں سے تری وہ ہو جاوے ۔۔۔ طلب میں جان عدو کی رواں قضا کا سفیر
ترا سمند ہے وہ تیز رو کہ وقت خرام ۔۔۔ نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی نہ اُسکا نظیر
کہ سیر گاہ ہے اُس کی تو راہ یک روزہ ۔۔۔ اور اُس کا شرق سے تا غرب عرصہ گاہ منیر

چلے نہ اشرفیِ آفتاب عالم میں
خط شعاع سے اُس پر جو یہ نہ ہو تحریر

ابو ظفر شہ والا گہر بہادر شاہ
سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر

شہ بلند نگہ شہریار والا جاہ
خدیو مہر کلہ خسرو سپہر سریر

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤید و اختر معین و بخت نصیر

زمیں ہو سبز جو تیرے سحاب بخشش سے
تو بونٹی بونٹی سے ہر خاک کی بنے اکسیر

نہ ہے ثنا کے لئے تیرے اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لئے تیری انتہا و اخیر

مگر یہ ذوقِ ثنا سنج و مدح خواں ترا
غلام پیر کہن سال اک فقیر حقیر

کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ
سنا ہے جب سے کہ رحم خدا دعائے فقیر

الٰہی اب یہ تا ہو زمیں، زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا فلک، اور فلک کو ہو تدویر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامنِ مسیح حیات
زمیں پہ فقر کی تا ہو فنا نہ دامن گیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادر قیوم
بجادہ دولت و اقبال و عزت و توقیر

تن قوی و مزاجِ صحیح و عمر طویل
سپاہ وافر و ملک وسیع و گنج خطیر

غزلیات

جدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہو رقیب جدا
ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا

تری گلی سے نکلتے ہی اپنا دم نکلا
رہے ہے کیونکہ گلستاں سے عندلیب جدا

الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں
کہ دم بخود ہے مؤذن جدا خطیب جدا

ہے اور علم و ادب مکتب محبت میں
کہ ہے وہاں کا معلم جدا ادیب جدا

فراق خلد سے گندم ہے سینہ چاک اب تک
الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

کیا حبیب کو مجھ سے جدا فلک نے مگر
نہ کر سکا مرے دل سے غم حبیب جدا

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

۲

نالہ ہے اُن سے بیاں دردِ جدائی کرتا
کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا
دیکھتا اُس بتِ مغرور کا گر جاہ و جلال
کبھی فرعون نہ دعوائ خدائی کرتا
خاک آئینے سے ہے نام سکندر روشن
روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا
نہیں گوش شنوا باغ جہاں میں غافل
ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا
بند آنکھیں کئے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے
ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا

۳

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو
اس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہم کو
کہ فلک آیا نظر خال سے چھوٹا ہم کو
ہم وہ مجنوں ہیں کہ دل بنا ہے صحرا ہم کو
اور جوں خیمۂ لیلیٰ ہے سویدا ہم کو
جا بجا نام تو جوں نقش قدم چھوڑ گیا
خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈنے عنقا ہم کو
اور ہمہ رد کہاں! ہو نہ ہوئے حضرت دل
در داب تم کو ہمارا ہو تمھارا ہم کو
آن پہنچی سرِ گرداب فنا کشتیٔ عمر
ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھوکا ہم کو
اپنا ہے کعبۂ مقصود فقط گوہر دل
طوف گرداب صفت چاہیئے اپنا ہم کو
ایک دم عمر طبیعی ہے یہاں مثل حباب
فکر امروز ہے نے ہے غم فردا ہم کو
مل گئیں خاک میں جو صورتیں ہے اُنکا خیال
کیوں نہ فانوس خیالی ہو بگولا ہم کو
واہ قسّام ازل! صدقے ہم اس قسمت کے
جام عشرت اُسے۔ اور داغ تمنّا ہم کو
ذوق بازی گہ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

۴

ترے کوچے کو وہ بیمار غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے
ستم کو ہم کرم سمجھے۔ جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

برائی میں ہماری گر وہ بت اپنا بھلا سمجھے   بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے
ترے کشتے جو یوں خواب عدم سے یک بیک چونکے   مگر شور قیامت کو تری آواز پا سمجھے
نسیم صبح گلشن میں اگر ہوئے دم عیسیٰ   ترا بیمار غم تجھ بن سموم جان گزا سمجھے
کہو بلبل سے چلتا کارواں ہے نکہت گل کا   چمن باد صبا سمجھے کہ آواز درا سمجھے
حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا   حساب دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے
حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے   انہیں سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے
ہنسے ہے زخم دل تدبیر پر جراح سے کہہ دو   انہیں ٹانکے نہ سمجھے خندۂ دنداں نما سمجھے
عدو آیا ہے بن کر نامہ بر لکھا نصیبوں کا   کریں گے لے کے خط کیا مدعی سے مدعا سمجھے
مجھے آتا ہے رشک اس بد مے آشام پر ساقی   نہ جو دع ما کدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے
نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمر رفتہ کا   مگر سمجھے تو داغ معصیت کو نقش پا سمجھے
نحوست بھی سعادت ہو گئی سودے میں زلفوں کے   گلیم تیرہ بختی سر پہ ہم ظل ہما سمجھے
کشاد کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا   خرد کے تیز ناخن ناخن انگشت پا سمجھے
سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اس کی   کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

۵

کیا تمہیں لب اولی الابصار نظر آتا ہے   یاں تو اغیار میں بھی یار نظر آتا ہے
معنی رنگ خموشی سے جو دل ہو آگاہ   برگ گل میں لب اظہار نظر آتا ہے
جتنا بیہوش ہو اتنا ہی سوا ہو آرام   مست ہاتھی ہو تو بے یار نظر آتا ہے
آنکھ اٹھا کر تو ذرا دیکھ کہ زیر افلاک   جو ہے سرکش وہ نگوں سار نظر آتا ہے
میری آنکھوں میں نظر آتا ہے عالم ویراں   دل کا ویرانہ جو بے یار نظر آتا ہے
عالم دل میں کبھی آکے فلک کو دیکھو   کیا لیس پردۂ زنگار نظر آتا ہے
بڑھ کے چمکا جو زمانے میں دکھائی دیکم   رو ذکب اختر دم دار نظر آتا ہے

جو جواں مرد علائق میں پھنسا ہے وہ مجھے ... شیر پنجرے میں گرفتار نظر آتا ہے
دل نے ہے دیکھ لیا دفتر تقدیر تمام ... فلک اک نقطۂ بے کار نظر آتا ہے
صحبت اہل صفا دیتی ہے سرکش کو الٹ ... نخل پانی میں نگوں سار نظر آتا ہے
تنگ جو زیست سے ہیں تختۂ تابوت انھیں ... مرکے اک تخت ہوا دار نظر آتا ہے
دُر مضموں ہیں اے ذوق نرے بیش بہا ... کم کوئی اُن کا خریدار نظر آتا ہے

۶

الٰہی کس کے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کُشتنی ہے ... کہ آج کوچے میں اُسکے شور ربّنا ذنبنا قتلتنی ہے
غم جدائی میں تیری ظالم کہوں میں کیا مجھ پہ کیا بنی ہے ... جگر گدازی ہے سینہ کاوی ہے دل خراشی ہے جاں کنی ہے
زمیں پہ نور قمر کے گرنے سے صاف اظہار روشنی ہے ... کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ اُن کی فروتنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اسکی فروتنی ہے ... دگرنہ قندیل عرش میں بھی اُسی کے جلوے کی روشنی ہے
ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن ... کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے
ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا خنگ و آشتی سے ... اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے
لگا نہ اس بتکدے میں تو دل۔ یہ ہے طلسم شکست غافل ... کہ کیسا ہی کوئی خوش شمائل صنم ہے آخر شکستنی ہے
نہیں ہے قانع کو خواہش زر۔ وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر ... جہاں میں مانند کیمیا گر ہمیشہ محتاج دل غنی ہے
کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہ لیکن ... جو اس کے نزدیک رہبری ہے۔ وہ اُسکے نزدیک رہزنی ہے

۷

خط بڑھا۔ کاکل بڑھے۔ زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے ... حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
تیرے جلوے سے چمن میں رونق اے گلرو بڑھے ... شاخ گلبن میں بڑھے گل۔ گل میں رنگ و بو بڑھے
بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی ... اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی وحشت وگرنہ پہلے آہ ... ہاتھ کے ناخن بڑھے۔ سر کے ہمارے مو بڑھے
واہ ساقی کیا ہی دی ہے دارو ئے فرحت فزا ... جس کے اک قطرے سے سیروں جسم میں لہو بڑھے

یوں دم گریہ ہوا دل سے مرے نالہ بلند
جس روش پانی کے باعث سر گرداب جو بڑھے

حسن کیفیت سے ہو معمور اگر مینائے دل
پھر تو جام جم سے قدر کاسۂ زانو بڑھے

چرخ پر نور قمر راتوں بڑھے راتوں گھٹے
حسن تیرا روز بہ روز اے ہلال ابرو بڑھے

کچھ تپ غم تو گھٹا کیا فائدہ اس سے طبیب
روز نسخے میں اگر خرفہ گھٹے کاہو بڑھے

چاہتا ہے دل بڑھے الفت کی ان سے رسم و راہ
پر وہاں قابو نہیں کس طرح بے قابو بڑھے

پیشوائی کو غم جاناں کی چشم و دل سے ذوق
جب بڑھے نالے تو اُن سے پیشتر آنسو بڑھے

٨

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ پیاسے ہیں مے آشام مہینا بھر کے

آشناؤں سے اگر ایسے ہی بیزار ہو تم
تو ڈبو دو انہیں دریا میں سفینہ بھر کے

روز اس گلشنِ رخسار سے لے جاتے ہیں
اپنے دامان نظر مردم بینا بھر کے

دل ہے آئینہ صفا چاہئے رکھنا اس کا
زنگ سے بھرتا ہے کچھ اس میں تو کینہ بھر کے

جام خالی بھی لگا منہ سے نہ کم ظرف کے ساتھ
ذوق کے ساتھ قدح ذوق سے پینا بھر کے

٩

پھولا نہیں سماتا جو گل پیرہن میں ہے
آتا یہ کس بھروسے پہ ہنستا چمن میں ہے

دم کو نہیں ہے سینے میں آرام ایک دم
یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے
اس درد سے عقیق کا دل خوں یمن میں ہے

رنگیں ہے آج کل کے گل نو بہار سے
اگلا جو برگ زرد کوئی اس چمن میں ہے

ہوش و خرد کو دیکھ لیا درد سر میں ذوق
آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ پن میں ہے

١٠

تدبیر نہ کر ۔ فائدہ تدبیر میں کیا ہے
کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

اے اہل نظر ! عالم تصویر کو دیکھو
تصویر کا کیا دیکھنا ۔ تصویر میں کیا ہے

پارے کی جگہ کشتہ اگر ہو دل بیتاب ‌ ‌ پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے
بیٹھا ہے در کعبہ پہ حیراں ترا شیدا ‌ ‌ لبیک میں کیا ہوتا ہے تکبیر میں کیا ہے
یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے۔ نہ کھلے گا ‌ ‌ کیا جانے دل عاشق دل گیر میں کیا ہے
زاہد کی طرف دیکھو نہ تم میرے دم ذبح ‌ ‌ لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے
ذوق اس لب شیریں کا جو تو وصف ہے کہتا ‌ ‌ کیا کہئے حلاوت تری تقریر میں کیا ہے

مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ مرزا نوشہ

شب ہشتم ماہ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا کے آبا و اجداد ایک قوم کے ترک تھے ان کا سلسلہ نسب تورا بن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ آپ کے دادا جو شاہزادہ ترسم خاں کی اولاد سے تھے۔ شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے۔ اُن کی زبان ترکی تھی۔ مرزا نجف خاں جو شاہ عالم کے مصاحب تھے۔ ان کے ذریعے سے فوج کے ایک معزز عہدے پہ سرفراز ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا۔ نصر اللہ بیگ خاں۔

عبد اللہ بیگ خاں (مرزا کے والد) لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہنچے وہاں نوکر ہوئے۔ چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہنچے اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی اور وہ آگرے واپس چلے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے الور کا قصد کیا راجہ بختاور سنگھ نے ابھی ان کو کوئی خاطر خواہ جگہ نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انھیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے جو فوج گڑھی کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی تھی اُسی کے ساتھ عبد اللہ بیگ خاں بھی بھیجے گئے وہیں ان کے گولی لگی اور اُن کا انتقال ہو گیا۔

راجہ بختاور سنگھ نے دو گانوں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دونوں بیٹے میرزا اسد اللہ خاں اور مرزا یوسف خاں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا جو ایک مدت دراز تک جاری رہا۔ مرزا کے والد کی وفات کے بعد اُن کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے ان کی پرورش کیا۔

جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہو گئی تو نواب فخر الدولہ احمد بخش خان نے مرزا کے چچا کو سرکاری فوج میں بعہدۂ رسالہ داری ملازم کرا دیا۔ اُن کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے سرکار سے اُن کے نام مقرر ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے۔ دونوں پرگنے اُن کے نامزد رہے۔ اور اُن کی وفات کے

بعد اُن کے وارثوں کی پنشن سرکار نے فیروز پور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرا دی جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب یہ پنشن بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی۔ تو پنشن پھر جاری ہو گئی۔ اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔

مرزا معہ اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرے ہی میں رہے۔ ۱۳ برس کے سن ۱۲۲۵ھ میں ان کی شادی دہلی میں ہوئی۔ اُس وقت سے دہلی میں رہنے لگے۔ اور اخیر عمر تک وہیں رہے مرزا کے نانا بڑے امیر کبیر تھے۔ اس لئے مرزا کا بچپن اور عہد شباب نہایت فارغ البالی سے گذرا۔ ۱۲۶۶ھ میں ابو ظفر بہادر شاہ نے مرزا کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب معہ خلعت عنایت فرمایا۔ ۱۲۷۰ھ میں بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی۔

۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ۷۳ برس ۴ مہینے کی عمر میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ سلطان نظام الدین قدس سرہٗ العزیز میں دفن کئے گئے۔ آہ غالب بمرد تاریخ وفات ہے

مرزا اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اردو اُن کی مادری زبان نہ تھی۔ مگر اُس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ اس زبان کے بھی مسلم الثبوت استاد ہو گئے۔ تصنیفات اردو میں تقریباً ۱۸ سو شعر کا انتخابی دیوان ہے کہ ۱۸۶۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔

اُن کے کلام میں علاوہ جدت مضامین اور رفعت خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو اور دو ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اوّلاً عام اور متبذل تشبیہیں تا امکان استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ ہمیشہ نئی تشبیہیں ایداع کرتے ہیں۔ دوسرے مرزا نے استعارہ۔ کنایہ۔ تمثیل کو جو لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے۔ بہت استعمال کیا ہے۔ تیسرے شوخی و ظرافت بہت زیادہ ہے۔ مگر ہجو یا فحش یا ہزل سے اپنی زبان قلم کو کبھی آلودہ نہیں کیا۔ چوتھے اکثر اشعار ایسے ہیں کہ بادی النظر میں اُس کے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے سے اس میں ایک اور معنی لطیف پیدا ہوتے ہیں۔

اردو میں رقعات کے دو مجموعے مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ عود ہندی۔ اردوئے معلّٰی۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے۔ گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ اس میں بھی فارسی کی ترکیب اور محاوروں کا استعمال کر گئے ہیں۔ ان خطوط کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انھیں کا ایجاد تھا۔ کہ آپ مزا لے لیا۔ اور اوروں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں۔

غزلیات

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتن گلہائے راز کا

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں — طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے — ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسد — سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

٢

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دود چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد — کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

ہے نوآموز فنا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب — آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

٣

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے — جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا — لذت ریش جگر غرق نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

٤

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا — آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

٥

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اُس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی — آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

٦

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں حرم نہیں - در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟

جب وہ جمال دل فروز صورتِ مہر نیم روز
آپ ہی نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

قید حیات و بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں کوئی ہمیں بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُسکی گلی میں جائے کیوں؟

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا - کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

٧

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خون جگر - سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

بھلا اُسے نہ سہی - کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

٨

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

رَو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل وجود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

۹

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کی آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

۱۰

نکتہ چیں ہے غم دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے؟ تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بنے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۱۱

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۲

حسنِ مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

۱۳

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غمہائے نہانی اور ہے

یارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں | پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر | کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام | ایک مرگ ناگہانی اور ہے

۱۴

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو | نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں | سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو | نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا | تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم | گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ | کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے | نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے | ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں | عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی | بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو۔ پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب | ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

۱۵

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے | نالہ پابند نے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے | پر تجھ سے تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی | ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے
شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے | اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب | آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں ہے

میر ببر علی انیس

میر مستحسن خلیق کے بیٹے اور میر حسن دہلوی کے پوتے تھے۔ سنہ ولادت کا پتہ کسی تذکرے سے نہیں چلتا۔ مگر عمر کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۲۲۰ھ یا اس کے قریب قریب زمانے میں آپ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ کی فیض آباد ہی میں ہوئی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں آپ لکھنؤ تشریف لائے۔ وہاں کتب متداولہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور برابر کتب بینی کرتے رہے۔ فن شاعری کی ضروریات سے وہیں آگاہی حاصل کی۔ اپنے خاندانی کمال میں اپنے باپ کے شاگرد تھے۔

ابتدا میں انھیں بھی غزل کا شوق تھا۔ ایک موقعے پر کہیں مشاعرے میں گئے اور غزل پڑھی ہر ہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ یہ سن کر دل میں تو باغ باغ ہوا۔ مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں گئے تھے؟ انھوں نے حال بیان کیا۔ غزل سنی اور فرمایا کہ بھائی اب اس غزل کو سلام کرو۔ اور اُس شغل میں زور طبع کو صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اُسی دن اُدھر سے قطع نظر کی۔ غزل مذکور کی طرح میں سلام لکھا۔ دنیا کو چھوڑ کر دین کے دائرے میں آگئے اور تمام عمر اسی میں صرف کر دی۔ نیک نیتی کی برکت نے اسی میں دین بھی دیا اور دنیا بھی۔

ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلّٰی کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی۔ حسن بیان۔ لطف محاورہ۔ کلام کی صفائی اس درجہ ہے کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ انھوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیے۔ ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہر مرثیے کا چہرہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے۔ صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ۔ رات کی رخصت۔ سیاہی کا پھٹنا۔ نور کا ظہور۔ آفتاب کا طلوع۔ مرغزار کی بہار۔ شام ہے تو شام غریباں کی اداسی۔ کبھی رات کا سناٹا۔ کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیری کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے۔ غرض جس حالت کو لیا ہے۔ اُسی کا سماں باندھ دیا ہے۔

میر انیس نے تقریباً ۵۵ سال کا زمانہ اپنی عمر کا اسی شغل میں گذارا۔ ان کے اشعار کی تعداد تقریباً ۲ لاکھ سے کم نہیں۔ بلکہ ڈھائی لاکھ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اس میں تقریباً دس ہزار مرثیے ہیں اور باقی سلام اور رباعیاں ہیں۔

میر صاحب تقریباً ۲، یا ۴، برس کی عمر میں ۲۹۔ شوال ۱۲۹۱ھ ہجری بروز جمعہ اس دار فانی سے رحلت فرما ہوئے۔

قصیدہ

قصیدہ غزل کی طرح مطلع کے ردیف و قافیہ یا صرف قافئے کی پابندی سے لکھا جاتا ہے۔ قصیدہ کا درجہ غزل سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ غزل کا مقصد معشوق سے بات کرنا اور قصیدے کا موضوع بادشاہ اور ممدوح سے عرض کلام ہوتا ہے۔ اسی کے لئے دونوں اقسام ادب میں فرق ہونا لازمی ہے۔ اور ہر مقام کے مناسب حال الفاظ لانا۔ اور حسن مقال کی خوبیوں کو دکھانا بھی ایک زباں داں شاعر کا کمال ہے۔

قصیدے میں تشبیب۔ گریز۔ مدحِ ممدوح۔ یہ تین مقام خاص طور سے دیکھے جاتے ہیں۔ تشبیب میں لالہ و گل۔ و ریحاں و سنبل۔ جام و سبو۔ ساقی و مطرب اور دوسرے حسن شباب کے لوازم کا بیان ہوتا ہے۔ پھر ان سے گریز کر کے مدح پر توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ یہ مقام ایسا ہونا چاہئے۔ جو تشبیب کے بعد سامعین کو شوق سے مدح کے سننے پر آمادہ کر دے۔ پھر مدح ان لفظوں میں ہونا چاہئے جو اس درجے کے لائق ہو۔ اور اُن چیزوں کی مدح کرنی چاہئے۔ جو ممدوح کے ساتھ خاص نسبت رکھتی ہیں۔ یہ تینوں باتیں میر انیس کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

میر انیس نے اپنے اکثر مرثیوں کے چہرے جس آب و تاب سے آراستہ کئے ہیں۔ اُن میں تمام لوازم تشبیب کو دیکھ لیجئے۔ جو اس نبات سے کسی دیوان میں دیکھنے کو نہ ملیں گے۔ اور تشبیب کے بعد جس خوبصورتی سے انھوں نے مقام گریز کو ادا کیا ہے۔ وہ بجائے خود دیکھنے کی چیز ہے۔ پھر ائمہ علیہم السلام کو دین و دنیا کا بادشاہ سمجھ کر جس شان و شکوہ سے مدح سرائی کی اور جو الفاظ ہر مقام کے مناسب درجہ ادب صرف کیے۔ وہ ایسے ہی درجہ شناس زبان داں کا حصّہ ہو سکتے ہیں۔

رجز

عرب کی جنگوں میں رجز خوانی کا عام دستور تھا۔ ہر بہادر اور ہر پہلوان اپنے مقابل کے سامنے اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کی بہادری کا فخر اور اپنی شجاعت و شرافت کا ذکر کرتا تھا۔ شعرائے اردو میں یہ حصّہ مرثیہ گویان لکھنؤ کے سوا کسی کو نہیں ملا۔ اُن میں بھی میر انیس کے بیان رجز نے اردو کو خاص فخر کا موقع دیا۔

امام حسین علیہ السلام کا رجز

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا   سرداریِ فردوس کا افسر ہمیں بخشا

اقبال علی، خلق پیمبر ہمیں بخشا	قدرت ہمیں دی، زور ہمیں، زر ہمیں بخشا
ہم نور ہیں گھر طور تجلا ہے ہمارا	تخت بن داؤد مصلا ہے ہمارا
کس جنگ میں سینے کو سپر کر کے نہ آئے	کس مرحلۂ صعب کو سر کر کے نہ آئے
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے	تھی کون سی شب جس کو سحر کر کے نہ آئے
تھا کون جو ایماں نہ صمصام نہ لایا	اُس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا
اصنام بھی کچھ کم تھے نہ کفار تھے تھوڑے	طاقت تھی کہ عزے کو کوئی لات سے توڑے
بد کیشوں نے سجدے بھی کئے ہاتھ بھی جوڑے	بے توڑے وہ بت حیدر صفدر نے نہ چھوڑے
کعبے کو صفا کر دیا خالق کے کرم سے	نکلے اسد اللہ اذاں دے کے حرم سے
دیکھو تو! یہ ہے کون سے جرار کی تلوار	کس شیر کے قبضے میں ہے کرار کی تلوار
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار	بجلی کی تو بجلی ہے یہ تلوار کی تلوار
قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے	کہتے ہیں اسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے
گر فیضِ ظہور شہ لولاک نہ ہوتا	بالائے زمیں گنبد افلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا	ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا
یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا	ہم عرش پہ جب بیٹھے تو یہ اسلام کہاں تھا؟

میر انیس کی سیف زبانی

غور سے پڑھیے اور انصاف کیجیے کہ میر انیس نے تلوار کے کیا کیا مضامین نکالے ہیں۔ جو نہ فردوسی کو نصیب ہوئے۔ اور نہ نظامی کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ بلکہ میں خیال کرتا ہوں کہ کسی زبان میں دل نشیں یہ مطالب ڈھونڈھے سے نہ ملیں گے۔

ذوالفقار حیدر کرار

وہ غیظ وہ نعرہ وہ چمکتی ہوئی تلوار	گویا تھا مجسم غضب حضرت قہار
اتنا تو پکارے کہ خبردار خبردار	ڈھالیں نہ اٹھی تھیں کہ گری برق شرربار

گرمی سے ہوا میں شرر اُڑتے نظر آئے
جھوکا تھا غضب کا کہ سر اُڑتے نظر آئے
اک آگ سی تھی چار طرف شعلہ فشاں برق
وہ برق کہ خود مانگتی تھی جس سے اماں برق
یاں موج تو واں سیل جو یاں برق تو واں برق
منہ زہر بہ رش قہر بدن آگ زباں برق
سرکش جو تھا ناری یہ جلاتی تھی اُسی کو
لوہے یہ جو گرمی تھی تو کھاتی تھی اُسی کو

اُٹھ کر کبھی ٹھہری کبھی لچکی کبھی چمکی
گر گر گئے گردن جدھر اُس تیغ نے خم کی
سیدھی صف دشمن کو ملی راہ عدم کی
سیفی تھی کہ گویا دم شمشیر یہ دم کی
دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیداد گروں کی
تھی منہ کی طرح خاک یہ بوچھار سروں کی

اک ضرب میں ہاتھ اس کے اُڑ گئے تو سر اُس کا
شاخیں کٹیں اس نخل ستم کی ثمر اُس کا
دل اس کا دوپارہ کیا کاٹا جگر اُس کا
دم ہو گیا آخر ادھر اس کا ادھر اُس کا
تھی سم کی حرارت جو بدن اُس کا ہرا تھا
افعی کی طرح پیٹ میں کیا زہر بھرا تھا

تھا دور تلک خون سے اُس تیغ کے رن سرخ
پھولا ہوا تھا تیغ کے اک پھل سے چمن سرخ
چہرے تو سیہ کاروں کے تھے زرد بدن سرخ
تھی تیغ دو پیکر کی زباں سرخ دہن سرخ
بے وجہ نہ منہ لال تھا اس عربدہ جو کا
بیڑہ وہ اٹھائے ہوئی تھی خون عدو کا

مغفر سے جھلم کٹ گئے گردن میں در آئی
گردن سے سرکنا تھا کہ جوشن میں در آئی
جوشن سے گذرنا تھا کہ بس تن میں در آئی
تن سے ابھی اتری تھی کہ توسن میں در آئی
بچتا کوئی کیا تیغ قضا رنگ کے نیچے
اک برق غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

قبضہ تھا کہ تھا چہرۂ پر قہر قضا کا
تابیں تھیں کہ دھارا تھا وہ دریائے فنا کا
باڑھ ایسی کہ رخ پھر گیا دریا کی گھٹا کا
تشنہ وہ کہ پی جائے لہو اہل جفا کا
تمغے کی جگہ یا اسد اللہ لکھا تھا
جوہر میں انا سیف ید اللہ لکھا تھا

بیری کبھی گہ خون میں نہا کر نکل آئی
ٹھہری کبھی غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو زرہ موج میں جا کر نکل آئی
منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی

کیا ڈر اُسے طوفاں کا جو چالاک ہو ایسا
جب باڑھ پہ دریا ہو تو پیراک ہو ایسا

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجب طرح کا دم تھا
نیزے پہ جسے ناز تھا سر اُس کا قلم تھا

ناگن میں نہ یہ زہر نہ افعی میں یہ سم تھا
یہ فتح کی جویا تھی قد اس واسطے خم تھا

بد اصل تکبر کے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحب جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

جب شعلۂ سرکش کی طرح فوج پہ لپکی
تصویر نظر آگئی بجلی کے تڑپ کی

تھرّائے جگر آنکھ ستمگاروں کی جھپکی
سر اُڑ گئے اور خون کی اک بوند نہ ٹپکی

جب ہاتھ اٹھا چرخ پہ سر چڑھ گیا اُسکا
پی پی کے لہو اور بھی دم بڑھ گیا اُسکا

میر انیس کے رخشِ قلم کی جولانی

تلوار کے بعد گھوڑے کو دیکھئے کہ میر صاحب نے تعریف میں کیا کیا کام کیا ہے۔ ایک مضمون کو کتنی طرح سے باندھا ہے۔ جس سے شہیدان کربلا کے گھوڑے براق و رفرف سے بھی چار قدم آگے نکل گئے ہیں۔

امام علیہ السلام کا گھوڑا

آمد فرس کی تھی دھن آتی ہے جس طرح
تھم تھم کے نکہت چمن آتی ہے جس طرح

تصویر آہوئے ختن آتی ہے جس طرح
یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح

باہم طیور کہتے تھے کبک دری ہے یہ
گھوڑے چراغ پا تھے کہ بیشک پری ہے یہ

آیا عجب شکوہ سے اسپ قمر رکاب
تھامے تھی فتح زین کا دامن ظفر رکاب

چشمک زنی ہلال پہ کرتی تھی ہر رکاب
حلقہ تھا نور مہر کا یا جلوہ گر رکاب

فتراک تھے کہ کھولے ہوئے تھا عقاب پر
زیں پر تھا ابر پوش کہ ابر آفتاب پر

اختر خجل ہیں زین جواہر نگار سے
ذروں نے چن لئے ہیں ستارے غبار سے

تھمتا تھا کب سوار فراست شعار سے
گردن میں ہاتھ باگ نے ڈالے ہیں پیار سے

نازاں ہے خود رکاب کے پائے کو دیکھ کر
بل کر رہا ہے خاک پہ سائے کو دیکھ کر

قربان اُس نگاورِ ضیغم شکار کے
پامال کر دے شیر کو ٹاپوں سے مار کے
شائستگی کو پوچھ لو دل سے سوار کے
چاہے تو ایک طفل چڑھے باگ اتار کے
رکھ دے قدم تو رنگ نہ میلا ہو پھول کا
پیارا فرس ہے راکبِ دوشِ رسول کا

چاروں سموں سے بدر خجل نعل سے ہلال
کھیلیں شکار شیر یہ آنکھیں ہیں وہ غزال
کہئیے نہ یال حور نے بکھرا دئیے ہیں بال
پھرنے یہ جھوم جھوم کے صدقے پری کی چال
رستے ہیں یاد گنبدِ نیلی رواق کے
دلدل کی تیز باں ہیں طرارے براق کے

سینہ کشادہ تنگ کمر۔ چست جوڑ بند
گردن میں خم ہلال کا اور اُس پہ سربلند
جاں دار، بردبار، عدو کش، ظفر پسند
بجلی کسی جگہ، کہیں آہو، کہیں پرند
سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے
اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے

دونوں کنوتیاں جو بہم ہیں بہ شکل لا
سوچیں تو اہلِ بزم کہ مطلب ہے اسکا کیا
ہاں بے زباں ہے گو یہ یہ کہتا ہے برملا
آقا ہے میرا صاحبِ لاسیف و لافتا
افسوس اہلِ شام کو کچھ پیش و پس نہیں
آقا حسین سا نہیں مجھ سا فرس نہیں

جنگ ۔ فردوسی نے شاہنامے میں مبارزوں کے اندازِ جنگ کی لاثانی تصویریں کھینچی ہیں ۔ تیر و کمان ۔ تیغ و سنان کے چلنے کی صورتیں دکھائی ہیں ۔ لیکن میر انیس نے جو کمال کیا اُس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف ہے ۔

امام علیہ السلام کی جنگ

جب رن میں تیغ تول کے سلطانِ دیں بڑھے
گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
مانندِ شیرِ نر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے
گویا علی کہ اُلٹے ہوئے آستیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروسِ مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا رگِ جاں سے لہو جدا

گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی
آئے حسین یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح
تابندہ برق سوئے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح
یوں تیغ تیز کوند گئی اُس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر
اللہ ری تیزی و برش اُس شعلہ رنگ کی
چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی
پیاسی فقط لہو کی طلبگار جنگ کی
حاجت نہ سان کی تھی اُسے کچھ نہ سنگ کی
خوں سے فلک کو لاشوں سے مقتل کو بھرتی تھی
سو بار دم میں چرخ پہ چڑھتی اُترتی تھی
نیزا انگلی کا جن کے ہر اک شہر میں تھا شور
گوشہ کہیں نہ ملتا تھا اُن کو سوائے گور
تاریک شب میں جن کا نشانہ تھا پائے مور
لشکر میں خوف جاں نے انھیں کر دیا تھا کور
ہوش اُڑ گئے تھے فوج ضلالت نشان کے
پیکان زہ کو رکھتے تھے سوفار جان کے
صف پر صفیں پرے پہ پرے پیش و پس گرے
اسوار پر سوار فرس پر فرس گرے
اُٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
مخبر پہ پیک پیک پہ مر کر عسس گرے
ٹوٹے پرے شکست وہ فوج ستم ہوئی
دنیا میں اس طرح کی بھی افتاد کم ہوئی
گھوڑوں کی وہ تڑپ وہ چمک تیغ تیز کی
تھا تھا صفیں کھل گئیں جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی
آری جو ہو گئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے منہ بھر لئے تھے کارزار سے

صبح کا سماں

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے جو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے
ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے — پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانا سادہ فضا — درّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا — سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا

پھولوں کے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے — تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار — پھولوں پہ جابجا وہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار — بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا جو آب کے — شبنم نے بھر دئیے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم — کوکو کا شور نالۂ حق سِرّہ کی دھوم
سُبحان ربّنا کی صدا تھی علے العموم — جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت میں تھے رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربّ عُلا کی مدح — ہر خار کو بھی نوکِ زبان تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار — اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار — تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیل کردگار

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں — جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

آفتاب کا نکلنا

پھاڑا جو گریباں شبِ آفت کی سحر نے — پردے میں چھپایا رُخِ روشن کو قمر نے
پیمانۂ خورشید لگا نور سے بھرنے — گردوں سے سفر فوجِ کواکب لگی کرنے

تاباں جو رُخِ نیرِ افلاک ہوا تھا — ذرّوں سے زر افشاں ورقِ خاک ہوا تھا

اظہار ہوئی خطِ شعاعی کی جو تحریر — روئے شبِ یلدا سے سیاہی ہوئی تغییر
خورشید نے کی سُورۂ والشمس کی تفسیر — والفجر کی کرتا تھا تلاوت فلکِ پیر

پھیلا ہوا تھا نورِ سحر ارض و سما میں — مصروف تھی سب خلقِ خدا یادِ خدا میں

سراپائے علی اکبر

پیدا ہے زلف و روئے منور سے شان رب ... نکلا ہے آفتاب میان سواد شب
یہ لطف عید اور شب قدر میں ہے کب ... ہے دو طرف تو چین و خطا بیچ میں حلب
رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں ... اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

پہلو میں دن کے رات رہے شان کارساز ... یوسف جو دیکھ لے تو جھکائے سر نیاز
افزوں ہے سب سے رونق دین شہ حجاز ... زیبا ہیں گورے رخ پہ غضب گیسوئے دراز
اب تو نظر پہ یہ شب معراج چڑھ گئی ... حیرت ہے دن تو کم نہ ہوا رات بڑھ گئی

کیوں زلف کی ثنا میں الجھتے ہیں مو شگاف ... سلجھا ہوا بیاں ہو تو مضمون صاف صاف
تعقید سربسر ہے فصاحت کے برخلاف ... باریک اس سخن کی ہیں راہیں خطا معاف
فکر رسا ہے جن کی یہاں وہ بھی ہیچ ہے ... رستہ تو بال بھر کا ہے اور لاکھ پیچ ہے

وہ خود فرق پاک پہ وہ چاند سی جبیں ... پرتو ہے جس کے غیرت مہتاب سب زمیں
قرآں کی لوح مطلع نور آفتاب دیں ... آئینۂ حلب ید بیضا مہر جبیں
اس کو جو اس جبیں کے برابر نہ دیکھتا ... پھر اپنے آئینے کو سکندر نہ دیکھتا

ابرو ہے یا کھنچی ہوئی شمشیر تیز دم ... صانع نے ایک لوح پہ رکھے ہیں دو قلم
پایا بھلا کمان کیانی نے کب یہ خم ... کیا متصل ہے گوشے سے گوشہ تہِ چشم
مدت کھنچے تو پھر کشش ان کی بیاں ہو ... قرباں ہو لاکھ بار تو خاطر نشاں ہو

خمدار وہ بھویں وہ جبین قمر مثال ... تابندہ ایک چاند کے نیچے ہیں دو ہلال
مطلع ہے صاف غور سے بینا کریں خیال ... نقطہ ہے نور حسن کا ابرو پہ جو ہے خال
خوبی میں یہ تو بس ہمہ تن لاجواب ہے ... دیواں حسن میں بھی یہ بیت انتخاب ہے

ہے آسمان حسن و شرف پہ فلک جواب ... ابرو ہیں دو ہلال تو پیشانی آفتاب
منظور شمسی و قمری کا ہو گر حساب ... ہاں دیکھ لیں رخ خلف ابن بو تراب

باریک بیں سمجھ گئے مطلب انیسؔ کا
مانند شانہ گر ہمہ تن ہو کوئی زباں
قربانِ حسن وصنعتِ خلاقِ انس و جاں
موئے نگین در ثمین نجف یہ ہے
اس چشم کو وہی کہے نرگس جو ہے بصیر
کیوں ہر زہ گرد ہو کے نگاہوں میں ہوں حقیر
اس نور کے مکاں سے نکلنا فضول ہے
بیمار کہتے ہیں شعرا چشم کو جو سب
دارالشفا یہ خود ہے پئے بندگانِ رب
تخمک ہے ان کو عیسیٔ گردوں پناہ سے
آنکھیں وہ نرگسی جنھیں دیکھے سے ہو سرور
یا ہالۂ دو ستاروں کا ہے ایک جا ظہور
حق بیں ہیں حق شناس ہیں یزداں پرست ہیں
جاگے ہیں رات کو تو نقاہت ہے آشکار
مستانہ ہیں یہ طور کہ جھکتے ہیں بار بار
روئے ہیں فرقتِ شہ عالی جناب میں
رخسار کو قمر جو کہوں اس میں داغ ہے
ذروں کو سر چڑھائے یہ کس کا دماغ ہے
دنیا میں کوئی شے نہیں اس آب و تاب کی
آیا لبوں کا ذکر بس اب ناطقہ ہے بند
کیا لطف گر مزا نہ اٹھائیں سخن پسند

انتیس ۲۹ کا وہ چاند ہے یہ چاند تیس کا
تو بھی مژہ کا وصف سر مو نہ ہو بیاں
پردہ ہے بہر چشم کبھی ۔ گاہ سائباں
آنکھوں پہ جس کو رکھتے مردم شرف یہ ہے
پیش نظر یہ دیدۂ حق بیں ہے بے نظیر
یہ عین مردمی ہے کہ مردم ہیں گوشہ گیر
گھر بیٹھے ان کو سیر دو عالم حصول ہے
صحت میں اس کے شک ہے غلط ہو تو کیا عجب
دیدار ان کی ہر مریض کی صحت کا ہے سبب
مردے جلا دئے ہیں کرم کی نگاہ سے
روشن میان کعبہ ہیں یہ دو چراغ طور
کوثر سے یا بھرے ہوئے ہیں ساغر بلور
ہشیار کیوں نہ ہوں مے عرفاں سے مست ہیں
ڈورے جو سرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
آنسو ہیں یا صدف میں ہیں یہ درِ شاہوار
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں
خورشید ہے تو کیا ہے وہ دن کا چراغ ہے
وہ گل ہیں جن کے ذکر سے دل باغ باغ ہے
رنگت ہے سیوتی کی تو خوشبو گلاب کی
ہے بے نمک یہ بات کہوں گر نبات و قند
خود ہر سخن سے ان کی فصاحت ہے بہرہ مند

اعجاز ہے زبانِ بلاغت نظام میں
قرآں کی ساری شان ہے اُن کے کلام میں

مشکل ہے وصف گوہرِ دندانِ بے مثال
غواصِ بحرِ حسن دکھا آج کچھ کمال

اس مدح میں صلے کے جو ملنے کا ہی خیال
بھر دے گا موتیوں سے دہن فاطمہ کا لال

قبضے میں آسماں کے خزانے زمیں کا گنج
ہنس ہنس کے یہ لٹاتے ہیں دُرِ ثمیں کا گنج

اعجاز دونوں ہاتھوں میں مشکل کشا کا ہے
زورِ ان کلائیوں میں شہ لافتا کا ہے

گھر بازوؤں میں قوتِ خیر الورٰی کا ہے
سینہ نہ جانیو یہ خزانہ خدا کا ہے

کیوں شور ہو نہ ان کے قدم کے ثبات کا
جس سے تھما ہوا ہے سفینہ نجات کا

پڑتا ہے ماہِ رخ کا جو پرتو اِدھر اُدھر
پھرتی ہے چاندنی کی طرح ضو اِدھر اُدھر

گرتے ہیں کانپ کانپ کے سنو اِستو اُدھر اُدھر
لشکر میں ہے دغا ہے رہِ دار وا اِدھر اُدھر

دیکھو تو مصفو یہ ملک ہے بشر نہیں
چہرے پہ ضو یہ ہے کہ جمال نظر نہیں

غزل

عربی اور فارسی میں شاعری کا بہت بڑا حصہ تغزل سے بھرا ہوا ہے۔ فارسی میں سیکڑوں دیوان غزلیات کا مجموعہ ہیں۔ اردو نے بھی غزلیات کو شاعری کا مجموعہ بنایا ہے۔ غزل میں ایک مطلع ہوتا ہے اور باقی تمام اشعار اسی ردیف وقافیہ یا صرف قافیہ کی پابندی سے کہے جاتے ہیں اور کم سے کم ۵ اور بدرجہ اوسط پندرہ بیس شعر کی غزل ہوتی ہے اور ہر شعر کا مطلب جدا ہوتا ہے۔ جو اُسی شعر پر تمام ہو جاتا ہے بعض اشعار قطعہ بند بھی آپڑتے ہیں۔ میر انیس نے اگرچہ غزلیات کی طرف توجہ نہیں کی۔ مگر سلاموں کی تعداد بے حد ہے۔ جن سے سیکڑوں غزلیات کا مجموعہ فراہم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ چند سلاموں سے اُن کے اشعار منتخب کر کے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں

غزل

گوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے
کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

قناعت و گہر و آبرو و دولت و دیں | ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے
ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منّت کے | وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے
فقیر دوست جو ہو ہم کو سرفراز کرے | کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے
مسافرو، شبِ اول بہت ہے تیرہ و تار | چراغ قبر ابھی سے جلا نہیں رکھتے
وہ لوگ کون سے ہیں اے خدائے کون و مکاں | سخن کو کان سے جو آشنا نہیں رکھتے
انیس بیچ کے جان اپنی ہند سے نکلو | جو توشۂ سفرِ کربلا نہیں رکھتے

۲

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے | اڑ گیا جب رنگ رُخ سے استخواں پیدا ہوئے
خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں | اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے
نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں | خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے
جو عدم سے آ گیا دنیا میں بولی ہنس کے موت | اور لو دو چار دن کے میہماں پیدا ہوئے
ضبط دیکھو سب کی سن لی پر نہ کچھ اپنی کہی | اس زباں دانی پہ گویا بے زباں پیدا ہوئے
یک بیک ایسا زمانے میں ہوا ہے انقلاب | قدرداں سب اٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے
احتیاطِ جسم کیا انجام کو سوچو انیس | خاک ہونے کو یہ مشتِ استخواں پیدا ہوئے

۳

مرا راز دل آشکارا نہیں | وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں
وہ گل ہوں جدا جس کا ہے سب سے رنگ | وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں
وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور | وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں
بہت نال دنیا نے دیں بازیاں | میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں
فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا | امیروں کا یاں تک گذارا نہیں
جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا | جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

پھرے دوست جب ہو گئی قبر بند　　کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں
کسی نے تری طرح سے اے انیس　　عروس سخن کو سنوارا نہیں

۴

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی　　ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا
سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر　　مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمین سخن　　تجھے بات میں آسماں کر دیا
نواسنجیوں نے تری اے انیس　　ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

۵

خدا کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا　　اسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا
قریب قبر ہم آئے کہاں کہاں پھر کر　　تمام عمر ہوئی جب تو اپنا گھر دیکھا
کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس　　عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

۶

نمود بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں　　وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
ارے نہ آئیو دنیائے دوں کے دھوکے میں　　سراب ہے یہ جسے موج آب سمجھے ہیں
شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہے پیروں کو　　سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں
انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو　　اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

۷

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے　　شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے
کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر　　رزق پہنچا تا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے
قطع امید ایک در سے گر ہوئی کچھ غم نہیں　　اور کچھ ساماں کر دے گا خدا میرے لئے
ہر نفس آئینۂ دل سے یہ آتی ہے صدا　　خاک تو ہو جا تو حاصل ہو جلا میرے لئے

اے مہوّس اپنی اپنی قسمت اس کا رشک کیا　　کیمیا تیرے لئے خاک شفا میرے لئے
خاک سے ہے خاک کو الفت تڑپتا ہوں انیسؔ　　کربلا کے واسطے میں کربلا میرے لئے

رباعیات

اصنافِ سخن میں رباعی نہایت پر لطف اور بکار آمد چیز ہے۔ اس کے ایجاد کا فخر عرب کو حاصل ہے۔ اس کے بعد فارسی میں اس کی تقلید کی گئی اور فارسی رباعیوں میں بڑے بڑے معنی خیز مطلب اور فلسفہ و حکمت کے مسائل بیان کئے گئے۔ ازاں جملہ عمر خیام کی رباعیاں مشہور آفاق ہیں۔ اس کے بعد اردو زبان میں فارسی کی تقلید سے رباعی کہی گئی۔ مگر شعرائے اردو نے رباعی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔ اس کو میر انیس اور مرزا دبیر نے عروج دیا۔ اور اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔

معرفت الٰہی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو　　آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگ جاں سے ہیں اس پر یہ بعد　　اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

خیال آخرت

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے　　لے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
مرمر کے پہنچے ہیں مسافر واں تک　　یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

روح و تن کا فراق

جس دن کہ فراق روح و تن میں ہوگا　　مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رخت تو پہن کر غافل　　اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

قدرت باری

ہر برگ سے قدرت احد پیدا ہے　　ہر پھول سے صنعت صمد پیدا ہے
سینہ ہے بشر کا وہ محیطِ ذخار　　ہر ایک نفس سے جزر و مد پیدا ہے

قبر کی تنہائی

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے — آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نے دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد — مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

انجام دنیا

غافل تجھے کیوں خواہش دنیائے دنی ہے — پیوند زمیں ہر کوئی دردیش غنی ہے
جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ — سوتے ہیں تہِ خاک گلے میں کفنی ہے

خوف الٰہی

ہردم ہے خیال عذرخواہی دل میں — مطلق نہیں کچھ خوف الٰہی دل میں
نانے کی طرح خطا میں گذری سب عمر — بالوں پہ سفیدی ہے سیاہی دل میں

گوشہ نشینی

دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا — برسوں نہ کبھی روز فراغت دیکھا
راحت کا مکاں امن کا گھر خانہ عیش — دیکھا تو جہاں میں کنج عزلت دیکھا

توشۂ آخرت

گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے — پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے — غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

قافلۂ ہستی

آلودہ عیش اس غم جانکاہ میں ہے — زندہ ہے وہ دل جو یاد اللہ میں ہے
اپنی واماندگی سے گھبرانہ انیس — پہنچا کوئی منزل پہ کوئی راہ میں ہے

وقت مرگ

اب زیر قدم لحد کا باب آپہنچا — ہشیار ہو جلد وقت خواب آپہنچا
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی آہ انیس — ہنگام غروب آفتاب آپہنچا

معرفت

سائے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں — جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیس — جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

مرزا سلامت علی دبیر

۱۱۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ کو مرزا صاحب دہلی محلہ بلی ماراں میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ۷ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں اُن کی تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۲ برس کے سن میں تحصیل فارسی اور کسی قدر عربی سے فراغت حاصل کی۔ ان کے والد ان کا رجحان طبعی شاعری کی طرف دیکھ کر میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں لائے۔ میر ضمیر نے اپنی شاگردی میں لے کر ان کا تخلص دبیر رکھا۔ اور فرمایا کہ ضرور کہا کرو۔ میں تم کو بتاؤں گا۔ اُس دن سے جو کہتے میر مظفر حسین صاحب ضمیر کو دکھلاتے۔ محنت اور مشق کی کثرت سے جو کچھ استاد سے پایا اُسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھلایا۔ طبیعت ایسی گداز پائی تھی جو اس فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ ان کی سلامت روی اور پرہیز گاری۔ مسافر نوازی۔ سخاوت نے صفت کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔ شوکت الفاظ۔ مضامین کی آمد۔ جا بجا غم انگیز استارے۔ دردخیز کنائے۔ الم ناک اور دلگداز انداز جو مرثیے کی غرض اصلی ہے۔ ان وصفوں کے بادشاہ ہیں۔

مرزا صاحب کے مرثیوں کا چہرہ بہت شاندار اور مطلع نہایت بھڑکتا ہوا ہوتا ہے۔ رخصت کے موقع پر وہ اکثر سادہ مگر دلگداز الفاظ لاتے ہیں۔ سراپا میں اکثر صنائع بدائع لاتے ہیں۔ اور خیالات کی نزاکت معراج کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔ آمد بھی اچھی دکھلاتے ہیں۔ رجز میں عموماً نہایت فصیح و بلیغ الفاظ لاتے ہیں۔ لڑائی کے موقع پر ہیبتناک الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ شہادت اور بین تو مرزا صاحب اکثر مرثیہ گویوں سے بہتر کہتے ہیں۔

۹۔ محرم ۱۲۹۲ھ کو ۷۲ برس کی عمر میں مرزا صاحب نے انتقال فرمایا۔ اس مدت میں کم سے کم ۳ ہزار مرثیے لکھے ہوں گے۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ نہ اب ویسا زمانہ آئے گا نہ ایسے صاحب کمال پیدا ہوں گے۔

رزمیہ فخر کے اشعار

یہ جان لو جس وقت کھنچے گی مری تلوار
تیغوں میں نہ دم ہونگے نہ سر ہونگے نہ سردار

اک حملے میں کر دوں گا پرے فوج کے بیکار
جز گرد نہ پیدل نظر آئیں گے نہ اسوار

سرکوبی افواج بداعمال کروں گا
چیونٹی کی طرح مورچے پامال کروں گا

انسان تو کیا جن بھی نہیں ہم سے لڑے ہیں
سر کے نہیں جس جا یہ قدم رن میں گڑے ہیں

نام اپنی دلیری کے دلیروں میں بڑے ہیں
اس ضرب کے سکے عرلبتاں میں پڑے ہیں

کس کس پہ علی تیغ ظفرناک ہماری
ہر شہر میں ہر ملک میں ہے دھاک ہماری

کمزور ہیں رستم سے پہلواں مرے آگے
مجبور ہیں سہراب و نریاں مرے آگے

نابود ہے فرعون کا ساماں مرے آگے
رکھتے نہیں کچھ جان بنی جاں مرے آگے

بیہوش ہو جس صاحب شمشیر کو ٹوکوں
روباہ نے ڈر کے۔ اگر شیر کو ٹوکوں

تلوار

اللہ رے رعب تیغ زہے عزت و جلال
چمکی جدھر صفیں کی صفیں ہوگئیں نڈھال

دشمن کے فرق پر جو گئی برق کی مثال
گھر اکے نیزہ روزدوں نے لگے بڑھائی ڈھال

غل پڑ گیا سپر کو بچا تیغ شاہ سے
بجلی کو لاگ ہوتی ہے رنگ سیاہ سے

جس مورچے میں پہلے یہ تیغ دو سر گئی
چنگے بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی

ہر صف نے خاک اڑائی ادھر سے اُدھر گئی
پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی
سر پہ جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی

تجویز جو لعینوں نے کی وہ مضر پڑی
افتاد اُن سے پوچھیے یہ جن کے سر پڑی

اٹھی گری بلند ہوئی پست ہوگئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہوگئی

پھول اُڑ گئے جو ڈھالوں کے خرمن سے جا ملی
پھر سر تھا سو قدم پہ جو گردن سے جا ملی

رگ رگ الگ ہوئی جس تن سے جا ملی
کڑیاں جدا ملیں یہ جو جوشن سے جا ملی

تاثیر چشم زخم بد دل کو دکھا گئی　　مثل نظر بد دل کو لگی اور دکھا گئی
تیغ دو سر کو سر پہ بٹھاتے تھے خاص و عام　　یعنی بلند صاحب جوہر کا ہے مقام
چپ تھے حضور تیغ زباں آوران شام　　کیا منہ جو کوئی اہل زباں سے کرے کلام
برچھی نے بحث کی نہ خدنگ و حسام نے　　سب کی زبان بول گئی اس کے سامنے

پہلو کے پاس آکے جوشن سے نکل گئی　　بے زخم کھائے جان بدن سے نکل گئی
چھوڑی نہ کوئی بات دہن سے نکل گئی　　ڈوبی زمیں میں چرخ کہن سے نکل گئی
تارے کہیں۔ قمر کہیں چرخ بریں کہیں　　مچھلی کہیں تڑپتی تھی گاؤ زمیں کہیں

جس صف کے سر پہ تیغ دو پیکر نظر پڑی　　وہ صف کی صف زمیں پہ بے سر نظر پڑی
جب سرکشوں کی تیغ دو سر پر نظر پڑی　　اٹھے جہاں سے موت برابر نظر پڑی
پتھرا کے آنکھ رہ گئی مردم کو غم ہوا　　جو عین اس کے دم پہ چڑھا وہ عدم ہوا

ہر اک سپر نڈھال تھی دہشت سے وار کی　　ششدر تھا چار آئینہ جب آنکھ چار کی
زرہ عیاں تھی کڑیوں سے سنبل کے تار کی　　کڑیاں زرہ سے اٹھ نہ سکیں ذوالفقار کی
مہتاب تھا کہ پرتو صمصام پاک تھا　　رخت حیات مثل کتاں چاک چاک تھا

لشکر کو مثل وعدۂ لیلیٰ نہ تھا قرار　　دل سے شکست تو پہ مجنوں تھی آشکار
جان اس طرف رواں تھی قرار اس طرف فرار　　قالب سے روح بھاگ گئی دل تو درکنار
روئیں تنوں کا طنطنہ و زور تن گیا　　ہر عضو بھاگنے کے لئے پاؤں بن گیا

چال اس پری کی عالموں کو مات کر گئی　　بھاگا وہاں سے سایہ جہاں یہ ٹھہر گئی
کھیلی قضا کے ساتھ کہ ہستی گذر گئی　　سر پہ چڑھی تو شیشۂ دل میں اتر گئی
آگے بڑھی تو دل پہ یہ قبضہ کئے ہوئے　　غل تھا پری وہ اڑ گئی شیشہ لئے ہوئے

کیسی زمیں فلک سے یہ ہر دم گذرتی تھی　　پر حد شرع سے قدم آگے نہ دھرتی تھی
خون عدو نجس تھا۔ سو پرہیز کرتی تھی　　ناخن بھی اپنا تیغ دو پیکر نہ بھرتی تھی

بے جُرم معرکوں میں یہ خارا شگاف تھی
لشکر کا خوں کیا تھا مگر پاک صاف تھی
بو کی طرح دماغوں میں آئی چلی گئی
مثل ہوا سروں میں سمائی چلی گئی
مانند شعلہ باگ اٹھائی چلی گئی
آندھی کی طرح آگ لگائی چلی گئی
سینے میں صاف آتی تھی ورصاف جاتی تھی
انداز دم کی آمد و شد کا دکھاتی تھی
آنکھوں میں کوند جاتی تھی پیش نظر نہ تھی
صف کون سی تھی رن میں کہ زیر و زبر نہ تھی
کچھ انتہائے برشِ تیغ دو سر نہ تھی
یہ کون بیندا تھی کہ جیں کی خبر نہ تھی
یاں تھی تو واں تھی جو ادھر تھی ادھر تھی
پر یہ نہ کچھ کھلا کہ کدھر تھی کدھر نہ تھی

صبح کا سماں

گلگونہ شفق جو ملا حور صبح نے
اسپند مشک شب کو کیا نور صبح نے
گرمی دکھائی روشنی نور صبح نے
ٹھنڈے چراغ کر دئے کافور صبح نے
لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے سر درخشاں جھٹ چھٹ گئی
پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشان صبح
سلطان صبح نے کیا قصد اذان صبح
باندھا عمامہ نور کا ۔ پہنا کتان صبح
چرخ چہارمی پہ گیا خطبہ خوان صبح
رُخ سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرم سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے
آیا عروج پر شہ گیتی ستان مہر
پرچم کشا ہوا علم زر فشانِ مہر
لی روز نے پناہ بزیر نشان مہر
اور لشکر شعاع لے تانی سنان مہر
نیزہ کرن کا دیدۂ گردوں میں ڈال کر
مغرب میں پھینکی رات کی پتلی نکال کر
ذروں میں نور مہر در آیا قمر قمر
لوٹا سحر نے معدن شبنم گہر گہر
بڑھ کر نقیب نور پکارا سحر سحر
فرماں نجوم و مہر کو پہونچا بدر بدر
برقع جو اٹھ گیا تھا رُخ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبح ملمع نقاب کا

رات کا سماں

مغرب سے نمایاں ہوئی جس دم شب عاشور — کچھ صبح قیامت سے نہ تھی کم شب عاشور
دل خلق کا کرنے لگی برہم شب عاشور — زینب کو ہوئی جامۂ ماتم شب عاشور
ظلمت کی ردا اس لیے ہر سمت پڑی تھی — سر کھولے ہوئے فاطمہ مقتل میں کھڑی تھی

جس وقت پڑا سکۂ شب سیم قمر پر — پھر کوئی نہ راغب ہوا خورشید کے زر پر
مریخ کا خنجر جو چلا ترک سحر پر — بن بن کے شفق خون چڑھا چرخ کے سر پر
کیواں علم - ایوان فلک اور چاند نگیں تھا — آفاق سلیماں کی طرح زیر نگیں تھا

شب تھی کہ سیہ بختی کفار ہر اک سو — چشم سیہ قہر تھی - یا ظلم کا گیسو
کج رو صفت نقش نگیں تھے جو وہ بد خو — آخر کو ہوئے شب کی سیاہی کے سیہ رو
روشن ہے سیہ کار وہ سب فوج جفا تھی — معدوم ہوئے نام سیاہی جو سوا تھی

وہ شب کا اندھیرا وہ بیاباں کی سیاہی — گرمی کی وہ پیاس اور وہ پانی کی مناہی
آباد وہ گھر اور وہ اک بار تباہی — یہ حادثہ اور آل نبی شان الٰہی
گر فرش پہ سو جاتے تھے روتے ہوئے بچے — پھر پیاس سے چونک اٹھتے تھے سوتے ہوئے بچے

گرمی کا سماں

تنہا کھڑے ہیں رن میں امام فلک جناب — گرمی دکھا رہی ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب — خط غبار سے ہے یہی ابری سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں — خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برج آب کی — رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی — حدت ہے موج موج میں تیر شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی — پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش — آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوز جگر سے ہر دم آبی ہیں نالہ کش — نوحہ ہے بنت رود کے پیاسوں کا العطش

نزدیک ہے کہ زاہد کو بے آبرو کریں
تر دامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

اکثر منجموں نے لکھا ہے یہ ہمدگر
جس سال نام شہ پہ پڑا قرعۂ سفر

تھی اُس برس یہ شدت گرما کہ الحذر
مثل چنار آگ سے جلتا تھا ہر شجر

جائے غبار ریگ سے شعلے بلند تھے
مجمر زمین گرم تھی ذرے سپند تھے

مثل تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

گلشن صدف تھے دانۂ بریاں دُرِ خوش آب
آتش سے اپنی لعل بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

رباعیات

امید رحمت

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں
منھ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں

چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل
تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

رب الارباب سے خطاب

پروانے کو دھن شمع کو لو تیری ہے
عالم میں ہر اک کو تگ و دو تیری ہے

مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب
جس نور کو دیکھتا ہوں ضو تیری ہے

خدا ہی عزت دیتا ہے

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے

بے کار تشخص ہے تصنع بے سود
عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے

مدح جناب امیر

خورشید سر شام کہاں جاتا ہے
روشن ہے دبیر پہ چلا جاتا ہے

مغرب ہی کی جانب تو ہے قبر حیدر
یہ شمع جلانے کو وہاں جاتا ہے

ناموافقت زمانہ

کوشش سے موافق ہو زمانہ معلوم　　قسمت سے زیادہ چین پانا معلوم
مانند مژہ کھڑے رہیں پیشِ نگہ　　اس قرب پہ آنکھوں میں سمانا معلوم

ناموافقتِ زمانہ

دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا　　کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا
برسوں رہا جن کے سر پہ چترِ زرّیں　　تربت پہ نہ اُن کی شامیانہ دیکھا

ایضاً

ہر سر کا عجب یاں سر و سامان دیکھا　　اقبال اور ادبار کو یکساں دیکھا
دنیا کے خیال میں جو کیں آنکھیں بند　　ہم نے تو فقط خواب پریشان دیکھا

ایضاً

کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا　　باقی سامان عیش فانی نکلا
چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دیر　　اتنا بھی نہ اس کنوئیں میں پانی نکلا

ایضاً

طوفاں ہے ہوس غرق بنی آدم ہیں　　ہر دل ہے سرِ مقیم عیش و غم ہیں
کاسہ ہے اجل خلق خدا بننے کو　　دروازہ ہے قبر جانے والے ہم ہیں

خوشامد کرنے والوں کی ہجو

پیش امرا طالبِ زر جھکتے ہیں　　سجدے کی طرح مجرے کو سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح　　ہے مال سوا جدھر اُدھر جھکتے ہیں

شکایت فلک و زمانہ

یارانِ گذشتہ کی خبر خاک نہیں　　ایسے ہی گئے کہ اب اثر خاک نہیں
چن چن کے کیا خاک ہنرمندوں کو　　اے چرخ تجھے قدرِ ہنر خاک نہیں

ایضاً

دنیا زنداں ہے جائے آرام نہیں　گہوارہ بجز گردشِ ایام نہیں
آنکھوں میں سپیدی و سیاہی کی طرح　جھپکی جو پلک صبح نہیں شام نہیں

فوائد سفر

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا　قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل　پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

مذمت ریا

اندھیر ہے خیر میں ریا کرتے ہیں　برباد نکوئی کی جزا کرتے ہیں
غیروں کو مثال روشنی فائدہ ہے　مانند چراغ خود جلا کرتے ہیں

سفر آخرت

کس خواب تغافل میں یہاں سوتا ہے　کیوں مفت متاع زندگی کھوتا ہے
لو حق سے لگا کہ صبح پیری آئی　ہشیار چراغ عمر گل ہوتا ہے

قبر

مر کر بھی نہ چین زیر افلاک ملا　اک تار کفن نہ گرد سے پاک ملا
اے خانہ خراب قبر! تیری خاطر　کھویا بھی جو نقد جاں تو کیا خاک ملا

ایضاً

اک دن پیوند خاک ہونا ہوگا　تنہا تنہا لحد میں سونا ہوگا
اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیرؔ　جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا

ایضاً

گھر اپنا اجاڑ کر بسایا تجھ کو　ڈھانپا جو کفن سے منہ دکھایا تجھ کو
اے قبر کہاں نہ کی تیری تلاش　جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

منشی امیر احمد امیر مینائی

امیر احمد نام - امیر تخلص - مولوی کرم محمد مغفور کے بیٹے تھے - ١٦ شعبان ۱۲۴۴ھ روز دوشنبہ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے - آپ کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ملتا ہے - جن کا مزار مقدس لکھنؤ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے -

آپ زاہد متقی - صوفی مشرب - خدا پرست - درویش صفت تھے - حضرت امیر شاہ صاحب سجادہ نشین خاندان چشتیہ صابریہ سے آپ کو بیعت تھی اور اُن کے خلیفہ بھی تھے -

آپ نے علوم قدیمہ کی تعلیم فرنگی محل لکھنؤ میں پائی - نہایت سمجھدار تھے - علوم عربیہ و فارسیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے - طب - جفر - نجوم وغیرہ بھی بہتر جانتے تھے - شاعری میں آپ کو دبیر الدولہ وزیر الملک - سید مظفر علی خاں صاحب بہادر - اسیر سے تلمذ حاصل تھا - مگر شاعری کے لئے طبیعت ایسی مناسب پائی تھی کہ اپنے استاد سے آگے نکل گئے -

آپ خاندان مصحفی کے آفتاب رخشاں تھے - بچپنے میں حضرت ناسخ کی بلند پروازی - اور حضرت آتش کی آتش بیانی نے اپنا جلوہ دکھا کر ان کی نوخیز طبیعت میں عاشقانہ رنگ پیدا کر دیا - اور عالم شباب میں صبا - وزیر - رند خلیل کی جادو بھری نغمہ سرائیوں نے فریفتہ بنا کر محفل میں لا بٹھایا میر انیس اور مرزا دبیر کی معرکہ آرائیوں اور اُس وقت کے نامی مشاعروں میں شرکت بھی آپ کے حق میں رہبر کامل ہوئی - ان نامی بزرگوں کے فیض صحبت سے یہاں تک شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۲۹۹ھ میں آپ کو سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کے دربار میں باریابی ہوئی اور حسب الحکم سلطان دو کتابیں ارشاد السلطان - ہدایۃ السلطان تصنیف کیں - جن کے صلے میں خلعت فاخرہ اور انعام عطا ہوا - اُسی وقت سے آپ کی عالمگیر شہرت کا زمانہ شروع ہوا - جو برابر ترقی کرتا گیا - اسی اثنا میں اودھ کی سلطنت جاتی رہی - چند روز خانہ نشین رہے - ۱۲۸۵ھ میں آپ کی معجز بیانی کا شہرہ سن کر فردوس مکاں نواب محمد یوسف علی خاں صاحب ناظم رامپور نے طلب فرمایا اُس وقت سے آپ کی مستقل سکونت رامپور ہو گئی - اور آپ ریاست کی طرف سے عدالت دیوانی کے ایک رکن ہو گئے - رفتہ رفتہ نواب صاحب کی قدر دانی سے تمام اہل کمال یہیں آ کر جمع ہو گئے نواب فردوس مکاں کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر کا عہد حکومت آیا - اردو شاعری کو اور بھی فروغ ہوا - سخن فہم اور رتبہ شناس رئیس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمام ہند کے نامی گرامی شعرا کو بلا کر اپنے دامن دولت کے سایۂ عاطفت میں لے لیا - داغ - امیر

جیا۔ منیر۔ بحر زکی۔ تلق۔ عروج۔ جلال۔ شاغل۔ تسلیم۔ رسا وغیرہ سب رام پور میں جمع ہو گئے۔ کبھی کبھی حضرت غالب بھی دہلی سے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں حضرت امیر کو نواب کی اُستادی کا فخر حاصل ہوا۔

آپ کی اکثر تصانیف شائع ہو گئیں۔ بعض مستور ہیں۔ مرأۃ الغیب۔ صنم خانۂ عشق۔ دیوان نعتیہ۔ مولود شریف۔ امیر اللغات کی دو جلدیں شائع ہوئیں۔ باقی مستور ہیں۔

آپ کو قصائد و غزلیات وغیرہ تمام اصناف سخن پر کامل قدرت تھی۔ معانی کی جدت۔ الفاظ کی مناسبت۔ خیالات کی بلندی۔ نکات کی برجستگی۔ اشارات کی شوخی۔ بیان کی صفائی غرض شاعری کی تمام خوبیاں اپنے اپنے موقع پر امیر کے قلمرو سخن میں پائی جاتی ہیں۔ پھر اُس پر تصوف و اخلاق کی چاشنی کھانے میں نمک کا کام دیتی ہے۔ حسرت و یاس و عبرت کے مضامین آپ نہایت خوش اسلوبی اور موثر پیرائے میں لکھتے ہیں۔

سنہ ۱۲۱۲ھ میں رامپور کو خیر باد کر کے آپ حیدر آباد تشریف لے گئے۔ مگر یہ سفر راس نہ آیا۔ وہاں پہنچ کر علیل ہو گئے۔ ایک ماہ کی علالت کے بعد ۱۹ جمادی الآخر سنہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء کو رہگرائے عالم باقی ہوئے۔ اور وہیں پیوند زمین ہوئے۔

قصیدہ مدحیہ

عالم باغ میں پہنچا میں عجب باغ میں کل ... شجر طور کو جس باغ کی کہئے کونپل
خواب میں سبزۂ خوابیدہ جو واں کا دیکھے ... خواب ہو طالع خوابیدہ کا خواب مخمل
سامنے اُس کے کسی اور چمن کا کیا ذکر ... گلشن خلد بھی مجھ کو نظر آیا جنگل
اک شگوفہ تھا اُسی باغ کا باغ عشرت ... ایک غنچہ اُسی گلزار کا گلزار امل
ساغر عشرت کونین وہیں کے دو پھول ... میوۂ مقصد دارین وہیں کے دو پھل
واہ رے نشو گل و لالہ اگر عکس پڑے ... خون لعل آئے رگ کوہ بدخشاں سے نکل
سخت حیراں ہوں کہ دیوار کو دل کس سے مثال ... کہوں آئینہ تو آئینے میں اتنا نہیں دل
دست قدرت گاں نے سنبھالے تھیں نگہ کو آنکھیں ... پھر بھی دیوار پہ جب چڑھتی تھی جاتی تھی پھسل

لالہ آتا تھا نظر یوں پس دیوار چمن
جس طرح شیشہ محل میں کوئی روشن مشعل

خط گلزار سے ہر گل پہ یہ مصرع تحریر
نقش ثانی ہے یہ فردوس ہے نقش اول

طوبیٰ و سدرہ کی شاخیں ہے تسلیم میں خم
عرش تک فرش سے ہے باد بہاری کا عمل

ہے یہ تاثیر نمو ہاتھ جو مجرم کے کٹیں
صورت دست چنار آئیں نئے سر سے نکل

قوت نامیہ کا تھا یہ تعلی سے کلام
طارم لیست ہے اس باغ میں چرخ اول

سبزۂ کاہ کشاں غنچۂ پروین کیسا
خوشۂ تاک رگ تاک سے آیا ہے نکل

اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیض نمو
نکلے گر بات میں بھی شاخ تو پھولے کوپل

خواب میں دیکھے اگر ترک فلک یاں کی بہار
شب ہی کو گلشن انجم کو کرے مستاصل

کچھ بھی دکھلائے اگر باد بہاری نیرنگ
گل ہو گل دان میں انگارے درون منقل

ٹکڑے بدلی کے نہ تھے ہند و سوسن کے لئے
بھر کے آیا تھا وہاں چھاگلوں میں گنگا جل

نوجوانان چمن دھوپ سے کیا کمھلاتے
چتر کھولے ہوئے پھرتے تھے ہوا پر بادل

ہر روش سبزے پہ واں عکس گل و لالہ نہ تھا
سیج تھی پھولوں کی یا لائے بساط مخمل

مور تھے رقص میں مصروف برنگ لٹے
جھومتے پھرتے تھے مستوں کی طرح سے بادل

سینے تانے ہوئے پھرتے تھے چمن میں طاؤس
اس تمنا میں کہ لگ جائے گلے سے بادل

لڑکھڑاتا تھا جو مستی میں کہیں پائے نسیم
غنچہ کہتا تھا چٹک کر کہ خبردار سنبھل

چمن دل میں جو عارف کے چلے واں کی نسیم
گل صد برگ بنے غنچۂ اسرار ازل

سوئے بتخانہ جو پہنچی وہ ہوائے جاں بخش
کلمہ توحید کا پڑھنے لگے عزّا و ہبل

کیا عجب دانۂ اسپند ہو جل کر پھر سبز
کہ دھواں اٹھتے ہی بنتا ہے ہوا پر بادل

قوت نامیہ کے جوش سے آئینے میں
کیا عجب سبزۂ زنگار سے گل آئے نکل

تخم تخم اس کا شجر بن کے نیا پھل دیتا
ٹوٹ جاتا جو کہیں گر کے زمیں پہ کوئی پھل

پانی دیتا صفت دامن تر وقت فشار
تھا یہ ہر سایۂ دیوار چمن کا کمتق

گرد گلزار کے ہوتا تھا تصدق خورشید — چاہتا تھا کہ کرے لالے سے دستار بدل
نقش پا تھا صفت جام لبالب مے سے — رنگ پھولوں سے ٹپکتا تھا کہ آیا تھا ابل
گل نسریں پہ تھا یوں عکس شعاع خورشید — جیسے سونے کو کریں ساغر الماس میں حل
غنچۂ لب کا تو کیا ذکر ہے گل ہے کھلتا — عقدۂ گیسوئے خوباں جو وہاں ہوتا حل
ایک دم بلبل سرمست جو ہوتی تھی خموش — جام منقار سے آتی تھی مئے نغمہ ابل
دل سے کلفت کو مٹایا یہ صفائے گل نے — زنگ آئینے کا جس طرح مٹا وے صیقل
آگیا گل کی صفائی کا جو بلبل کو خیال — سر بھی بیضے سے نہ نکلا کہ گیا پاؤں پھسل
آبدار ایسی تھیں نہریں کہ مقابل ہو اگر — آب میں چشمۂ خورشید کے آجائے خلل
نکہت گل سے ہر اک موج حباب رگ گل — پر تو گل سے حباب لب جو رنگ محل
شہد کی نہر رواں مثل جناں ہوتی تھی — پھول پر بیٹھ کے اڑتی تھی جو زنبور عسل
ہوگیا لوٹ میں سامان یہ آیا جو نظر — پاؤں کس طرح سنبھلتا کہ گیا دل ہی پھسل
لے اڑی ہوش مرے حیرت نظارۂ باغ — آگیا غش مجھے بے ہوش گرا سر کے بھل
متحیّر تھا کہ یارب یہ ہے کیسا گلزار — غنچہ ہے تنگ دہن کس سے معما ہو یہ حل
گوش گل میں ہے ہولے طرب انگیز بھری — کون سنتا ہے جو پوچھوں میں کہ کیا ہے یہ محل
قمریوں کو نہیں کوکو سے مجال گفتار — بلبلوں کو نہیں نغموں سے کسی شاخ پہ کل
تھا اسی فکر سے دریائے تحیّر میں غرق — کہہ رہا تھا کہ زہے صنعت صناع ازل
ناگہاں طرف چمن میں نظر آیا اک نور — آنکھ نے دل سے کہا دیکھ لے اسکو کہ سنبھل
طرفۃ العین میں وہ روشنی آپہنچی قریب — کھل گیا دیکھتے ہی اس کو مرے دل کا کنول
دیکھتا کیا ہوں کہ ہے بیچ میں اک حور لقا — کچھ حسیں گرد ہیں آگے ہے فروزاں مشعل
گل کھلا فیض طراوت سے ہوا کے تازہ — پھول سوسن کا بنا اٹھتے ہی دود و مشعل
حور وہ حور جسے دیکھے تو فردوس سے حور — مضطرب نعرہ زناں خاک بسر آئے نکل

فرق سے تا بہ قدم پیکرِ انداز و ادا — غمزۂ ناز سے ڈالے دل عاشق کو مسل
گرمیِ حسن سے رخسار بھبو کا ایسا — شمع کی طرح جسے دیکھ کے دل جائے پگھل
چال وہ چال کہ بھونچال ہو جس سے لرزاں — چرخ پر مثل زمیں جس سے پڑے اک ہل چل
ہو زمانہ تہ و بالا جو وہ ہو تند خرام — ہے یقیں جائے زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل
بھاگلوں گے یہی دو حکم تھے وقت رفتار — زندے مر جائیں پڑیں مردۂ صد سالہ اُچھل
جو کڑی آہوے مشکیں کو ختن میں بھولے — بال کھولے جو حلب میں وہ دکھائے چھل بل
قطرے کہتے تھے پسینے کے رُخ گلگوں پر — جوش کھا گرمیِ حسن آئی ہے چہرے پہ اُبل
پتلیوں کا جو اُن آنکھوں کا تماشا دیکھا — دل ناداں مرے پہلو میں گیا اور مچل
تیر پر تیر پڑے دل پہ نگاہیں جو لڑیں — نیم جاں پاؤں پہ اُسکے میں گرا سر کے بل
اور کی عرض کہ اے عشوہ گر غمزہ فروش — رحم کر رحم بس آ گئے دل مضطر کو نہ چھل
رُخ روشن کی طرح آئینہ تو مجھ کو کیا — اپنے گیسو کی طرح کر مرے عقدِ دل کو بھی حل
کون سا باغ ہے یہ کون ہے تو ہیں ہم ل کہاں — تجھ سے وحشت نہیں یہ اور ہے حیرت کا محل
متبسم ہوا پہلے تو وہ سرمایۂ ناز — پھر اک انداز سے بولا یہ دکھا کر کس بل
سر اُٹھا پاؤں سے یہ بے ادبی خوب نہیں — اچھی صورت پہ گیا دیکھتے ہی خوب پھسل
ہوش میں آ یہ نہیں ہے قسم نباتات سے باغ — ہے سراپا چمنِ صنعت خلاق ازل
اُنس کچھ آج تجھ کو نہیں ہے مجھ سے — کھا چکا چوٹ مرے حسن کی تو روز ازل
نہ پری ہوں میں نہ انسان میں نہ غلماں ہوں نہ حور — پر لطافت میں نزاکت میں ہوں ایسی افضل
باغ نقشہ ہے صفات حسنہ کا اُس کے — حسن یوسف سے جو فطرت میں کہیں ہیں اکمل
ہاتھ پھیلائے ہیں نرگس نے جو کاسہ لے کر — اور کاسہ ہے کہ سونا ہے کیا اُس میں حل
ہے یہ نکتہ کہ فقیرانِ جہاں کی صورت — سائل اُس کے در دولت پہ ہیں ارباب دول
ہاتھ پھیلائے جو شاخیں زر گل دیتی ہیں — ہے یہ مطلب کہ دہش میں ہے وہ بے مثل و بدل

گرد گلزار کے ہوتا تھا تصدق خورشید | چاہتا تھا کہ کرے لالے سے دستار بدل
نقش پا تھا صفت جام لبالب مے سے | رنگ پھولوں سے ٹپکتا تھا کہ آیا تھا ابل
گل نسریں پہ تھا یوں عکس شعاع خورشید | جیسے سونے کو کریں ساغر الماس میں حل
غنچۂ لب کا تو کیا ذکر ہے گل ہے کھلتا | عقدۂ گیسوئے خوباں جو وہاں ہوتا حل
ایک دم بلبل سرمست جو ہوتی تھی خموش | جام منقار سے آتی تھی مئے نغمہ ابل
دل سے کلفت کو مٹایا یہ صفائے گل نے | زنگ آئینے کا جس طرح مٹا دے صیقل
آگیا گل کی صفائی کا جو بلبل کو خیال | سر بھی بیٹھے سے نہ نکلا کہ گیا پاؤں پھسل
آبدار ایسی تھیں نہریں کہ مقابل ہو اگر | آب میں چشمۂ خورشید کے آجائے خلل
نکہت گل سے ہر اک موج حباب رگ گل | پر تو گل سے حباب لب جو رنگ محل
شہد کی نہر رواں مثل جناں ہوتی تھی | پھول پر بیٹھ کے اڑتی تھی جو زنبور عسل
ہوگیا لوٹ میں سامان یہ آیا جو نظر | پاؤں کس طرح سنبھلتا کہ گیا دل ہی پھسل
لے اڑی ہوش مرے حیرت نظارۂ باغ | آگیا غش مجھے بے ہوش گرا سر کے بھل
متحیر تھا کہ یارب یہ ہے کیسا گلزار | غنچہ ہے تنگ دہن کس سے معما ہو یہ حل
گوش گل میں ہے ہولے طرب انگیز بھری | کون سنتا ہے جو پوچھوں میں کہ کیا ہے یہ محل
قمریوں کو نہیں کوکو سے مجال گفتار | بلبلوں کو نہیں نغموں سے کسی شاخ پہ کل
تھا اسی فکر سے دریائے تحیر میں غرق | کہہ رہا تھا کہ زہے صنعت صناع ازل
ناگہاں طرف چمن میں نظر آیا اک نور | آنکھ نے دل سے کہا دیکھ لے اسکو کہ سنبھل
طرفۃ العین میں وہ روشنی آپہنچی قریب | کھل گیا دیکھتے ہی اُس کو مرے دل کا کنول
دیکھتا کیا ہوں کہ ہے بیچ میں اک حور لقا | کچھ حسیں گرد ہیں آگے ہے فروزاں مشعل
گل کھلا فیض طراوت سے ہوا کے تازہ | پھول سوسن کا بنا اُٹھتے ہی دو دو مشعل
حور وہ حور جسے دیکھے تو فردوس سے حور | مضطرب نعرہ زناں خاک بسر آئے نکل

فرق سے تابہ قدم پیکر انداز و ادا
غمزۂ ناز سے ڈالے دل عاشق کو مسل

گرمی حسن سے رخسار بھبھوکا ایسا
شمع کی طرح جسے دیکھ کے دل جائے پگھل

چال وہ چال کہ بھونچال ہو جس سے لرزاں
چرخ پر مثل زمیں جس سے پڑے اک ہلچل

ہو زمانہ تہ و بالا جو وہ ہو تند خرام
ہے یقیں جائے زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل

بھاگلوں کے یہی دو حکم تھے وقت رفتار
زندے مر جائیں پڑیں مردۂ صد سالہ اچھل

جو کڑی آہوئے مشکیں کو ختن میں بھولے
بال کھولے جو حلب میں وہ دکھائے چھل بل

قطرے کہتے تھے پسینے کے رخ گلگوں پر
جوش کھا گرمی حسن آئی ہے چہرے پہ ابل

پتلیوں کا جو اُن آنکھوں کا تماشا دیکھا
دل ناداں مرے پہلو میں گیا اور مچل

تیر پر تیر پڑے دل پہ نگاہیں جو لڑیں
نیم جاں پاؤں پہ اُسکے میں گرا سر کے بل

اور کی عرض کہ اے عشوہ گر غمزہ فروش
رحم کر رحم بس آگئے دل مضطر کو نہ چھل

رُخ روشن کی طرح آئینہ تو مجھ کو کیا
اپنے گیسو کی طرح کر مرے عقدۂ دل کو بھی حل

کون سا باغ ہے یہ؟ کون ہے تو؟ میں ہوں کہاں
تجھ سے وحشت نہیں یہ اور ہے حیرت کا محل

متبسم ہوا سنتے ہی تو وہ سرمایۂ ناز
پھر اک انداز سے بولا یہ دکھا کر کس بل

سر اٹھا پاؤں سے یہ بے ادبی خوب نہیں
اچھی صورت پہ گیا دیکھتے ہی خوب پھسل

ہوش میں آ یہ نہیں ہے قسم نباتات سے باغ
ہے سراپا چمن صنعت خلاق ازل

اُنس کچھ آج تجھ کو نہیں ہے مجھ سے
کھا چکا چوٹ مرے حسن کی تو روز ازل

نہ پری ہوں میں نہ انسان ہوں غلمان ہوں نہ حور
پر لطافت میں نزاکت میں ہوں ایسی افضل

باغ نقشہ ہے صفات حسنہ کا اُس کے
حسن یوسف سے جو فطرت میں کہیں ہے اکمل

ہاتھ پھیلائے ہیں نرگس نے جو کاسہ لے کر
اور کاسہ ہے کہ سونا ہے کیا اُس میں جل

ہے یہ نکتہ کہ فقیران جہاں کی صورت
سائل اُس کے در دولت پہ ہیں ارباب دول

ہاتھ پھیلائے جو شاخیں زر گل دیتی ہیں
ہے یہ مطلب کہ دہش میں ہے وہ بے مثل و بدل

اشرفی کے جو گلوں کا ہے چمن میں انبار
یہ اشارہ ہے کہ دولت میں ہے وہ ضرب مثل

امر یہ ہے کہ پھلے پھولے ہیں نخل امید
پھول کر لائے ہیں اس باغ میں اشجار جو پھل

نظر آتی ہے چمکتی ہوئی طوطی جو تجھے
ذوق مستی میں عنادل سے جو سنتا ہے غزل

یہ اشارہ ہے کہ ہر عضو بدن حضرت کا
ہے نواسنج سپاس کرم عز و جل

بار ور آتے ہیں تجھ کو جو نظر یہ اشجار
پہنچے ہیں اپنی مرادوں کو یہ سب نخل امل

جوش رحمت کا ہے اس بحر کرم کا شمہ
اس گلستاں میں جو برساتا ہے پانی بادل

دیکھتا ہے جو رواں نہر میں پانی شفاف
چشمۂ فیض یہ اس کا ہے نہیں گنگا جل

پوچھتا ہے جو حقیقت کو مری اے ناداں
طبع نازک ترے آقا کی ہوں اے عبد اقل

میں زلیخا ہوں وہ ہے یوسف کنعان کمال
گرم ہے آٹھ پہر شاہد مضموں سے بغل

نازنیں ہیں جو مرے گرد ادھر اور ادھر
یہ قصیدہ یہ مخمس ہے یہ قطعہ وہ غزل

شجر سیب و انار چمن خلد بریں
ہیں مری لذت گفتار کے آگے حنظل

اک ادا میں دل عالم کو میں چھل جاتا ہوں
آہوئے چین و ختن میں یہ کہاں ہے چھل بل

تربیت تیری ہے در پردہ مجھے مد نظر
روز سنتا ہے مرے فیض سے تو تازہ غزل

سیر ہو عالم بہ رخ کی مبارک تجھ کو
ہوئی تقدیر رسا دن گئے کلفت کے نکل

تازہ تر ہونے کا باعث ہے یہ اس گلشن کے
شجر عیش کی پھوٹی ہے نئی اک کونپل

خلعت خاص پہنانے کو ترے آقا کے
آج کلکتے سے آئے ہیں گورنر جنرل

ہوئی افزائش ملک اور بڑھے منصب بھی
جشن کا روز ہے غافل نہیں حیرت کا محل

سر اٹھا خواب تغافل سے ذرا ہوش میں آ
حل ہوئے جتنے کہ عقدے تھے ترے لاینحل

تہنیت میں تجھے لازم ہے قصیدہ کہنا
آیا ہیں تیری مدد کے لئے قصہ فیصل

پڑھ کے دربار گہربار میں اشعار مدیح
صلۂ مدح سے ممدوح کے بھر جیب و بغل

الغرض کان میں میرے جو یہ مژدہ پہنچا
کھل گئی آنکھ ہوئے جمع حواس مختل

مستعد ہو کے لکھا مطلعِ روشن ایسا — جس سے خورشید کے مطلع میں بھی آجائے خلل

~~~~~~

عدل کا تیرے زمانے میں یہ بیٹھا ہے عمل — بچۂ آہو کا ہے اور شیرِ نیستاں کی بغل
عام ہے فیض ترے حفظ کا یہ عالم میں — امن آباد ہے اب شہر کی صورت جنگل
شب تاریک میں پھرتے ہیں ہرن بے کھٹکے — دیدۂ شیر کے ہے سامنے روشن مشعل
چار سو امن رعایا ہے تری شکر گذار — نام باقی نہیں شکوے کا جہاں تک ہے عمل
بس امیر آگے نہ بڑھ روک عنانِ فطرت — ہم نے مانا کہ نہیں پانوں قلم کا ترے شل
پر کہاں ذرہ کہاں پایۂ مدحِ خورشید — گر زباں بند نہیں ہے یہ تعلی کا محل
شکر کر شکر کہ مداح ہوا تو اُس کا — خُلقِ ذاتی سے چھپا دے گا خطا یا زلل
قدردانِ سخن و اہلِ سخن ہے ممدوح — ہاتھ اٹھا بہرِ دعا پیشِ خداوندِ اجل
اور یہ کر عرض بصد عجز و خلوص و زاری — کہ خدایا بہ حقِ آلِ نبیِ مرسل
سُرخ رو رنگِ سعادت سے ہے جب تک زہرہ — روسیہ داغِ نحوست سے ہے جب تک کہ زُحل
حسن کو ناز رہے عشق کو جب تک کہ نیاز — رہے معشوق کا جب تک دلِ عاشق میں عمل
جب تلک مہر سے پُر نور رہے سارا عالم — جب تلک ماہ کی روشن ہے فلک پر مشعل
پرتوِ مہ سے کتاں کا ہے جگر جب تک چاک — گرمیِ مہر سے تا موم کا دل جائے پگھل
جب تلک شہد کے حصے میں رہے شیرینی — تلخ کامی رہے جب تک کہ نصیبِ حنظل
نیش اور نوش میں جب تک رہیں باقی آثار — لے مزا بیٹھ کے ہر پھول پہ زنبورِ عسل
سرو کے گرد کرے فاختہ جب تک کوکو — گل کے آگے پڑھے تا بُلبلِ شوریدہ غزل
جتنی امیدیں ہیں بر آئیں مرے آقا کی — خلد کی طرح سے شاداب رہے باغِ امل

ملک و اقبال کو یارب ہو ترقی گھڑوں
یہ ریاست تو ہے کیا ہند میں ہو جائے عمل
~~~~~~

غزلیات

جب تلک ہست تھے دشوار تھا پانا تیرا
مٹ گئے ہم تو ملا ہم کو ٹھکانا تیرا

نہ جہت تیرے لئے ہے نہ کوئی جسم ہے تو
چشم ظاہر کو ہے مشکل نظر آنا تیرا

شش جہت چھان چکے ہم تو کھلا ہم پہ یہ حال
رگ گردن سے ہے نزدیک ٹھکانا تیرا

اے صدف چاک کرے گا کبھی سینہ اک دن
تو یہ سمجھی ہے کہ گوہر ہے یگانہ تیرا

اجل آئے گی تو لے جائے گی ہمراہ ضرور
ہیش جانے کا نہیں کوئی بہانہ تیرا

کیوں تجھے ہم سے عداوت نہ ہو اے نفس شقی
ہم نے کہنا کبھی چھوٹوں بھی نہ مانا تیرا

دور اگلے شعرا کا تھا کبھی اور امیر
اب تو ہے ملک معانی میں زمانا تیرا

۲

پکارتا ہے یہ ناز اُس کی کبریائی کا
کہ لے اُڑا ہے مجھے شوق خود نمائی کا

کہاں نہیں ہے تماشا تری خدائی کا
مگر جو دیکھنے دے رعب کبریائی کا

بغیر پہنچے ہوئے یار تک نہیں رہتا
میں مٹ کے نام مٹا دوں گا نارسائی کا

خدا نے دل کو بنایا تھا جام استغنا
بتوں نے کاسہ اُسے کر دیا گدائی کا

بہار آئی ہے پھر خیر ہو خداوندا
جنوں کے ہاتھ میں دامن ہے پارسائی کا

یہاں ہے ذوق اسیری میں مجھ پہ حالت وجد
وہ جانتا ہے کہ مشتاق ہے رہائی کا

ہنسے جو زخم تو بولا بگڑ کے خنجر یار
لہو رلائے گا ہنسنا یہ بے حیائی کا

تڑپ تڑپ کے گیا اُس کے آستانے پر
کٹا جو سر تو بڑھا شوق جبہہ سائی کا

چلی ہے تو ہمیں صحرا کو لے کے اے وحشت
مگر خیال ہے لازم شکستہ پائی کا

کمان ہاتھ سے رکھ صید گاہ عرفاں میں
کہ تیر صید ہے یاں دام نارسائی کا

ہزاروں کافر و مومن پڑے ہیں سجدے میں
بتوں کے گھر میں بھی ساماں ہے خدائی کا

گذر نہیں ہے حرم میں تو دیر کو چلئے
امیر کام کہیں بند ہے خدائی کا

آشکارا راز حسن کبریا کیونکر ہوا
رہ کے سو پردوں میں عالم آشنا کیونکر ہوا

وجہ حیرت اہل دنیا میں ہے اپنا حال دل
ایسے بے دردوں میں یہ درد آشنا کیونکر ہوا

ہوش میں آ بد حواس اتنا نہ ہو روتا ہے کیوں
نامہ بر قصہ بیاں کر کیا ہوا کیونکر ہوا

اپنا بندہ بھی مجھے کہتا ہے پھر محتاج بھی
تجھ سے شاہنشاہ کا بندہ گدا کیونکر ہوا

دل اگر ہے صاف کچھ مشکل نہیں دیدار یار
دیکھ تو آئینہ صورت آشنا کیونکر ہوا

میں نہ مانوں گا یہ آئینے کا ہے سارا قصور
خود بخود وہ خود پسند و خود نما کیونکر ہوا

الفت گیسو بلا تھی مر گیا پھنس کر امیر
ہے بڑا جھگڑا نہ پوچھو فیصلہ کیونکر ہوا

۴

بیگانہ ہو کے سارے جہاں سے جدا ہوا
اے عالم آشنا جو ترا آشنا ہوا

سمجھے کفن نصیب جو بعد فنا ہوا
سرکار عشق سے ہمیں خلعت عطا ہوا

دریائے معرفت سے جو دل آشنا ہوا
ترک خودی سفینۂ اہل فنا ہوا

میں مٹ گیا تو وہ بھی مرے ساتھ مٹ گیا
سائے سے خوب حق رفاقت ادا ہوا

بکھرا رہے ہیں خون مرا کر کے کیوں حضور
اب اس پہ خاک ڈالیے جو کچھ ہوا ہوا

مرنے کے بعد کیسے پریشاں ہیں عضو تن
کیا کیا ورق کتاب سے اپنی جدا ہوا

۵

ہوا جو پیوند میں زمیں کا تو دل ہوا شاد مجھ حزیں کا
بس اب ارادہ نہیں کہیں کا کہ رہنے والا ہوں میں یہیں کا

یہ طرز وحشت نے رنگ باندھا کہ ہو گیا دو جہاں کو سودا
زمیں پہ جادہ فلک پہ جوزا نشان ہے چاک آستیں کا

یہ جتنے نیلے ہیں داغ دیکھے نہ آسماں کے نہ ہیں زمیں کے
نشان تک مٹ گئے جبیں کے کھلا نہ مطلب خط جبیں کا

پڑھے سلیماں کے جتنے رتبے تمہاری الفت کے تھے کرشمے
یہ نقش جس دل میں جم کے بیٹھے بلند ہو نام اس نگیں کا

کہاں کا نالہ کہاں کا شیون تنا کہ قاتل ہے وقت مردن
قلم ہوئی ہے بدن سے گردن زباں پہ نعرہ ہے آفریں کا

عجب مرقع ہے باغ دنیا کہ جس کا صانع نہیں ہویدا
ہزارہا صورتیں ہیں پیدا نہیں ہے صورت آفریں کا

خدا سے جب تک نہ ہو شناسا حریم دل کا ہے شوق بیجا
مکان کا تب پتہ ملے گا کہ کچھ پتہ یاد ہو مکیں کا

جنوں کا ہم پہ ہے قطع جامہ حیا کہاں کی لباس کیسا
ہمارے بازو تلک نہ پہنچا کسی طرح ہاتھ آستیں کا

کس آستانے پہ جا پڑا ہوں کہاں الٰہی میں جبہہ سا ہوں
کہ سر نہ اُٹھے ہزار چاہوں یہ ربط ہے سجدۂ زمیں کا

امیر دیکھا جو اُس کا نقشہ تو نقشہ یوسف کا دل سے اترا
کہ نقش ثانی کے آگے ہوتا فروغ کیا نقش اولیں کا

٦

سیکھ کر مجھ نالہ کش سے طرز افغاں عندلیب
صحن گلشن میں ہوئی ایسی خوش الحاں عندلیب

ہوں وہ عاشق قد و عارض کا جو گلشن میں چلوں
فاختہ پکڑے مرا دامن گریباں عندلیب

رحم کر یوں پھول بے دردی سے اے گلچیں نہ توڑ
سر پہ نالوں سے اٹھا لے گی گلستاں عندلیب

فصل گل آنے تو دو اڑ جائے گی لے کر قفس
خانۂ صیاد میں دو دن ہے مہماں عندلیب

برق آسا ہے فروزاں خندۂ گل باغ میں
چاہیے برسائے ابر اشکوں کا باراں عندلیب

عاشق کامل کو وصلت میں زیادہ ہے ملال
فصل گل میں بیشتر ہوتی ہے نالاں عندلیب

اُڑ کے گل خود شوق سے پہنچا ہے دست یار تک
کس لئے گلچیں سے ہے دست و گریباں عندلیب

فاتحہ خوانی کو جب وہ گلبدن آیا امیر
بن گئے سب ساکن شہر خموشاں عندلیب

٧

گھر سے اُٹھے تھے کہ جائیں گے گلستاں کی طرف
وحشت دل لے چلی ہم کو بیاباں کی طرف

مل کے اک اک گور سے ہم دیر تک رویا کئے
لے گئی عبرت جو کل گور غریباں کی طرف

رہ گیا ہے آسرا تیری عنایت کا مجھے
تو ہی اب اے یاس ہو جا میرے ارماں کی طرف

ہو چکیں وہ دست وحشت کی جو تھیں چالاکیاں
ہاتھ اب برسوں نہیں اُٹھتا گریباں کی طرف

زاہدا تسبیح میں زنار کے ڈورے نہ ڈال
یا برہمن کی طرف ہو یا مسلماں کی طرف

آپ سے جاتا نہیں ہر بار میں مجبور ہوں
دل کھنچا جاتا ہے میرا کوئے جاناں کی طرف

اب کہیں یاران رفتہ کا پتہ ملتا نہیں
شوق دل لے چل مجھے گور غریباں کی طرف

جا کے اب یاروں کی تنہائی میں دیکھو گا امیر — لے چلی ہے بے کسی گورِ غریباں کی طرف

۸

آج محفل سے تم آئے ہو اٹھا نے ہم کو — ہائے وہ دن کہ جو اٹھتے تھے بٹھانے ہم کو
اتنی نسبت بھی کفایت ہے یہاں بخشش کو — کاش وہ اپنا گنہگار ہی جانے ہم کو
حلقۂ زلف میں پھنس کر کوئی نکلا ہے کبھی — موت کے منہ سے چھڑایا ہے خدا نے ہم کو
مسجدوں میں کبھی بھیجا کبھی تبخانوں میں — ٹھیک ٹھیک اُس نے بتائے نہ ٹھکانے ہم کو
اُس ستمگر نے جو پہلو سے اُٹھایا اپنے — دردِ دل تو بھی تو اٹھا نہ بٹھانے ہم کو
لے چلے داغ ہزاروں چمنِ ہستی سے — زندگی لائی تھی کیا سیر دکھانے ہم کو
مدد اے مرگ! کہ آفت میں پھنسا رکھا ہے — آگ نے خاک نے پانی نے ہوا نے ہم کو
شمع آسا کبھی جلتے کبھی روتے گذری — آگ پانی سے بنایا ہے خدا نے ہم کو
دیر میں شیخ حرم سے یہ صنم کہتے ہیں — تو نے اللہ کو جانا ہو تو جانے ہم کو
حوصلہ کون تماشائے تجلّی کا کرے — غش تو دیتا ہی نہیں ہوش میں لانے ہم کو
لامکاں میں نہ یہ ہے نہ مکاں میں اُس کا — لے ٹھکانے کے بتاتے ہیں ٹھکانے ہم کو
خار کیا کھائے گُل دیکھ کے فرقت میں امیر — ایسے کتنے ہیں ابھی داغ اٹھانے ہم کو

۹

گھر گھر تجلیاں ہیں طلبگار بھی تو ہو — موسیٰ سا کوئی طالبِ دیدار بھی تو ہو
دل دردناک چاہئے لاکھوں ہیں خوبرو — عیسیٰ ہیں سیکڑوں کوئی بیمار بھی تو ہو
گر ہم نہیں تو رونقِ بازارِ عشق کیا — اے حسن خود فروش خریدار بھی تو ہو
اشکوں کے ساتھ عشق میں نالہ ضرور ہے — آراستہ ہے فوج علمدار بھی تو ہو
ساقی اداس کیوں نہ ہو بزمِ مے وسبو — میخانے میں امیر سا مے خوار بھی تو ہو

۱۰

بے بحر فنا میں جلد یارب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہر شمشیر قاتل کی

بسے گور غریباں جس کسی کا گھر ہوا ویراں
مسافر پڑ کے سوئے جاگ اٹھی تقدیر منزل کی

نہال عشق کو زور دکے ہم سرسبز کرتے ہیں
نہیں آنکھیں یہ دو نہریں ہیں اپنے گلشن دل کی

فلاطوں خم میں بیٹھا ہے شراب مرگ پینے کو
نہیں حکمت سے خالی بات کوئی مرد عاقل کی

یہی دو چار دانے حاصل کشت محبت ہیں
نہیں اشک مسلسل بالیاں ہیں خرمن دل کی

کسی کا ساتھ کب دیتا ہے کوئی بے قراری میں
تڑپتا رہ گیا شعلہ شرر نے قطع منزل کی

مری کشتی برنگ موج اس بحر حوادث میں
کنارے تک اگر پہنچے تو ٹکر کھائے ساحل کی

غبار دہر سے کیا آشنائی بحر عرفاں کو
پڑے کیا دیدۂ ماہی میں اڑ کر گرد ساحل کی

خیال نیستی یہ ہر قدم تھا دشت ہستی میں
مٹا جو نقش پا مجھ کو بتا دی راہ منزل کی

نہ سمجھو کھیل امیر الفت کی بازی جان لیتی ہے
کسے رکھتے ہیں ہم ابھی نہیں ہے دل لگی دل کی

منشی امیر اللہ تسلیم

مولوی عبد الصمد صاحب کے بیٹے۔ اور مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اور عربی کی کتابیں اپنے بھائی مولوی عبد اللطیف صاحب سے پڑھیں۔ فن خوشنویسی منشی عبد الحیٔ صاحب سندیلوی سے حاصل کیا۔ مدت تک آپ کا قیام لکھنؤ میں رہا۔ پھر منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے توسل سے رام پور تشریف لے گئے۔ وہاں تیس ۳۰ روپیہ ماہوار اور دو سو روپے عید کے موقع پر آپ کو ملا کرتے تھے۔ بعد چندے دہاں ڈپٹی انسپکٹر مدارس وغیرہ کے مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ اس وقت تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار تک ہوگئی۔ جب نواب صاحب والی رامپور سفر انگلستان سے واپس تشریف لائے۔ تو آپ کا سفر نامہ نظم کر کے پیش کیا۔ اس صلے میں چالیس ۴۰ روپیہ ماہوار بطور پنشن آپ کے لئے مقرر ہوگئے۔ آخر عمر تک پاتے رہے۔

آپ کے کلام میں فصاحت، بلاغت۔ متانت۔ شوخی کمال درجے کی ہے۔ قوت متخیلہ بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ دقیق مضامین اس سادگی اور صفائی سے ادا فرماتے ہیں کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی کلام کا رنگ دہلی کے شعرا کا سا ہے۔ آپ کو اسی طرز پر ناز تھا۔ خود فرماتے ہیں۔

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی
مجھ کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

مثنوی میں آپ نے غنیمت کے رنگ کی تقلید کی ہے ۔ متعدد مثنویاں لکھیں ۔ جو لکھنؤ والوں سے بالکل الگ ۔ نالۂ تسلیم ۔ شام غریباں ۔ صبح خنداں ۔ دل و جاں ۔ نغمۂ مسلسل ۔ شوکت شاہجہانی وغیرہ مثنویاں اور نظم ارجمند ۔ نظم دل افروز ۔ دفتر خیال یہ دو دیوان یادگار رہیں ۔

۲۸ ۔ مئی سنہ ۱۹۱۱ء کو پانچ بجے شام کو ۹۲ برس کی عمر میں لکھنؤ میں آپ نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی ۔

قصیدہ نعتیہ

فقر میں تقدیر دیتی ہے لباس اغنیا
جسم عریاں پر اُٹھو ہوتا ہے نقش بوریا

خاک میں مل کر بھی ہے مجھ کو خیال خسروی
جانتا ہوں مور کے سائے کو میں ظل ہما

منہ نہ دیکھا میری حسرت نے کبھی امید کا
آج تک ہے صورت ارمان مفلس پارسا

کچھ تو کم ہو جوش محرومی خدا را اے فلک
بہر خندے انقلاب لطف بخت نارسا

فیض ارباب ہمم ہے قوت بے مائگاں
کشتی درویش کو دست کرم ہے ناخدا

گھر میں بیٹھا عالم ایجاد کی کرتا ہوں سیر
دل مرے پہلو میں ہے آئینۂ قدرت نما

میرے اس کے رابطہ ہے صورت مصراع بیت
ایک ہیں معنی میں دونوں ورنہ ظاہر میں جدا

گو اسیر گل ہوں لیکن نکہت گل کی طرح
مجھ کو سوئے اصل ہے ہر دم کشاں جذب ہوا

میرا ہر نالہ دلیل منزل مقصود ہے
رہنمائے کارواں ہوں صورت بانگ درا

سرسری لے شیخ میرے نقش ہستی کو نہ جان
قطرۂ ناچیز ہوں لیکن ہوں دریا آشنا

عشق کامل چاہیے فیض جمال پاک سے
رفتہ رفتہ نور ہو جاتا ہے پتلا خاک کا

امتحاں گر چاہتا ہے دیکھ سینے کو مرے
ہو رہا ہے مشرق خورشید مہر مصطفیٰ

جس کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ مثل روح
ہر گھڑی آغوش میں تھا شاہد قرب خدا

طے کئے نُہ پردۂ گردوں شب معراج میں
جیسے عینک سے گزر جائے نگاہ تیز پا

ایک ذات پاک تھی کونین کے دل کو عزیز
فرشیوں کے نور ایماں عرشیوں کے پیشوا

معنی بیتِ دو عالم یوں سمجھنا چاہئے
تھی خبر ذاتِ مقدس حرفِ کن تھا مبتدا

عین کثرت میں رہے پابند وحدت مثلِ شمع
نوربخش بزم تھی اور بزم سے مطلب تھا

اک توجہ میں دو عالم کی حقیقت کھل گئی
قلب تھا لوح طلسم گنج اسرار خدا

زندگی بخش دل مردہ تھا ہر حرف سخن
آب حیواں تھا دہن لب موجۂ آب بقا

سینۂ حاسد سے پوچھا چاہئے اوج کمال
سو جگہ سے چاک ہے جس طرح مفلس کی ردا

واہ ری عظمت کہ خاک پا کو راہ فخر سے
کھینچتا تھا ہر ملک آنکھوں میں جائے توتیا

اہل بینش تھے مگر بے غش تھے ہر دم لوث سے
مثل داماں نگاہ چشم اعمی پارسا

بیں کہ فانی ذات حق میں تھے کراماً کاتبین
دم بخود ہیں صورت تصویر کیا تھا کیا ہوا

بے نیازی کی بدولت حرف دولت دہر میں
ہو گیا ننگ شنیدن جیسے میرا ماجرا

کیا کہوں ترک ادب ہے دل تھا یا کوئی صنم
جس کے سائے تک پہنچ سکتی نہ تھی حرص و ہوا

دیکھ کر زہد و عبادت سن کے تسبیح و دعا
عالم علوی سے آتی تھی صدائے مرحبا

ذرہ ذرہ آئنہ تھا آفتاب حشر کا
صبح عید ہشت جنت اُس کے کوچے کی فضا

ایک ذات پاک تھی موصوف چار اوصاف سے
خضر پے عیسیٰ نفس، موسیٰ سخن یوسف لقا

واہ رے لطف تکلم وقت ارشاد بیاں
حرف ہو کر لب سے آتا نکتۂ علم خدا

تیغ نے جس دم سے کی تھی سر فروشی اختیار
سن کے نام زندگیؔ خضر ہستی تھی قضا

ٹھہرائے تسلیم کچھ ترک ادب کا پاس کر
خاک تو لکھے گا اوصاف جناب مصطفیٰ

چاہئے ہر دم حضور دل سے یہ کہتا رہے
اے شہ والا حسب صلّ علیٰ صلّ علیٰ

غزلیات

کرتا ہوں ذکر میں دم پیری شباب کا
افسانہ گو ہوں عالم حسرت میں خواب کا

ہر چند فاقہ مست ہوں ہمت بلند ہے
بدلوں نہ آفتاب سے ساغر شراب کا

کال سے ہے مریض ازل کی دوا محال
رعشہ مسیح سے نہ گیا آفتاب کا

دونوں جہاں میں لطف خموشی نہیں نصیب — جھگڑا ہے گور میں بھی سوال و جواب کا

اہل زمیں کے واسطے سارے ہیں حادثے — صرصر سے گل ہوا نہ چراغ آفتاب کا

قدرت نمائیوں میں نہیں کچھ سبب کو دخل — بے تیل جل رہا ہے چراغ آفتاب کا

برباد پھر رہا ہوں نہیں کچھ حصول خاک — گویا بگولا ہوں میں جہانِ خراب کا

آنکھیں جو بند ہو کے کھلیں پھر کہاں وہ شکل — گذرا برنگ خواب زمانہ شباب کا

مرتا ہوں بے ثباتی ہستی پہ بعد مرگ — بالائے قبر چاہئے گنبد حباب کا

تسلیم اضطراب کے بدلے ہو دل کو چین — آئے زمانہ جلد کہیں انقلاب کا

٢

حشر میں پوچھو نہ عالم عالم اسباب کا — یاد ہے بھولا ہوا کس کو فسانہ خواب کا

اتحاد بیت فطرت باعث راحت نہیں — پانی پانی دل ہے ربطِ چاہ سے دولاب کا

دہر میں بے حرص طوفان بلا سے خاک ہیں — کشتیِ درویش کو خطرہ نہیں سیلاب کا

حشر کو اٹھا ہے عریاں دوست کیوں بہر کفن — کرتے ہیں شرمندہ مجھ کو عالم اسباب کا

دل سے بے مایہ کے پوچھے عزت مہماں کوئی — خانہ ویرانی کے سر پر ہے قدم سیلاب کا

بعد مردن بھی خیالِ خدمت یاراں رہا — گرد دامن بن کے ہوں پابوس میں احباب کا

ہر گھڑی ہے ساتھ دم کے فکر نظم آبدار — ہر نفس تسلیم رشتہ ہے دُر نایاب کا

٣

عمر بھر صورت تصویر میں گویا نہ ہوا — کیا خموشی نے کہا ہائے جو افشا نہ ہوا

نالہ بے چھیڑے ہوئے غیر کے پیدا نہ ہوا — میں لبِ نے کی طرح آپ سے گویا نہ ہوا

آبرو نشو و نما کی کہاں غربت میں نصیب — طفلِ اشک آنکھوں سے گر کر کبھی برپا نہ ہوا

ہائے کیوں کر نہ کروں میں گلہ محرومی — لاکھوں ارمان تھے اور ایک بھی پورا نہ ہوا

کیا کہوں مرتے ہیں کس بات پہ دنیا والے — اے اجل مجھ کو تو جینا بھی گوارا نہ ہوا

کامل راہ طلب قید سے دیکھے آزاد
موج سے سلسلہ برپا کبھی دریا نہ ہوا

شکل تصویر ہوا خلق جہاں بس بے دل
میں کسی طرح ہوا خواہ تمنّا نہ ہوا

نقش برآب تھے ہم مٹ گئے بنتے بنتے
چہرہ پرواز بھی ہیہات شناسا نہ ہوا

تھے وہ تصویر خیالی کہ سوا مٹنے کے
مفت بھی کوئی خریدار ہمارا نہ ہوا

ظلمت دل ہے وہی لاکھ جلایا غم نے
پھونک دینے سے بھی اس گھر میں اُجالا نہ ہوا

کیا کہوں چھوٹ کے میں اس گل تر سے تسلیم
صورت نکہت برباد کہیں کا نہ ہوا

۴

حشر میں رکھتا ہے حور و قصر و دیبا کی ہوس
مر کے بھی باقی ہے زاہد تجھ کو دنیا کی ہوس

زندگی بھر ساتھ تھے مرتے ہی سب رخصت ہوئے
ولولے حسرت تمنّا جوش بے باکی ہوس

بے دریغی بے بسی وقت اجل کی کیا کہوں
لے گئے وارث متاع و مال دیکھا کی ہوس

کس مصیبت سے چھٹا ہے مر کے پیچھا اور تجھے
حشر میں جینے کی پھر ہے او تن خاکی ہوس

جس قدر بڑھتا ہے پائے جستجو بڑھتا ہے تیز
کم نہیں ہوتی کسی صورت سے دریا کی ہوس

خوش ہوں میں تصویر کے مانند یوں نہیں ناامید
ان نصیبوں پر نہ دے یارب تمنّا کی ہوس

آپ ہی کیسے منائیں عمر بھر کس کس کو ہم
بخت برگشتہ۔ کشیدہ آرزو۔ شاکی ہوس

جیسے سن پایا ہے تو قید مکاں سے پاک ہے
اب نہ کعبے کی تمنّا ہے نہ گرجا کی ہوس

جس طرف پھیرا۔ پھرے تسلیم مجبوری سے ہم
زندگی بھر کل کا پتلا مجھ کو سمجھا کی ہوس

۵

چلتے پھرتے ہیں مگر رنج سفر رکھتے نہیں
گھر سے باہر ہم قدم مثل نظر رکھتے نہیں

صورت تصویر ہر لوث و ہوس سے پاک ہیں
حوصلہ جس میں رہے ہم وہ جگر رکھتے نہیں

بے خلش کیا نیند ہے آسودگان خاک کی
روز و شب رکھتے نہیں شام سحر رکھتے نہیں

لے چلے ہیں ساتھ مر کر اس قدر حسرت کہ لوگ
بوجھ کے مارے جنازہ دوش پر رکھتے نہیں

غافل و ہشیار ہیں عالم میں مثل حرف خط
غیر کو دیتے ہیں خبریں خود خبر رکھتے نہیں

نامرادی بے کسی کوئی نہیں پرسان حال
آبرو اتنی بھی میری اشک تر رکھتے نہیں

بحر ہستی میں دو رنگی ہم کو چھو سکتی نہیں
آب گوہر ہیں فریب خشک و تر رکھتے نہیں

گلشن عالم میں دیکھے اہل دولت سب بخیل
اس طرح نرگس جاک دامن میں کہ زر رکھتے نہیں

۶

نہ ہوگا حشر میں کوئی کسی کا
بھروسا ہے تو اپنی بے بسی کا

دل اپنا ہے جسے چاہیں گے دیں گے
اجارہ اس میں کیا ناصح کسی کا

رُلاتا ہے مجھے کیوں اس قدر بخت
لیا تھا نام میں نے کب ہنسی کا

سدا گریاں رہا مانند شبنم
نہ دیکھا منہ مرے غم نے خوشی کا

نہ کچھ دنیا میں رکھتا ہوں نہ دیں میں
بھلا ہو دو جہاں میں مفلسی کا

خیال آیا تری رحمت کا جس دم
جگر پانی ہوا تر دامنی کا

تن خاکی کو بھی چھوڑا لحد میں
خیال آیا جو عہد بیکسی کا

مجھے دو گز زمیں دے بعد مردن
کہاں یہ حوصلہ چرخ دنی کا

مرا جو نالۂ موزوں ہے تسلیم
تصدق ہے نسیم دہلوی کا

خان بہادر سید اکبر حسین رضوی

اکبر تخلص - اکبر حسین نام - الہ آباد کے رہنے والے تھے - منشی غلام حسین وحید الہ آبادی کے شاگرد رشید - بلکہ سرمایۂ ناز اور فخر استاد تھے - عربی فارسی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے - اور زبان انگریزی اور اُس کے علم ادب سے بخوبی ماہر تھے - مغربی خیالات کو بطرز احسن ایشیائی لباس پہنانے میں ساعی رہتے تھے ؛ اور عمدہ طور پر کامیاب بھی ہوتے تھے - اکثر مشاہیر انگلستان کے کلام کا اردو میں بہت ہی خوش اسلوبی اور عمدگی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے - ایشیائی طرز قدیم میں بھی بہت بلند پایہ ناظم و شاعر تھے - قوت متخیلہ و ممیزہ دونوں میں اعلیٰ درجہ کا حصہ فطرتاً آپ کی طبیعت میں ودیعت ہوا تھا - چنانچہ تعلیم و تہذیب مغربی کا جو روز افزوں اثر

ہمارے ہندوستانی نوجوانوں پر ہو رہا ہے اور اُس سے جو نتیجے پیدا ہوئے۔ اور ہو رہے ہیں۔ اُن کے متعلق آپ نہایت قابل قدر خیالات ظاہر فرماتے رہتے تھے۔ زبان نہایت صاف اور پاکیزہ اور طرز بیان بے حد دلچسپ و دلکش ہے۔ نغز گوئی اور بذلہ سنجی آپ کی شوخ طبیعت کا ایک ادنیٰ جوہر ہے۔ مگر ساتھ ہی مضمون آفرینی اور نازک خیالی سے خالی نہیں۔ عاشقانہ رنگ کے شعر میں بات پیدا کرنی۔ آپ کی جدت پسند طبیعت کا ایک خاص مذاق ہے۔ کلام میں صفائی و سادگی اپنے اپنے محل و موقع پر دلآویز جھلک دکھاتی ہیں۔ الغرض آپ کا کلام برگزیدہ و پسندیدۂ خاص و عام ہے۔ عیوب شاعری سے بَرا و نقائص سے سراسر معرّیٰ ہے۔ ہر رنگ۔ ہر لہجہ۔ ہر زمین میں کامل دسترس تھی۔ پولیٹیکل اور سوشل معاملات میں آپ کی رائے نہایت متین و مناسب ہوتی تھی۔ خیالات بھی نہایت سلجھے ہوئے اور اکثر اچھوتے ہیں۔ اپنے طرز خاص میں مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں۔ آپ کے تین دیوان مرتب ہو گئے ہیں جو چھپ کر شایع ہو چکے ہیں۔ چوتھا بھی شائع ہو چکا تھا کہ اس جہان فانی سے آپ نے رحلت فرمائی۔

آپ نومبر ۱۸۴۶ء کو مقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ دیسی مکاتب اور سرکاری مدرسوں میں تعلیم پا کر ۱۸۶۷ء میں امتحان وکالت درجۂ ادنیٰ پاس کیا۔ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کے مسل خواں مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں وکالت درجۂ اعلیٰ کی سند حاصل کر کے ۱۸۸۰ء تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں دوبارہ سرکاری ملازمت کی منصفی سے درجہ بدرجہ ترقی کر کے ۱۸۸۸ء میں سب جج اور ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ درجہ اوّل۔ اور سشن جج مقرر ہوئے۔ اور کئی سال تک ہزار بارہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پاتے رہے۔ ۱۹۰۳ء میں اپنے مستقل عہدہ ججی عدالت خفیفہ الہ آباد سے نہایت نیکنامی کے ساتھ پنشن لے کر علٰحدہ ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ نے جوڈیشل سروس کے صلے میں خان بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہوئے۔

حضرت اکبر موجودہ عہد کے اُن منتخب شعرائے اردو میں سمجھے جاتے تھے۔ جنھوں نے زمانے کے میلان عام اور جدید اثرات سے متاثر ہو کر شاعری کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ ان کے کلام میں سنجیدہ اور نتیجہ خیز ظرافت کی آمیزش ایک ایسا دلکش حُسن ہے جو اُن کو اپنے تمام معصروں میں نمایاں کرتا ہے۔

غزلیات

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا   کیا دلکشا یہ سین ہے فصلِ بہار کا

نازاں ہیں جوشِ حسن پہ گلہائے دلفریب
جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم اُبھار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب
نقشہ کھنچا ہوا ہے خط و زلفِ یار کا
سبزہ ہے یا یہ آب زمرد کی موج ہے
شبنم ہے یا یہ بحر ہے گہر آبدار کا
مرغان باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں
اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا
پرواز میں ہیں تیتریاں شاد و چست و مست
زیب بدن کئے ہوئے خلعت بہار کا
موج ہوا و زمزمۂ عندلیب مست
اک ساز دلنواز ہے مضراب و تار کا
ابر تنک نے رونق موسم بڑھائی ہے
غازہ بنا ہے روئے عروس بہار کا
افسوس اس سماں میں بھی اکبر اداس ہے
سوہان روح ہجر ہے اک گل عذار کا

٢

خدا کی ہستی کو یاد رکھنا اور اپنی ہستی کو بھول جانا
نظر اُسی پر ہے اور باتوں کو میں نے بالکل فضول جانا
جنوں ہم ایسوں کو کیا تعجب بہار کا ہے سماں ہی ایسا
صبا کا اٹکھیلیوں سے چلنا خوشی سے کلیوں کا پھول جانا
جہان فانی کی انجمن میں یہی تسلسل ہمیشہ دیکھا
امید کے ساتھ شاد آنا اٹھ کے صدمے ملول جانا

٣

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے فنا ہی کی ہیں امیدیں جو کچھ کرے گا خدا کرے گا
فلک جو برباد بھی کرے گا بلند ارادے مرے رہیں گے
جو خاک ہوگا تو خاک سے بھی سدا بگولا اٹھا کرے گا
خدا کی یاد کو پکارتا ہوں ہوا کرے ناخوشی بتوں کو
مری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر مرا کوئی کیا کرے گا
جہان فانی کا حشر ہی کو خیال کر مستقل نتیجہ
یہاں تو پیہم یہی تردد یہی تغیر ہوا کرے گا
اگرچہ ہے درد و غم سے مضطر یہی ہے وردِ زبان اکبر
یہ درد جس نے دیا ہے ہم کو وہی ہماری دوا کرے گا

٤

زندگانی کا مزا دل کا سہارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا
بولنے کی نہ ہے قوت نہ اشارے کی سکت
اتنا بس بھی مرا فطرت کو گوارا نہ رہا

پوچھا کوئی دم مرگ سکندر اکبر — کتنے دن کی یہ تعلّی تھی کہ دارا نہ ہوا

۵

اے فلک دل کی ترقی کا جو ساماں ہوتا — طاعت حق کا ستارا بھی درخشاں ہوتا
جان لیتا جو شبستان فلک کا انجام — صورت شمع ہر اک بزم میں گریاں ہوتا
غنچہ مرجھائے گرا شاخ سے افسوس نہ کر — کھل بھی جاتا تو مرا راز نہ پنہاں ہوتا
ناصحا نالہ و زاری پہ ملامت ہے عبث — چپ بھی ہوتا تو مرا راز نہ پنہاں ہوتا
کس مپرسی کا گلہ کچھ نہیں مجھ کو اکبر — حال ہی کیا تھا کہ جس کا کوئی پرساں ہوتا
چمن دہر میں مایوس رہا میں اکبر — کاش اک پھول بھی تو زینت داماں ہوتا

۶

انتیاز حسرت رنج و الم جاتا رہا — غم ہوا اتنا کہ اب احساس غم جاتا رہا
بزم دنیا میں کہاں سامان حشمت کو ثبات — گم ہوئی مہر سلیماں جام جم جاتا رہا
جس سے تھا خودداری ارباب حاجت کا نباہ — وہ سلیقہ تم سے اے اہل کرم جاتا رہا
نقل مغرب میں جو چھوڑی ایشیا نے اپنی اصل — گھٹ گئی شان عرب حسن عجم جاتا رہا
نقش صورت ہی کی تزئیں پہ رہی جس کی نظر — اُس سخن سے حسن معنی یک قلم جاتا رہا

۷

ہستی میں رہے مستی وحدت میں فنا ہو کر — عالم کو میں کیوں دیکھوں عالم سے جدا ہو کر
فتوائے خرد جو ہو دل کی تو صدا یہ ہے — فانی ہے جدا ہو کر باقی ہے خدا ہو کر

۸

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں — بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی — ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانۂ ہستی سے گذر جاؤں گا بے لوث — سایہ ہوں فقط نقش بدیوار نہیں ہوں

افسردہ ہوں عبرت سے دوا کی نہیں حاجت
غم کا مجھے یہ ضعف ہے بیمار نہیں ہوں

وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے
الجھوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں ہوں

یارب مجھے محفوظ رکھ اُس بت کے ستم سے
میں اُس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں

گو دعویٔ تقویٰ نہیں درگاہ خدا میں
بت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں

افسردگی وضعف کی کچھ حد نہیں اکبر
کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

۹

یہ جتنے ذرے جہان فانی کے اتنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں
خدا کی ہستی کی سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بے خبر ہیں

تغیر اتنا کہ گم تعین یقین ایسا کہ اپنی ہی دھن
کمال ایسا کہ سب ہیں حیرت جمال ایسا کہ سب نظر ہیں

حواس کچھ ٹھیک کام کر لیں کہ جیب و دامن کو اپنے بھر لیں
مرے معانی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ مختصر ہیں

۱۰

ہم کیوں یہ مبتلائے بیتابیٔ نظر ہیں
تسکین دل کی یارب وہ صورتیں کدھر ہیں

ذرے جو گل بنے تھے وہ بن گئے بگولے
جو زینت چمن تھے وہ خاک رہگذر ہیں

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

ہم نے سنا بہت کچھ حال جہان فانی
افسانہ گو غضب ہیں قصے تو مختصر ہیں

پیدا کئے فلک نے نادیدنی مناظر
نیچی ہیں اُن کی نظریں جو صاحب نظر ہیں

غم خانۂ جہاں میں وقعت ہی کیا ہماری
اک ناشنیدہ اُف ہیں اک آہ بے اثر ہیں

کیا مشرقی کفن بھی وہ ترک کر سکیں گے
اوضاع مغربی میں جو غرق سر بسر ہیں

اکبر کے شعر سن کر کہتے ہیں اہل باطن
اب بھی خدا کے بندے کچھ صاحب اثر ہیں

۱۱

داغ دل پر نظر یاس نہ کر اے اکبر
کوئی ذرہ چمن دہر میں بیکار نہیں

تجھ پہ گلزار کھلائے گا یہی داغ کبھی
آج گو طبع تری محرم اسرار نہیں

۱۲

بہار بے بقا پر ناز کیسا اور خوشی کیسی
بجا ہے حیرت نرگس کہ گل کی یہ ہنسی کیسی

خلافِ بیخودی کیوں ہے یہ وعظ حضرت واعظ
خودی ہی کو نہیں سمجھا میں اب تک بیخودی کیسی

نہ پوچھا قیس نے لیلیٰ نے کچھ مجھ کو بھی پوچھا تھا
جو آیا واں سے بس اتنا ہی پوچھا اس سے تھی کیسی

خدا کے ساتھ ہونے کا یقیں مشکل سے آتا ہے
وگرنہ جب خدا ہی ساتھ ہو پھر بے بسی کیسی

اِدھر فریادِ بلبل ہے کہ یہ سب رنگ فانی ہیں
اُدھر رونا ہے شبنم کا کہ گل کی یہ ہنسی کیسی

کبھی خوانِ فلک سے کوئی نعمت میں نے چکھی تھی
مگر یہ بھی نہیں یاد اب کہ لذت اُسکی تھی کیسی

تماشائے جہاں اے بے خبر تجھ کو مبارک ہو
یہاں دل داغِ حسرت سے بھرا ہے دل لگی کیسی

جہاں گھر تھا وہاں قبریں جہاں دل تھا وہاں شعلے
یہ ماتم خیز منظر سامنے ہے خوش دلی کیسی

گلِ مضموں سے اکبر رنگِ خونِ دل ٹپکتا ہے
تری حالت یہ کیا ہے یہ غزل تو نے کہی کیسی

۱۳

جلائے جب شعلۂ تحیر تو ذہن ڈھونڈھے تباہ کسکی
یہ کس کے معنی ہوئے ہیں ثابت یہ صورتیں ہیں گواہ کس کی

یہ چشمِ لیلیٰ کہاں سے آئی یہ قلبِ مجنوں کہاں سے اُبھرا
جو باخبر ہیں اُنھیں خبر ہے نگاہ کس کی ہے آہ کس کی

جمالِ فطرت کے لاکھ پرتو قبول پرتو کی لاکھ شکلیں
طریقِ عرفاں میں کیا بتاؤں ہے راہ کسکی وہ راہ کسکی

یہ کس کے عشووں کا سامنا ہے کہ لذتِ ہوش ہو گئی گم
خودی سے کچھ ہو چلا ہوں غافل پڑی ہے مجھ پر نگاہ کسکی

۱۴

اس انجمن میں آکر راحت نصیب کس کو
پروانہ بھی جلے گا اور شمع بھی جلے گی

دنیا ابھارتی ہے آج اپنے عاشقوں کو
مر جائیں گے تو ان کا کل نام بھی نہ لے گی

دنیا کی آرزو سے خالق بچائے دل کو
پیدا ہوئی تو پی کر خونِ جگر پلے گی

عبرت زدہ جو دل ہو ارمان اُس میں کیسے
بجلی گری ہو جس پر وہ شاخ کیا پھلے گی

جنت بنا سکے گا ہرگز کوئی نہ اُس کو
دنیا یونہیں چلی ہے اکبر یونہی چلے گی

۱۵

ہر قدم کہتا ہے تو آیا ہے جانے کے لئے | منزلِ ہستی نہیں ہے دل لگانے کے لئے

کیا مجھے خوش آئے یہ حسرت سرائے بے ثبات | ہوش اُڑنے کے لئے ہے جان جانے کے لئے

دل نے دیکھا ہے بساطِ قوتِ ادراک کو | کیا بڑھے اس بزم میں آنکھیں اٹھانے کیلئے

خوب امیدیں بڑھیں لیکن ہوئیں حرماں نصیب | بدلیاں اُٹھیں مگر بجلی گرانے کے لئے

سانس کی ترکیب پر مٹی کو پیار آ ہی گیا | خود ہوئی قید اس کو سینے سے لگانے کیلئے

جب کہا میں نے بھلا دو غیر کو ہنس کر کہا | یاد پھر مجھ کو دلانا بھول جانے کے لئے

اللہ اللہ کے سوا آخر رہا کچھ بھی نہ یاد | جو کیا تھا یاد سب تھا بھول جانے کے لئے

سر کہاں کے۔ ساز کیسا۔ کیسی بزم سامعیں | جوشِ دل کافی ہے اکبر تان اُڑانے کے لئے

انتساب ایسے کمالوں کو شکم سے چاہیے | جن کو تم حاصل کرو روٹی کمانے کے لئے

۱۶

جلوہ گر ہے حسنِ بت۔ وقت اضطرابِ دل کا ہے | المدد اے ذوقِ عرفاں! سامنا مشکل کا ہے

تیرے مجنوں کے بیاباں کا ہے عالم دوسرا | جو بگولا ہے وہ اک ناقہ کسی محمل کا ہے

ذرہ ذرہ ہے طریقِ عشقِ حق میں دل نواز | ہر قدم پر سالکِ رہ کو گماں منزل کا ہے

بحرِ ہستی خود حدوں سے اپنی ہے نا آشنا | اک تلاطم ہے بپا کس کو پتا ساحل کا ہے

یہ نظر کی ناتوانی یہ بتوں کی زینتیں | کیا کہوں اکبر بس اب اللہ مالک دل کا ہے

۱۷

کرے گا قدر جو دنیا میں اپنے آنے کی | اُسی کی جان کو لذت ملے گی جانے کی

نہ پوچھو بیٹھا ہوں کیوں ہاتھ پر میں ہاتھ دھرے | اٹھوں گا نبض ذرا دیکھ لوں زمانے کی

مزا بھی آتا ہے دنیا سے دل لگانے میں | سزا بھی ملتی ہے دنیا سے دل لگانے کی

گہر جو دل میں نہاں ہیں خدا ہی دے تو ملیں | اُسی کے پاس ہے مفتاح اس خزانے کی

یہ شرط ہے کہ کرو حکم اتباع رقیب غضب یہ ہے کہ ضرورت ہے دل لگانے کی
خیال وسعت تحقیق تا کجا اکبر کہ ہر نگاہ ہے محتاج ہر فسانے کی

۱۸

بزم ہستی ہے طلسم بے مثال زندگی خاک ہے پروانۂ شمع جمال زندگی
ہے یہی دستور لیکن کس قدر افسوسناک زندگی ہی کو سمجھ لینا مآل زندگی
عشق حسن آخرت میں چاہئے مستی روح موت سے آساں نہیں اکبر وصال زندگی
ہے دلیل نور باطن حب دنیا کا زوال موت کا مشتاق ہوتا ہے کمال زندگی
خوبی معنی کا ہے فطرت میں اکبر اعتبار حسن صورت میں نہیں جاہ و جلال زندگی

۱۹

کہاں ثبات کا اس کو خیال ہوتا ہے زمانہ ماضی ہی ہونے کو حال ہوتا ہے
فروغ بدر نہ باقی رہا نہ بت کا شباب زوال ہی کے لئے ہر کمال ہوتا ہے
میں چاہتا ہوں کہ بس ایک ہی خیال رہے مگر خیال سے پیدا خیال ہوتا ہے
بہت پسند ہے مجھ کو خموشی و عزلت دل اپنا ہوتا ہے اپنا خیال ہوتا ہے
وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے
پسند چشم کا ہرگز کچھ اعتبار نہیں بس اک کرشمۂ وہم و خیال ہوتا ہے
اگرچہ آہ سے تکلیف دل کو ہو لیکن ہوائے نفس میں کچھ اعتدال ہوتا ہے
نگاہ لطف بتاں مطمئن نہیں کرتی فریب ہی کا مجھے احتمال ہوتا ہے
خدا کا شوق ہو جس کو میں اس کا شائق ہوں خدا کا یوں تو ہر اک کو خیال ہوتا ہے

۲۰

عبث اس زندگی پر عاقلوں کا فخر کرنا ہے یہ جینا کوئی جینا ہے کہ جس کے ساتھ مرنا ہے
جو مستقبل کے شائق ہیں انھیں الجھن مبارک ہو ہمیں تو صرف اب گذرا زمانہ یاد کرنا ہے

گل پژمردہ سے غنچے کو ہمدردی نہیں ممکن — ابھی تو اس کو کھلنا ہے ابھی اس کو سنورنا ہے
مرا دل مجھ سے کہتا ہے مرے سینے میں اے اکبر — تعجب ہے کہ رہنا سہل ہے مشکل ٹھہرنا ہے
خدا جانے وہ کیا سمجھے کہ بگڑے اس قدر مجھ پر — کہا تھا میں نے اتنا ہی مجھے کچھ عرض کرنا ہے

۲۱

گو سب کو ہے تسلیم کہ معبود وہی ہے — کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے
آنکھوں میں اتر آئے ہیں موہوم کے نقشے — دل میں یہ سمائی ہے کہ موجود وہی ہے
اللہ ہی کی لو سے پنپے گا ترا دل — سرچشمۂ فیض و کرم و جود وہی ہے

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ وطن مالوف آپ کا سیالکوٹ ہے۔ لاہور کالج میں تعلیم پاکر ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ابتدائے سن تمیز سے طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ فن سخن کا صحیح مذاق سخن آفریں نے آپ کی طبیعت میں ودیعت کیا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں آپ نے نالۂ یتیم کے عنوان سے ایک قابل قدر نظم پڑھی۔ یہ نظم دلگداز اور مؤثر ہونے کی وجہ سے کچھ ایسی مقبول خاص و عام ہوئی کہ یتیم خانے کے لئے چندے کی بارش ہونے لگی۔ اسی نظم نے اس شہرت کی بنیاد رکھ دی۔ جو اب اطراف ہند میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ عربی اور فارسی میں بھی قابلیت رکھتے ہیں۔ اور سنسکرت سے بھی آشنا ہیں۔

آپ کے کلام میں بھرتی کے شعر کم پائے جاتے ہیں۔ کوئی شعر درد۔ وحدت۔ اخلاق کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتا۔ مولانا شبلی فرماتے تھے۔ کہ جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی۔ تو لوگ آپ کو ڈھونڈھیں گے۔ آپ کو تلمذ اگرچہ حضرت داغ سے رہا ہے۔ مگر مشکل پسند طبیعت کے اقتضا سے اکثر مرزا غالب کی پیروی کرتے ہیں۔

مناجات

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی — مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

تجھے کیا بتاؤں ہمنشیں ہمیں موت میں جو مزا ملا
نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاط عمر دراز میں

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

گل

تجھے کیا فکر ہے اے گل دل صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

اگر منظور ہے تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہان رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

تنک بخشی کو استغنا سے پیغام خجالت دے
نہ ہو منت کش ساقی نگوں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جور گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے

مژدہ

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا وصل دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

نہیں رہا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پینے تھے پینے والے
جہان سارا بنے گا مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

سفینۂ برگ گل بنائے گا کارواں مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہو گا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہو گا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
وہ یہ سمجھتا ہے اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہو گا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سر رہگزار بیٹھا ستم کش انتظار ہو گا

پیام عمل

اٹھ کہ پیدا ہوئی ظلمت افق خاور پر
بزم میں شعلۂ نوائی سے اجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

پھونک ڈالا تھا کبھی دفترِ باطل جس نے
حدتِ دَم سے اُسی شعلے کو پیدا کردیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کردیں

جلوۂ یوسفِ گُم گشتہ دکھا کر اُس کو
تپش آمادہ تر از خون زلیخا کردیں

رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھالیں اپنا
لب کو محوِ رُخ سعدی و سلیمیٰ کردیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کردیں

درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دل میں
جنس کم یاب ہیں آنرخ کو بالا کردیں

بادہ دیرینہ ہو۔ اور گرم ہو ایسا۔ کہ گداز
جگرِ شیشۂ و پیمانۂ و مینا کردیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کردیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

چاند

اے قمر! کیا خامشی افزا ہے تیری روشنی
رات کے دامن میں ہے گویا سحر سوئی ہوئی

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موج زن

حسن کامل تیری صورت کا نشاط انگیز ہے
چاندنی میں تیری اک تسکین غم آمیز ہے

قصد کس محفل کا ہے آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنج رہ منزل سے تو

گھر بنایا تو نے گو ہنگامۂ ہستی سے دور
چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دور

ہاں اتر آ میرے دل میں ساتھ لے کر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

آفرینش میں سراپا نور تو۔ ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ! میں جلتا ہوں سوز اشتیاق دید سے
تو سراپا سوز داغ منت خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثال گردش پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفل ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں۔ تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں ہے جو سنسان میرے دل میں ہے

تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا۔ عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو۔ تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل

پھر بھی اے ماہِ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
یعنی میں صیاد ہوں جس کا وہ آہو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں۔ سراپا نور تو
سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

شمع اور شاعر

شاعر

دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانۂ خویش
گیسوے تو از پرِ پروانہ دارد شانۂ

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم
نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ

مدّتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم
در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ

می طپد صد جلوہ در جانِ امل فرسودِ من
بر نمی خیزد ازیں محفل یکے دل دیوانۂ

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی
کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی

شمع

مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل
لب اسی موجِ نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا

گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثل چراغ لالۂ صحرا ترا

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے؟
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

اور ہے تیرا شعار۔ آئین ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

قیس ہوں پیدا تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

اے در تابندہ اے پروردۂ آغوش موج
لذت طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

تھا جنھیں ذوق تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوز تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آواز درا ہو یا نہ ہو

شمع محفل ہو کے جب تو سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

شوق بے پروا گیا۔ فکر فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گرد شمع پروانے رہے

خیر تو ساقی سہی! لیکن پلائے گا کسے؟
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر اُن کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں ناامیدِ نورِ ایمن ہو گئیں

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں

وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں؟
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہو گئیں

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے جوش

نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی
پھر دکاں تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند
پھر سلیماں کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگامِ خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے

زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں — سرمہ چشمِ دشت میں گردِ رمِ آہو ہوا
رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا — بحر تھا صحرا میں تو گلشن میں آیا جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی — چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات — یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ — زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی — جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ — یعنی اپنی مے کو رسوا صورتِ پیمانہ کر
خیمہ زن ہو وادیِ سینا میں مانندِ کلیم — شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم — صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر
تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو — عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں — ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر
خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر — تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
ہاں اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں — اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل — یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے — راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں بھی کبھی قیس تو لیلا بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہوگیا مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اُس کے پیام ناز کا جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں کسوت مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے
پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہوجائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک یعنی گل کی ہم نفس باد صبا ہوجائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہوجائے گی
دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل موج مضطر ہی اُسے زنجیر پا ہوجائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود | پھر جبین خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور | خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں | محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

حالات سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی

سید اسمٰعیل حسین منیر ولد منشی احمد حسین ذکر شکوہ آباد ضلع مین پوری کے رہنے والے تھے بڑے نازک خیال شاعر تھے۔ زیادہ زمانۂ عمر لکھنؤ میں بسر ہوا۔ شعر گوئی میں ناسخ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اُن کے بعد رشک مرحوم سے فیض سخن پایا۔ مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر مرحوم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ غدر میں قید ہو گئے تھے۔ ان کا دیوان نایاب ہے۔ ایک مثنوی معراج المومنین فضائل و مناقب دوازدہ امام علیہم السلام میں بہت خوب لکھی ہے۔ یہ بھی نایاب ہے۔ خان بہادر چودھری نظیر الحسن صاحب فوق رضوی رئیس جھابن کے کتب خانے میں موجود ہے۔ چودھری صاحب نے چند اشعار اُس میں سے نقل کر کے بھیجے ہیں۔ جو شکریہ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں

انتخاب مثنوی معراج المؤمنین

حمد

صریر کلک اگر دل خواہ نکلے | صفیر مرغ بسم اللہ نکلے
اشارہ بہر اہل حوصلہ ہے | بلند انگشت پائے بسملہ ہے
اگر ہے بے کا نقطہ بہر تمکیں | کرن سورج کی ہے دندانۂ سین
کرم اُس کا محیط شش جہت ہے | کہ رحمٰن و رحیم اُس کی صفت ہے
بدون گوش ہے وہ محرم راز | شکست دل کی سن لیتا ہے آواز
عطا کرتا ہے بے شرط عبادت | ہزاروں نعمتیں ہر ایک ساعت

غنی ہے اُس کی ذات جاودانی سوا اُس کے ہیں سب محتاج وفانی
پہونچتے ہیں جہاں تک وہم وادراک بری اُس سے ہے ذات ایزدپاک
اگر سرکش ہوں اُس سے دونوں عالم جلال سروری سے کچھ نہ ہو کم
جو ہوں سب مل کے صرف جبہہ سائی زیادہ ہو نہ اُس کی کبریائی
حواس وعقل واوہام وخیالات ق اگر برسوں کریں اندیشہ دن رات
نہ پائیں راز صنعتہائے یزداں جو اک پشّے کی خلقت میں ہیں پنہاں

مناجات

خداوندا تراعبد اقل ہوں اسیر حلقۂ طول امل ہوں
سیہ کاری میں خالِ روئے ظلمات کجی میں حلقۂ گیسوئے ظلمات
سبق خوانِ کتابِ بے زبانی زمیں گیر بساطِ ناتوانی
سخن سنج زبان ناسپاسی فساد عالمِ ناحق شناسی
شکست خاطر مایوس ہوں میں مراد طالع منحوس ہوں میں
سرِ سرکش نہیں سجدے سے واقف گرا بھی ہوں تو کعبے سے مخالف
جوانی تھی بنائے ضعف ایماں ہوئی پیری شبابِ عمرِ عصیاں
رہ عصیاں میں آوارہ رہوں یارب غلام نفس آوارہ ہوں یارب
نہیں بھاتی مجھے خلوت کسی کی پسند آئی ہے صحبت بیکسی کی
جو کچھ مانگا عطا تو نے کیا ہے بہت کچھ بے طلب مجھ کو دیا ہے
نظر کر کے تری رحمت پہ اب میں مطالب تجھ سے کرتا ہوں طلب میں
خداوندا جرم عفو فرما مجھے ارباب ایماں میں نہ شرما
بدل تیری عبادت میں رہوں میں ہمیشہ خوف و دہشت میں رہوں میں
زیادہ ہو ورع تقوی ہو غالب رہے حق الیقیں میرا مصاحب

معاصی و مناہی سے بچالے
مرے دل کو سیاہی سے بچالے

نہیں درکار سامان امارت
ملے سرمایۂ حج و زیارت

ملازم چار دہ معصوم کا کر
مجاور سیّد مظلوم کا کر

عطا کر قبر مجھ کو کربلا میں
جگہ دے سایۂ آلِ عبا میں

دمِ مردن مجھے محفوظ رکھنا
عذاب قبر سے محفوظ رکھنا

معراج

کہاں ہے ساقیِ گردوں تعلّی
کہاں ہے بادۂ حورا تجلّی

پلا دے ایک پیمانہ سر بزم
کہ سیرِ عالمِ بالا کا ہے عزم

ادھر آ اے مغنّیِ نوا ساز
کہ آئی کان میں زہرہ کی آواز

رسولِ پاک ہیں مشتاق شبگیر
شب معراج کی جاگی ہے تقدیر

شب مشکینہ خال و عنبریں مو
شب کعبہ لباس و خال ہندو

بنفشہ زار خلد کامرانی
کنیز اس رات کی شام جوانی

وہ شب جس کا غلام ابر بہاری
وہ شب غیرت دہ مشک تتاری

وہ شب تنویر کعبہ ظلمت دیر
وہ شب ظلّ ہمائے آسماں سیر

وہ شب مفتاح قفل راز دانی
وہ شب شقّ نقیضِ لن ترانی

عروج طالعِ مسعود کی رات
کلام عابد و معبود کی رات

حضور ذرہ و خورشید کی شب
سرور دل کی شام، امید کی شب

شب اوج مدام و عیش جاوید
شب جشن مراد و عیدِ امید

ادب سے برق قائم رعد ساکت
وفور رُعب سے سیار ثابت

تپش میں برق و بسمل تھے نہ سیماب
سکوں سے ہم بغل دلہائے بیتاب

حواس و عقل بیکار و معطل
رگ اندیشہ نبضِ پنجۂ شل

جہاتِ ستہ آثار تیسر   تصور نقش دیوار تحیر

ساقی نامہ

کہاں ہے ساقیِ زہرہ شمائل   دکھا دے آج کیفِ سحر بابل
اگر ہو مائلِ افسوں گری آنکھ   لڑا دے جام سے جادو بھری آنکھ
نشیلی اور گلابی آنکھ دکھلا   شرابی کو شرابی آنکھ دکھلا
کھڑے ہیں ساقیان حور پیکر   چھلکتے ہیں مئے قدرت کے ساغر
اشارے مغبچوں کے رہنما ہیں   در میخانہ کے آغوش وا ہیں
مئے جنت لئے ہیں لبریز ساغر   ہوا ہے فی سبیل اللہ کوثر
چھلکتے ہیں پیالے آب دُر کے   کھنکتے ہیں کٹورے ماہ و خور کے
نہ کیوں ہو گرم میخانے کا بازار   زیادہ مستوں سے گرتے ہیں ہشیار
شکست توبہ کی اک سمت کثرت   نہیں ثابت کسی زاہد کی نیت
عمامہ اک طرف اک سمت دستار   کہیں ٹوٹی ہوئی توبہ کے انبار
یہ قلقل کی بڑھی رنگیں بیانی   کہ بھولی شیشوں کو پنبہ دہانی
نہیں یہ بادۂ ناپاک انگور   کہ جس کے پینے سے فاسق ہوں مسرور
زلالِ چشمۂ کوثر ہے یہ مے   شراب بخششِ حیدر ہے یہ مے
فلک سے دیتے ہیں ہاتف منادی   رچا دو آج میخانے میں شادی
شب میلاد مولائے جہاں ہے   شب میلادِ میر مومنان ہے
زمیں معمور ہے حور و ملک سے   زمانے میں بہشت اتری فلک سے
پہاڑوں پہ ہے جلوہ عرش ہو   ہے استبرقِ فردوس کا فرش
بڑھی عزت رجب کی تیرھویں کی   ولادت ہے امیر المومنیں کی